شہید مرتضیٰ مطہری

اسلام میں خواتین کے حقوق

ترجمہ:
سید مرتضیٰ حسین
صدر الافاضل

شہید مُرتضیٰ مُطہریؒ

اِسلام میں خواتین کے حقوق

ترجمہ :-
سیّد مُرتضیٰ حسین
صدر الافاضل

۲۲۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ________ خواتین کے حقوق ۔ اسلام میں ۔

مؤلف ________ استاد شہید مرتضیٰ مطہری

مترجم ________ علامہ مولانا سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل ۔

ناشر ________ سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل

تعداد ________ ۵۰۰۰ (پانچ ہزار)

حجم ________ ۱۴ × ۲۱

تاریخ ________ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۶ھ

کاتب ________ قلبی حسین رضوی الکشمیری

طباعت ________ چاپ سپہر تہران ۔

خواتین کے حقوق

اسلام میں

- ایک فنّی و علمی کتاب۔
- قانون اور قانون کی سائنس۔
- فلسفی و فکری کتاب۔
- عملی فلسفے کی بات۔
- مشرق و مغرب کا ذہنی و فکری موازنہ۔

عہد جدید کے شاندار فلسفی
شہید مرتضیٰ مطہری
کی معرکتہ الآرا کتاب
"مقام حقوق زن در اسلام"

ترجمہ:
سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

فہرستِ کتاب

دوسرا حصہ

تیسرا حصہ

چوتھا حصّہ

پانچواں حصہ

آٹھواں حصہ

گیارھواں حصہ

فہرست:

حرفِ اوّل

- ○ ——— مصنف
- ○ ——— کتاب
- ○ ——— ترجمہ

حرفِ اوّل

مصنّف :-

اللہ، اللہ! کتنے ذہین انسان اس نے پیدا کیے ہیں وہ تند و تیز ہوا جس کے ایک جھکڑ سے تناور درخت اڑ جاتے ہیں، وہ تند رو سیلاب جو فلک بوس ایوانوں کو بہالے جاتے ہیں۔ وہ آتش فشاں دھماکے جن سے پہاڑوں کے کلیجے پھٹ جاتے ہیں۔ انسان کے ایک اشارے، آدم زاد کے ایک کرشمے میں موجود ہیں۔ اللہ نے ابنِ آدم کو تسخیر کائنات کی قوت عطا کی ہے، ہم نے ایسے آدمی دیکھے ہیں جنھوں نے، فضا، ماوراء فضا اور ستاروں پر ہاتھ ڈالا اور قدم فرسائی کی ہے۔

علم، آدم کی میراث ہے اور معاشرے کو باغ و بہار بناتا ہے۔ تسخیر کائنات ہو یا تسخیر قلب و نگاہِ بشر دونوں کے لیے علم درکار ہے۔ علم جلال بھی پیدا کرتا ہے، جمال بھی۔ علم کا ایک نام قرآن ہے دوسرا نام نبیؐ آخر الزماںؐ ہے۔

ہمارے آپ کے نزدیک یہی علم، سیدھی لیکھ بتاتا اور اسی سے اللہ تک رسائی ہوتی ہے۔ اس راستے پر چلنے کے آداب اور اس راستے کے رہنما امام اور ان کے دبستان سے سند فضل و شرف لینے والے علما ہیں۔ کتاب و سنّت کے عالموں میں ایک عالم تھے:-

شیخ مرتضیٰ مطہری ابن شیخ محمد حسین مطہری، صوبہ خراسان ایران کے باشندے، فریمان دیہات کے رہنے والے، دیہات سے نکل کر شہر مقدس مشہد، وہاں سے شہر قم، وہاں سے تہران آکر آباد ہو گئے۔ فریمان میں الف بے پڑھی، مشہد میں، متوسطات کا درس لیا، قم میں "اجتہاد" کا مرتبہ حاصل کیا۔ قم کے متعدد اکابر کے حضور حاضر ہوئے، جن میں خصوصی اساتذہ یہ تھے:-

آیت اللہ سید حسین بروجردی۔
آیت اللہ سید محمد محقق۔
آیت اللہ سید محمد حجت۔
آیت اللہ صدر۔
آیت اللہ سید محمد حسین طباطبائی، مفسر، فلسفی۔
آیت اللہ سید روح اللہ الموسوی الخمینی۔

جناب مطہری، روشن فکر، عمیق نظر، نکتہ رس ذہن، دل کش گفتگو اور اعلیٰ درجے کی تقریر وتحریر کی مہارت رکھتے تھے، انھوں نے تفسیر، حدیث، فقہ و اصول میں جو کچھ پڑھا اسے اقتصادیات سیاسیات، قانون، معاشرتی علوم اور جدید سائنس کے طویل اور عمیق مطالعات میں سمویا اور قوم کے دانشوروں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، وہ مغربی افکار کو مشرقی لہجے میں اور مشرقی افکار کو مغربی فلسفے کی روشنی میں لوگوں تک پہنچانے اور دونوں کے درمیان پل بنانے والوں میں تھے۔

تیئیس[۲۳] سال کی عمر میں (۱۹۵۲ء) وہ تہران آگئے، تہران میں ان کا معاشرتی اور علمی مطالعہ پھیل گیا، جوان طلبہ ان کے گرد جمع ہو گئے وہ آیت اللہ خمینی مدظلہ العالی سے قریب ہوتے گئے۔ آقای مطہری نے بہت اپنی مقبولیت کے سہارے یونیورسٹی تک رسائی حاصل کرلی، وہ دانشکدۂ الٰہیات میں لیکچر دینے لگے اور طلبہ پران کا فکری دباؤ بڑھنے لگا، مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے وہ بین الاقوامی تحریکوں کو قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل کر سکے اور جدید مسائل نیز اسلام کے خلاف زیر زمین اور اندرونِ معاشرہ، خفیہ اور علانیہ تحریکوں کے سامنے آنے لگے، حسینیۂ ارشاد ان کا مورچہ تھا اور تہران یونیورسٹی اور پریس ان کی جنگاہ۔ وہ اساتذہ اور طلبہ کے ذہنوں پر چھا گئے، وہ جوان نسل کے دلوں میں سما گئے، اسلامی علم وعمل کے پرچارک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی انقلاب کے سپاہی بھی تھے وہ ہر وقت دفاع کے لیے تیار اور ہر حملے کا جواب

دینے کے لیے آگے نظر آتے تھے۔ حسینیۂ ارشاد کے بعد مدرسہ سپہ سالاران کا ہیڈ کوارٹر ہوا جسے بعد میں ان کی یاد میں مدرسۂ عالی شہید مطہری کا نام دے دیا گیا۔

۱۹۶۳ء ۱۹۶۴ء — ۱۹۷۹ء تک وہ حملہ آور کا روپ اختیار کر چکے تھے، وہ سیاسی قائد اور فکری رہنما بن کر، بھرپور شخصیت کی صورت میں سب کے سامنے تھے — امام خمینی مدظلہ کے حامی اور انقلاب اسلامی کے داعی قرار پائے، وہ جیل گئے، حکومت کے عتاب اور شاہ پرستوں کے نشانے پر رہنے لگے۔ انقلاب اپنے شباب پر آیا، اور رہبر انقلاب' عراق سے فرانس پہنچے' تو جناب مرتضیٰ مطہری، مرجع اسلام و قائد انقلاب اسلامی سے مذاکرات کرنے پیرس تشریف لے گئے۔ امام خمینی مدظلہ نے گلے لگایا، ہدایات دیے۔ جناب مرتضیٰ مطہری نے واپس آکر تہرانی انقلابیوں کی قیادت سنبھال لی۔

۱۱ فروری ۱۹۷۹ء کو انقلاب اسلامی کامیاب ہوا، اور شیخ مرتضیٰ مطہری مجلس شورائے انقلاب کے رکن و روح و روان بنائے گئے۔ وہ انقلاب کی اصل رفتار، سمت اور بہاؤ کے نگران تھے، وہ ٹھنڈے مزاج کے کوہ صفت رہنما تھے، وہ سمندر کی طرح نرم، گہرے مگر غلط سمت چلنے والی کشتیوں کی غرقابی کے اقتدار سے بہرہ ور تھے۔

انقلاب دشمن، انقلاب در انقلاب کے خواہشمند افراد اور قائد انقلاب کو ذہنی اذیت پہنچانے کی نیت رکھنے والوں نے ۴ جمادی الثانیہ ۱۳۹۹ھ/۱۵ مئی ۱۹۷۹ء کو انہیں شہید کر دیا۔ وہ راہِ خدا میں جاں بحق ہو گئے، وہ انقلاب اسلامی پر قربان ہو گئے اور زندہ جوانوں کو استقامت کا خون عطا کر کے، تاریخ کے زندہ، بہادر علماء دین کی صف میں کھڑے ہو گئے۔

ان کی تاریخ پیدائش ۱۲ جمادی الاوّل ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۲۰ء تھی۔

ان کی بہت سی یادگاریں ہیں — اولاد ہے۔ قوم کے جواں سپاہی ہیں، مدرسے ہیں مسجد اور امام باڑے ہیں اور ان کی انمٹ تحریریں ہیں۔

کتاب :-

"نظامِ حقوقِ زن در اسلام"

شہید مرتضیٰ مطہری رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی اہمیت تصنیف ہے۔ ان کا فکری افق بلند اور روشن تھا، ان کے اطلاعات کا دائرہ وسیع اور ان کا نصب العین اسلام تھا۔ وہ عقلی اور منطقی لہجے اور عام فہم زبان میں بات کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں کے مجموعے اور ان کی کتابوں کے نام دیکھیے، آپ خود سمجھ لیں گے کہ مصنف کس معیار اور کس سطح کا مالک ہے۔

تصانیفِ شہید مطہریؒ :-

- اصولِ فلسفہ و روشِ رئالیسم - پانچ جلد۔
- خدمات متقابل اسلام و ایران۔
- عدلِ الٰہی۔
- پیامبر امیؐ۔
- ختمِ نبوّت۔
- سیرتِ نبویؐ۔
- امامت۔
- جاذبہ و دافعہ علیؑ۔
- حماسۂ کربلا۔
- قیام و انقلابِ مہدیؑ۔
- شناختِ قرآن۔
- تفسیر سورۂ حمد و بقرہ - تین مجلد۔
- سیری در نہج البلاغہ۔

- ولاء ولایتها۔
- بست گفتار۔
- دہ گفتار۔
- علل گرائش بہ مادی گرای
- امدادہای غیبی در زندگی بشر۔
- انسان و سرنوشت۔

جہاں بینی اسلامی، بین الاقوامی میں اسلام کی نظر سے متعلق کتابیں :۔

- انسان و ایمان۔
- جہان بینی توحیدی۔
- وحی و نبوّت۔
- انسان در قرآن۔
- جامعہ و تاریخ۔
- زندگی جاوید یا حیات اخروی۔
- کتاب سوزی ایران و مصر۔
- انسان کامل۔
- عرفان حافظ۔
- نہضتہائے اسلامی در صد سالہ اخیر۔
- پیرامون انقلاب اسلامی۔

علوم اسلامی کا تعارف :۔

- فقہ و اصول فقہ

- کلام و عرفان۔
- منطق و فلسفہ

تعلیم و تربیت :۔

- داستانِ راستان۔
- منظومہ۔
- جہاد۔
- شہید۔

خواتین کے لیے :۔

- اخلاقِ جنسی۔
- مسئلہ حجاب۔
- نظامِ حقوق زن در اسلام ــــ اسی کتاب کا ترجمہ آپ پڑھیں گے۔

مرد کی طرح عورت بھی مختلف علوم و فنون میں موضوع بحث ہے، ادب، تاریخ، نفسیات، فزکس، ہیومن سائینس، معاشرہ اور قانون میں اس کی ذات اور اس کی حیثیت پر کئی زاویوں سے گفتگو ہے۔ پھر مذاہب و ادیان بجائے خود ایک باب ہے۔ مشرق و مغرب "عورت" کی سمتیں اور دو نگاہیں اور دو نظریے لیے ہوئے حاضر بحث ہیں۔

عورت کے حقوق، اسلام میں کیا ہیں، اس کا درجہ اسلام نے کیا بتایا ہے؟ اس کے فرائض کیا ہیں؟ اس کے حقوق یعنی قوانین کیا ہیں؟

مسلمانوں سے یہ سوالات ہوتے ہیں، چونکہ مسلمان اپنے دین کو کامل و مکمل سمجھتے ہیں لہٰذا انھیں بھی جواب دینا چاہیے۔ ابتدائی دور، یعنی زمانۂ نزولِ قرآن، عہدِ سنت نبوی،

اور دورِ ائمہ واصحاب میں یہ سوالات اٹھے تھے اور جواب بھی دیے گئے تھے۔ لیکن زمان و مکان، زبان و بیان کے ساتھ کچھ تبدیلیاں آنا ضروری تھیں۔ کچھ نہ کچھ بات بدلتی ہے نئے حریف کھڑے ہو جاتے ہیں، منطق و استدلال کے نئے مدعی ابھر آتے ہیں، سائنس آف نیچر، سائنس آف لا، پھر قانون کے شعبے، شخصی قانون، قومی قانون، بین الاقوامی قانون، اس کے بعد قانون، تشریحات قانون۔ سفارشات جیسی فلسفانہ موشگافیاں آج کی باتیں ہیں۔

مغرب کے سامنے قوموں کی سپر اندختگی، اپنی ذات، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اپنی فکری شکست کا اقرار دراصل بارادہ و اختیار بلا قیمت یا بڑے سستے داموں بلا وجہ اپنے آپ کو بیچنے کا غلط اقدام ہے۔ آزادی کے بجائے غلامی، زندگی کے بجائے موت، اور موت کے بعد بے نام و نشان رہنے کی تیاری ہے۔ جو صدا مغرب سے اٹھے اور ادھر سب دوڑ پڑے؟! خودداری، غیرت اور اپنے وجود کے احساس سے دست برداری کے یہ طور طریقے اہل دانش و بینش کو ایک نظر نہیں بھاتے، سیاسی اور سماجی مفکر اس پیش قدمی کو اقدامِ خودکشی جیسا جرم جانتے ہیں۔

کچھ سرمایہ دار، اپنی شان و شوکت میں سرخاب کا پر لگانے کے لیے یورپ کی یاترا کرتے ہیں وہاں سے آکر یورپین طور طریقوں کا پرچار، پھر ان کے نظام کی وکالت اور اپنے نظام کی مخالفت کو پیشہ بنا لیتے ہیں۔

بدنام اگر ہوں گے، تو کیا نام نہ ہوگا

مادر پدر آزادی یا فکر و نظر کی غلامی کے نتیجے میں مسلمان سماج، اسلامی قانون پر کبھی زبردست حملے ہوتے ہیں کبھی شب خون مارتے ہیں اور پروپیگنڈے کی ایک مہم یعنی سرد جنگ تیز کر دیتے ہیں:

عورت کا مرتبہ۔ عورت کے حقوق۔ زن و مرد میں مساوات۔ نکاح، طلاق، میراث، پردہ، شہادت وغیرہ۔۔۔ کے چھوٹے بڑے مسائل پر آوازیں اٹھانے

اور نعرے لگانے پھر محاذ بنانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ بہت سے ذہنوں میں حق طلبی، بعض حضرات کے لیے اطمینان کا حصول، بعض لوگوں کو بغاوت کا جواب درکار ہوتا ہے، ہر دور میں علماء اسلام نے جواب دیے اور اسلامی قانون و فلسفۂ قانون کے ماہرین نے وقت کے تقاضوں کا سامنا کیا ہے۔ اسلام اپنی فکری، منطقی، قانونی اور انسان دوست و انسان نواز تعلیم کی وجہ سے زندہ و پایندہ ہے۔ اس زندگی کو مجروح کرنے کے لیے ایران میں بھی ایک تحریک چلی تھی۔ ایران میں، عورت، بحیثیت بیٹی، بیوی اور ماں کے قانون اسلام یا اس سے قریبی حقوق و فرائض کی پابند تھی، لوگوں نے چاہا اس بند کو توڑ دیں ورنہ کمزور یا ڈھیلا تو بنا دینا ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے قانون و معاشرے کے زاویے سے کچھ حملے کیے گئے۔

شہید مرتضیٰ مطہری نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور لوگوں کے اعتراضات و سوالات کے جواب لکھے۔ اس بحث اور جنگ کا میدان، تہران کا مجلّہ — "زنِ روز" — تھا، زیرِ نظر کتاب شہید کے انھیں مضامین کا مجموعہ ہے۔

معاشرہ، تاریخ، فطرت اور نفسیاتی جہات سے عورت کا مرتبہ، خواستگاری، نامزدگی، ازدواج، نکاح، متعہ، تعدد ازواج، نان و نفقہ اور مہر، طلاق، عدّہ، میراث، اولاد۔ لڑکیاں زیادہ، لڑکے کم۔ ان معاشرتی مسائل کا حل اس کتاب میں زیرِ بحث ہے۔

جنسی بحران، دنیا کا اہم مسئلہ۔ طوائف بازی۔ آزاد تعلقاتِ جنسی۔ جنسی کمیونزم۔ دوست لڑکیاں۔ دوست لڑکے۔ اولادِ بے پدر۔ بے گھر زندگی۔ گھریلو زندگی۔

فلاسفہ، افلاطون۔ فرائیڈ۔ برٹینڈرسل۔ اقوام متحدہ کے منشور میں حقوقِ زنان کا تذکرہ نہیں۔

زن و مرد کی مساوات۔ عورت کا استثمار۔ عورت سے اس کا گھر چھیننے کا مسئلہ۔ مرد کا جنسی جنون، شادی کے قابل لڑکیاں۔ شادی کے قابل لڑکے۔ عائلی ذمہ داری

مرد کا فرار ۔ جیسے عناوین پر گفتگو آپ کو ملے گی ۔

اسلامی فقہ و حدیث و قرآن کے عالم کی حیثیت سے شہید مطہری نے بڑی عمدہ بحثیں اور بہت اچھی دلیلیں، نہایت شاندار تنقیحیں پیش کی ہیں ۔ آج کل کے نئے مسائل ہیں، ان کے بارے میں عقلی دلائل ہیں، جواب ہیں اور توضیحات ہیں ۔ اسلامی رویّے اور غیر اسلامی رویّوں کی نشان دہی ہے ۔

کتاب کا اسلوب اور زبان :۔

شہید مطہری، فارسی کے سادہ زبان اور سادہ بیان مصنف ہیں، وہ آج کے مسائل پر آج کی زبان میں بات کرتے ہیں ۔ وہ اصل میں فلسفی ہیں مگر عملی اور نتیجہ خیز فلسفے کے نقیب ہیں ۔ ایران بلکہ سارے جہاں کے لوگ کیا کر رہے ہیں، سوچ کیا ہے، نتائج کیا ہیں، ہمیں کیا کرنا چاہیے ۔ اسلام کیا کہتا ہے ۔ اس کے لیے فقہ، اصول فقہ، قانون اور اصول قانون کا حوالہ، اس کے اصطلاحات بھی آنا ضروری تھے، اس لیے بعض عام قاری کو نئے معلومات اور اہم اطلاعات مہیا کرتے ہوئے شہید مطہری نے حوالے بھی دیے ہیں، اور ہم نے حاشیے میں کچھ توضیحات لکھے ہیں ۔

چار سو سے زیادہ صفحات، اگر صرف کتابی اور خشک خاکے کی صورت میں ہوتے تو بہت سے قاری تھک جاتے ۔ موجودہ حالت میں کتاب، مجموعۂ مقالات ہے ۔ چونکہ یہ مضامین خواتین کے رسالے میں چھپے تھے اس لیے عوامی اور روزمرّہ کی زبان اور زیادہ واضح اسلوب میں بیان ہوئے ہیں ۔ آپ جتنا مطالعہ کرتے جائیں گے روشنیاں تیز ہوتی جائیں گی ۔ معلومات میں اضافہ ہوتا جائے گا ۔

ترجمہ کیوں ؟

اس کتاب کا عربی و انگریزی میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکا ہے ۔ اردو ترجمہ اس لیے

ضروری تھا کہ ہماری وسیع زبان میں ۔ خواتین کا سنجیدہ لٹریچر کم ہے۔ ہماری زبان میں اسلام اور اس کے تعلیمات پر اچھا خاصہ ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرے میں خواتین کے مطالعے تعلیم ذہنی نشوو ارتقا اور فہم وبصیرت کے مجموعے کی فراوانی ضروری ہے۔

انقلاب اسلامی نے خواتین کو نیا کردار دیا :-

انقلاب اسلامی ایران نے، خواتین کے اسلامی نظام فکر وعمل کے متعدد نئے پہلو نمایاں کیے ہیں۔ اور اس میں شہید مطہری کی تعلیم و تربیت دعوت کا ہاتھ بھی تھا۔ لہذا اردو دان اور اردو خوان جوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ۔ خصوصًا ۔ خواتین کے لیے ان کی زبان میں ان کی ضرورت کے لیے ان کے اضافۂ معلومات اور اسلامی نظریات کی توضیح و تعلیم کی خاطر یہ کتاب ہدیہ کی جا رہی ہے۔

سید مرتضیٰ حسین
صدر الافاضل

تہران ۔ ۷، شوال ۱۴۰۵ھ

مقدّمہ

از :-

شہید مطہری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے عہد کے تقاضے، بہت سے مسائل پر دوبارہ نظر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں، یہ مسائل پرانی قدروں کے بجائے نئی قدروں کے طلب گار ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ ہے۔

ـــ "خاندانی ذمہ داریاں اور نظام حقوق خواتین" ـــ

آج فرض کیا جاچکا ہے کہ موجودہ ماحول میں اصل موضوع ہے: "آزادی نسواں" اور "قانونی مساوات زن ومرد"۔ باقی مسائل انھیں دونوں کے ذیل میں آتے ہیں ــ اس پر زور دینے کے اسباب وعلل پر گفتگو آگے ہوگی۔

"نظام حقوقِ خاندان" کے ضمن میں ہمارے نقطۂ نظر سے اصل بنیادی ـ یا بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ "عائلی نظام"، نظام ہائے معاشرت میں کوئی جداگانہ نظام ہے؟ اس کی منطق یا اس کا معیار دوسری منطقوں اور معیاروں سے کسی خصوصیت کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے؟ وہ عقلی دلائل جو معاشرے کے بہت سے اداروں میں کارآمد ہیں، یہاں ان کی حیثیت بدل جاتی ہے؟ یا اس معاشرتی گروپ میں دوسرے گروپوں سے کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس یونٹ میں وہی منطق اور وہی معیار کام آتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں (یونٹوں) میں بروئے کار ہیں؟

اس پریشانی کی اصل یہ ہے کہ ایک تو اس کے ادارے دو رکنی، "دو جنسی" ہیں۔ دوسری طرف والدین اور اولاد کا نسلی تسلسل ہے۔ کارخانۂ خلقت نے اس یونٹ کی وضع "باہمی مشابہت کے فقدان" اور "عدم یکسانیت" پر رکھی ہے۔ ان دونوں کے کیفیات میں

اختلاف موجود ہے۔

خاندانی معاشرہ "طبیعی ـ باہمی مفاہمت" کا معاشرہ ہے۔ اور دو معاشرتی یونٹوں کی درمیانی کڑی ہے ـ جیسے شہد کی مکھی اور مماکھی، جن کے تمام قانون، قاعدے طبیعت و جبلت کی جہت سے معین ہیں۔ ان سے سرتابی ممکن نہیں۔ اور ایک مفاہمتی معاشرتی یونٹ جیسے انسانی مدنی معاشرہ کہ اس میں طبیعی و جبلتی پہلو کا دخل کم ہے۔

چنانچہ ہم جانتے ہیں ـ ماضی بعید کے فلاسفہ، خاندانی فلسفۂ حیات کو "حکمتِ عملی" کا ایک مستقل باب مانتے تھے، اور وہ معتقد تھے کہ اس یونٹ کی منطق اور معیار انسانی زندگی کے دوسرے شعبوں سے مختلف ہے۔ افلاطون نے "رسالہ جمہوریت" اور ارسطو نے "کتاب سیاست" اور بوعلی سینا نے "کتاب الشفاء" میں موضوع کو اسی زاویے سے دیکھا ہے۔

معاشرے میں "حقوق زن" پر گفتگو میں بھی طبعی طور پر یہ بحث ہے کہ طبیعی و انسانی جہت سے مرد و زن کے حقوق یکساں و ہم آہنگ ہیں؟ یا ایک دوسرے سے الگ الگ اور ہم آہنگی سے دور ہیں؟ یعنی، خلقت و فطرت نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں وہ خلقتاً یک جنسی ہیں یا دو جنسی؟ آیا حقوق و فرائض معاشرہ میں ـ "مردانگی" اور "نسوانیت" کا عمل دخل ہے؟ یا تکوین و تخلیق کی منطق میں دونوں طبیعی زاویے سے ایک جنس ہیں؟

○

مغربی دنیا نے سترھویں صدی عیسوی کے بعد علمی و فلسفی تحریکیں شروع کیں۔ جس کے نتیجے میں "حقوق بشر" کے نام سے معاشرتی میدان میں بھی ایک تحریک نے جنم لیا۔ سترھویں، اٹھارویں صدی میں مفکروں اور ادیبوں نے اپنا فکری اثاثہ عوام میں تقسیم کر کے انسان کے ناقابل سلب و انتقال فطری حقوق کی بحث عام کردی۔ اور قابل تعریف محنت کی۔

جان جوک روسو ـ والٹیر ـ مان ٹسکو ـ اسی گروپ کے مفکر و ادیب تھے۔ ان لوگوں کا انسانی معاشرے کی تعلیم و تربیت پر حق بھی ہے ـ یہ دعویٰ کرنا بے جا نہیں کہ انسانی

معاشرے پر ان کا حق ان لوگوں سے کم نہیں جنھوں نے دنیا میں اہم ایجادات و انکشافات کیے ہیں۔
ان لوگوں کا مرکز خیال یہ نکتہ بن گیا کہ انسان فطرتاً، اور خلقت و طبیعت کی بنیاد پر کچھ حقوق اور کچھ آزادیاں رکھتا ہے۔ یہ آزادیاں اور یہ حقوق کوئی فرد یا جماعت یا قوم کسی بھی عنوان اور نام سے کسی فرد یا قوم سے نہ چھین سکتی ہے نہ صاحب حق خود انہیں کو کسی دوسرے کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔ تمام انسان: حاکم و محکوم، سفید و سیاہ، سرمایہ دار و غریب، سب آزادی اور حقوق انسانی "مساوی" ہیں۔

یہ فکری و معاشرتی تحریک ابھری اور اس کے نتائج پہلے انگلستان پھر امریکہ، اس کے بعد فرانس میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوئے۔ انقلاب آئے، نظام بدلے، قراردادوں پر دستخط ہوئے پھر دنیا کے دوسرے نقاط پر اس کا اثر پڑنے لگا۔

انسانی حقوق کے فلسفے نے انیسویں صدی میں کچھ نئے فکری زاویے پیدا کیے ان کا تعلق اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے تھا، ان افکار نے حالات میں مزید تبدیلی پیدا کی جس کی ایک شکل ہے سوشلزم ــ مزدور طبقہ کا نفع پر استحقاق ــ سرمایہ داروں سے مزدوروں کے حامیوں کو حکومت کا انتقال۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "انسانی حقوق" پر جو بحث یا عملی اقدامات ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر حکومت کے مقابلے میں قوم یا مالک و کارخانہ دار کے مقابلے میں محنت کش طبقے سے مربوط تھی۔ بیسویں صدی میں "مردوں کے حقوق" اور ان کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا مسئلہ اٹھا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد جب "ادارۂ اقوام متحدہ" قائم ہوا تو اس نے مساوات حقوق مرد و زن کا کھلا منشور شائع کر دیا۔

یورپ کے تمام معاشرتی انقلابوں میں ــ سترھویں صدی سے موجودہ صدی تک اصلی محور دو تھے:

آزادی ــ مساوات ــ اور بس، بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔ اس لحاظ سے

کہ تحریک حقوق زن مغرب میں دوسری تحریکوں کے زیر اثر تھی اس کے علاوہ یہ تحریک یورپ کے مزاج سے موافق نہ تھی، اس وجہ سے اس تحریک میں آزادی اور مساوات کے عنوان کے آگے بات نہ بڑھی۔

انقلابی رہنماؤں نے یہ طے کر لیا کہ آزادیٔ نسواں اور اس کے حقوق کی مردوں سے یکسانیت، جس کا چرچا سترھویں صدی سے شروع ہوا تھا اسی نکتہ پر ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا جب تک عورت کی آزادی اور اس کے حقوق مرد کے برابر نہیں مانے جاتے ۔ آزادی اور حقوق انسانی ۔ پر بحث بے معنی ہے۔ تمام خاندانی مشکلات صرف اس لیے ہیں کہ عورت نہ آزاد ہے نہ اس کے حقوق مرد کے حقوق کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو روشن کر دیا جائے تو خاندانی مشکلات حل ہو جائیں گے۔

اس تحریک میں جس کو ہم نے "نظام حقوق خاندان کا بنیادی مسئلہ قرار دیا یعنی، آیا فطری طور پر نظام کوئی مستقل نظام ہے؟ کیا اس کی منطق اور اس کے معیار دوسرے سماجی اداروں سے جدا ہیں؟ لیکن یہ سوال نکر فلاسفہ سے دور رہے۔ ان کا فکر و نظر کا رخ ایک طرف رہا وہ ہے۔ "اصل آزادی" اور "اصل مساوات" زن و مرد۔

دوسری لفظوں میں: حقوقِ نسوان کے موضوع بحث کا زاویہ یہ کلیہ رہا۔ "طبیعی و فطری حقوق جو چھینے نہیں جا سکتے۔" اسی مرکز پر سارے دائرے بنتے رہے۔ انسانیت میں عورت مرد کی شریک ہے۔ عورت ایک مکمل اور معیاری انسان ہے۔ اس لیے اسے مرد کی طرح ان حقوق سے بہرہ ور ہونا چاہیے جو" فطرت نے انساں کو دیئے ہیں اور وہ چھینے نہیں جا سکتے۔"

"طبیعی حقوق" کی دریافت کن مصادر سے ہوتی ہے؟ ہم نے اس کتاب کے ابواب و فصول میں نسبتاً کافی و مکتفی بحث کی ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ خود طبیعت "طبیعی و فطری حقوق" کا سرچشمہ و ماخذ ہے۔ یعنی اگر انسان کو ایسے حقوق حاصل ہیں جو گھوڑے

اور بکری یا مرغ و ماہی کو حاصل نہیں تو اس کی تہہ میں طبیعت و خلقت کا ہاتھ ہے۔ اور اگر تمام آدم زاد "طبیعی حقوق" میں مساوی ہیں اور سب کو آزاد زندگی حاصل ہے تو یہ فرمان متنِ خلقت سے صادر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل موجود نہیں ہے۔ مساوات و آزادی کو فطری حق ماننے والے دانشوروں کے پاس بھی صرف یہی دلیل ہے۔ نظام خاندان کے بنیادی مسئلہ میں بھی "طبیعت" کے علاوہ کوئی ماخذ و مصدر نہیں۔

"نظام حقوق خاندان" میں ہم جسے بنیادی مسئلہ مانتے ہیں، اس پر مفکرین کی توجہ نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ آیا موجودہ علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ زن و مرد کا اختلاف چند اعضا کا معمولی سا اختلاف ہے اس سے جسمانی ڈھانچے اور ان نفسیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جن سے حقوق کا تعلق ہے؟ اور اس سے ذمہ داریاں قبول کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودہ معاشرتی فلسفے میں اسی وجہ سے کوئی نیا گوشوارہ حساب نہیں کھلتا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے۔ حیاتیاتی و نفسیاتی علوم کی ترقی نے جو انکشافات کیے ہیں ان سے دونوں جنسوں کے فرق نمایاں اور بہت زیادہ روشن ہوئے ہیں۔ ماہرین حیاتیات، فیزیالوجی، اور سائیکالوجی جاننے والوں کے تحقیقات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ زینتِ طاقِ نسیاں کر دیا گیا۔

اس غفلت و بے توجہی کا شاید یہ سبب ہو کہ تحریک تیزی سے ابھری لہذا جہاں اس نے عورتوں کی بہت سی بدبختیوں کو دور کیا وہاں کچھ مجبوریاں اور بدنصیبیاں اس کو تحفہ میں دیں اور انسانی معاشرے کو بھی اس لپیٹ میں لے لیا۔ آئندہ ابواب میں ملاحظہ کیجیے گا کہ یورپ کی عورت بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک معمولی اور روزمرہ کے حقوق سے بھی محروم تھی۔ اسی زمانے میں اہل مغرب کو تلافیِ مافات کا خیال آیا۔

مساوات و آزادی کے نام سے متعدد تحریکیں وجود میں آچکی تھیں، انھیں میں مسئلہ زیر بحث بھی تھا۔ آزادی و مساوات، دو لفظوں سے معجزہ آفرینی کی امید لگانے والے سب

مسائل انہیں سے حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے کہ مساوات و آزادی کا رشتہ "خود انسان کے بحیثیت انسان" کے زاویے سے پیدا ہونے والے تعلقات کا پابند ہے۔ منطقی زبان میں ۔ مساوات و آزادی انسانی حق ہے اس حیثیت سے کہ وہ انسان ہے"۔ عورت چونکہ ایک حیثیت سے انسان ہے۔ لہذا ہر انساں کی طرح آزاد پیدا ہوئی ہے اور مساوی حقوق کی مالک ہے لیکن "عورت چند مخصوص کیفیات کی حامل انسان ہے۔ عورت و مرد انسانیت میں "برابر" ہیں ، لیکن یہ دو طرح کے انسان ہیں۔ ان کی خصلتیں دو الگ الگ طرح کی ہیں۔ ان کے نفسیات دو قسم کے ہیں اور یہ دوئی جغرافیائی ، تاریخی یا معاشرتی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی اساس عین تخلیق کے اندر رکھی گئی ہے۔ اس دوئی سے طبیعت کا ایک مقصد وابستہ ہے اور جو عمل طبیعت و فطرت کے خلاف ہوگا اس کے عوارض ناپسندیدہ رونما ہوں گے جس طرح ہم نے آزادی اور انسانوں میں مساوات ۔ ان میں سے عورت مرد کا مسئلہ۔ طبیعت کے سرچشمے سے حاصل کیا ہے۔ اسی طرح کیفیتوں کی اکائی یا دوئی میں عورت مرد کے حقوق کا سبق حاصل کرنا ہوگا۔ یونہی "خاندانی معاشرہ ۔ کم از کم ایک نیم طبیعی چیز ہے یا نہیں؟" اس کا جواب بھی طبیعت و فطرت سے لینا چاہیے ۔ کم از کم یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے کہ حیوانات کی "دو جنسی" جن میں سے ایک جنس انسان ہے ، اتفاقی عمل ہے یا تخلیقی منصوبے کا حصہ ہے؟ آیا دونوں جنسوں کا اختلاف صرف سادہ عضوی اختلاف ہے یا بقول الکسیس کارل انسانی جسم کے سر خلیے میں اس کی جنسیت کے علامات موجود ہیں؟ کیا منطق و زبانِ فطرت میں مرد و زن دونوں کے الگ الگ فرائض ہیں یا نہیں؟ کیا حقوق قانون بھی یک جنسی ہیں یا دو جنسی؟ اخلاق و تربیت دو جنسی ہے یا ایک جنسی؟ سزاؤں کے بارے میں کیا رویہ ہے؟ اور ذمہ داریوں اور فرائض کی صورت کیا ہے؟

اس تحریک میں یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ مساوات و آزادی کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں ، مساوات و آزادی ایک لازمی شرط ضرور ہے مگر فقط یہی کافی نہیں ۔ قانون و

حقوق کی مساوات اپنی جگہ اور دونوں میں مشابہت بھی تو کوئی حقیقت ہے۔ عورت مرد کے حقوق میں برابری مادی و روحانی طور پر ایک بات ہے اور دونوں میں مماثلت اور صورت میں مشابہت دوسری بات ہے ۔ اس تحریک میں عمداً یا سہواً "مشابہت" کی جگہ "مساوات" اور "مماثلت" کی جگہ "برابری" کو مان کر ایک بنا دیا گیا۔ "کیفیت" "کمیت" کے تحت الشعاع میں آگئی۔ عورت کا "انسان" ہونا اس کے "عورت" ہونے کو نظر انداز کرنے کا سبب بن گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس بے توجہی کو فقط ایک ایسی فلسفی غفلت کا نام نہیں دینا چاہیے جو عجلت کی بنا پر ہوئی۔ اس میں دوسرے عوامل بھی تھے جو "آزادی" اور "مساواتِ زن" کے ذیل میں قابلِ استفادہ تھے۔

اس مہم کے پس پردہ سرمایہ داروں کے منافع بھی کام کر رہے تھے۔ کارخانہ دار جو عورت کو گھر سے کارخانے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ اس سے اقتصادی فائدے اٹھانے کی فکر میں تھے۔ ان لوگوں نے نعرہ لگایا ۔ عورت کے حقوق ۔ عورت کی اقتصادی آزادی۔ عورت کی آزادی۔ مرد و عورت کے حقوق مساوی ہیں ۔ ان لوگوں کی بدولت مطالبات نے قانونی صورت اختیار کی۔

ویل ڈیورانٹ "لذتِ فلسفہ" نویں فصل میں ۔ ارسطو ، نطشے ، شوپن ہاور اور یہودیوں کی مقدس کتابوں سے عورت کے بارے میں حقارت آمیز رائے نقل کرتا اور کہتا ہے ۔ انقلابِ فرانس میں عورت کی آزادی کا مسئلہ موجود تھا لیکن کوئی عملی تبدیلی نہیں ہوئی ۔ انیسویں صدی تک عورت کے پاس ایک قانون تھا جس کی رو سے مرد کو عورت کے احترام کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں عورت کے حالات میں تبدیلی آنے کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

عورت کی آزادی صنعتی انقلاب کی بدولت ہے ...... عورتیں سستی مزدور تھیں، کارخانہ دار سرکش اور گراں قیمت مرد، مزدوروں پر انھیں

ترجیح دیتے تھے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل تھا۔ لیکن مردوں سے اشتہاروں میں درخواست ہوتی تھی کہ بچوں اور عورتوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ آزادیِ خواتین کے لیے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا، جس نے۔ عظیم برطانیہ۔ کی عورت کو وہ اعزاز دیا جس کی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ یعنی، عورت جو روپیہ کمائے گی وہ اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کا حق رکھتی ہے۔ اس اعلیٰ اخلاقی قانون کو انگلستان کے مجلس عوام کے کارخانہ والوں نے وضع کیا اور اس طرح انگلستان کی عورتوں کو کارخانوں میں کھینچ لیا اس سال سے اب تک جان لیوا محنت کی مزدوری نے ان کو گھر بار کے جھنجٹ سے چھٹکارا دلا دیا اور دکانوں اور کارخانوں میں خون پسینہ بہانے کا عادی بنا دیا۔[1]

مشینی دور کی روز افزوں ترقی، صنعتی پیداوار میں ضرورت سے زیادہ اضافہ، پھر مصنوعات استعمال کرنے اور خریدنے والوں کو ہزار افسوں و نیرنگ سے مائل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر، سمعی بصری، فکری و جذباتی، ذوق و ہنر، فن اور آرٹ حتیٰ کہ جنسی عوامل درکار تھے جو گاہکوں کو بلا ارادہ چیزیں خریدنے پر مجبور کریں۔ یہ نئی ضرورت

---

[1] ڈاکٹر علی شایگان: شرح قانون مدنی ایران ص۳۶۶ میں ہے:

عورت اپنی ملکیت پر جو حق رکھتی ہے اور شیعہ فقہ نے اسے شروع ہی میں تسلیم کیا وہ کچھ عرصہ پہلے اکثر قوانین ممالک میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا اس میں یونان۔ روم۔ جرمن۔ بھی داخل ہیں، کہیں اس حق کا نام و نشان نہ تھا۔ یعنی نابالغ، دیوانے اور مجبور جس کی املاک زیر تحویل حکومت ہو، کی طرح اپنی دولت خرچ کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے عورت کی شخصیت، شوہر کی ذات میں فنا تھی۔ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۲ء میں "ملکیتِ زن" کے نام سے دو قانون بنے اور عورت کی ملکیت سے کسٹوڈین شپ ختم ہوئی۔

مجبور کر رہی تھی کہ سرمایہ دار عورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کو استعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت، جسمانی قوت، کام کرنے کی صلاحیت، معمولی کاری گر، یا پیداوار میں مرد کا شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جارہی تھی۔ اس کی جاذبیت۔ مقناطیسی کشش، فکر و خیال کو قابو میں لانے کی قوت، ارادے بدل دینے کی طاقت اور کرامت رہن رکھنے، آبرو ریزی ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زاویہ سامنے آیا، اب پیداوار، صارف کے سر تھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کاروبار کے لیے۔ آزادی اور مساوات مرد و زن۔ کارآمد مہم تھی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قصے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کے لیے اسے استعمال کر رہا ہے مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے، بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم و رواج سے فرار کرنا چاہتا تھا اور مفت، کم قیمت شکار ہاتھ آئے تو اسے خسارہ کیا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی مظلومیت اور حقوق تلفی پر سب سے زیادہ مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ وہ اس جہاد مقدس میں آگے تھا اس نے اس کام کے لیے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے ڈھکیل دیا۔ کبھی کبھی تو اس نے "مجرّد" زندگی گذارنے کی ٹھان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بدنصیبوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہو گئی کہ اسے نئی بدبختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت پابند ہے اسے دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی؟ یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے، وہ اپنی پرانی بدنصیبیاں بھی دور کر سکتی ہے اور نئی بدبختیوں کو بھی روندنے کا

اختیار رکھتی ہے؟

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت پر کوئی جبر نہیں ہے۔ پرانی بدنصیبیاں تو اس علت سے پیدا ہوئیں کہ عورت کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور نئی بدبختیاں اس سبب سے پیدا ہوئیں کہ عمداً یا سہواً۔ اس کا عورت ہونا، اس کی طبیعی، فطری، ذمہ دارانہ حیثیت، مرکزیت، اندرونی تقاضے، خصوصی صلاحیتیں طاق نسیاں پر رکھ دی گئیں۔

عجیب بات ہے، جب مرد و عورت کے فطری اور طبیعی اختلاف کی بات چھڑتی ہے تو ایک گروپ اسے عورت کے نقائص اور مرد کے امتیازات کا قصہ لے بیٹھتا ہے آخر کار عورت کی محرومیوں اور مرد کی کامرانیوں پر بات ٹوٹتی ہے۔

محرومی و کامیابی، نقص و کمال کا مسئلہ نہیں، کارخانۂ قدرت نے ایک کو ناقص دوسرے کو کامل، ایک کو کامیاب و کامران دوسرے کو محروم و ناکام نہیں پیدا کیا۔

یہی گروپ اس منطقی و فلسفی مفروضے کے بعد کہتا ہے۔ اچھا، فطرت نے تو عورت پر یہ ظلم ڈھا دیا، وہ ناقص و کمزور پیدا ہوئی، تو کیا ہم بھی ایک نیا سبب بنیں اور ظلم پر ظلم کا اضافہ کریں؟ اگر عورت کی طبیعی حالت کو بھلا دیں تو کیا زیادہ انسانی عمل نہیں ہوگا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے۔ عورت کی فطری و طبیعی وضع سے بے توجہی اس کے حقوق پائمال ہونے کا بڑا سبب بنی۔ اگر مرد محاذ لگائے اور عورت سے کہے: ہم تم برابر۔ کام کاج، ذمہ داریاں، فائدے، نتائج، سزائیں سب ملتی جلتی ہوں گی۔ بھاری اور مشکل کاموں میں شریک رہو، برابر کھڑی ہو، اپنی طاقت کے مطابق کام کرو اور اسی کی بنیاد پر مزدوری۔ ہم سے احترام و نگہداشت کی توقع نہ رکھو۔ اپنے روزمرہ اخراجات خود مہیا کرو۔ اولاد کے اخراجات میں اپنا حصہ دو۔ خطرے میں اپنی حفاظت خود کرو۔ ہم تم پر خرچ کرتے ہیں تم ہم پر اپنے پیسے خرچ کرو...... تو عورت معرکے میں پھنس جائے گی کیونکہ اس کی قوت کارکردگی طبیعی طور پر کم، اور روپے کا خرچ زیادہ ہے۔ ماہواری

ردگ۔ زمانۂ حمل کی بے چینی، وضع حمل کی سختی، شیرخوار کی دیکھ بھال، عورت کو ایسی صورت حال سے دوچار کرنے والی چیزیں ہیں جہاں اسے مرد کی سربراہی درکار ہوتی ہے۔ ذمہ داریاں کم اور آمدنی زیادہ چاہیے ۔ یہ سب کچھ انسان ہی میں نہیں، جوڑے جوڑے زندگی بسر کرنے والے ہر جاندار کا معاملہ یہی ہے۔ تمام حیوانات میں غریزہ و فطرت کے زیر اثر مادہ کی حمایت نر کا فریضہ ہے وہ مادہ کی حفاظت پر کمربستہ و حملہ آور رہتا ہے۔

مرد و زن کی طبیعی و فطری ساخت کو سامنے رکھا جائے۔ انسان ہونے میں مساوی سمجھا جائے، انسانی حقوق کو مشترک مانا جائے، تو "عورت" کو نہایت مناسب مقام مل سکتا ہے، ایسا مرتبہ جہاں نہ اس کی ذات کچلی جائے نہ اس کی شخصیت کو نقصان پہنچے۔

زن و مرد کی فطری و طبیعی حیثیت کو فراموش کرنے، اور صرف آزادی و مساوات پر اکتفا کریں۔ نتائج سے آگاہی کے لیے کچھ اخباری جائزے لیتے ہیں، اور یہ جائزہ بھی ان کا جو ہم سے پہلے اس راستے سے گذرے بلکہ منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے اور کیا لکھتے ہیں:

رسالۂ "خواندنیہا" شمارہ ۷۹، سنہ ۱۳۳۴ خ، ۴ر تیر ماہ سنہ ۱۳۵۳ ش (مطابق جولائی سنہ ۱۹۷۴ء) ماہ نامہ "تہرانی" کا مقالہ ہے۔ "سرگذشتہای از زنان کارگر در جامعۂ امریکا"۔ امریکی معاشرے میں محنت کش عورتوں کی سرگذشت ۔ رسالۂ "کرنٹ" کے مضمون کا ترجمہ۔

مقالہ پڑھنے کے قابل ہے، شروع میں ایک خاتون کا درد دل نقل ہے، نیز زن و مرد کی مساوات کا تذکرہ اور ان رعایتوں کا بیان جو گذشتہ زمانے میں مزدور عورتوں کو دی جاتی تھیں ۔ مثلاً:۔

۲۵ پونڈ سے زیادہ وزن نہ اٹھائیں جبکہ مردوں کو یہ رعایت حاصل نہ تھی۔

آج عورت اس رعایت سے محروم ہے۔ صوبہ اہایو کی ورکشاپ "جنرل موٹر"۔ عورتوں کی سزا کا مرکز کہنا زیادہ بہتر ہوگا ۔ ڈھائی ہزار خواتین یہاں کام کرتی ہیں.....

یہ خاتون ایک بڑے گیس پلانٹ کی دیکھ بھال پر متعین اور کبھی انھیں ایک بھٹی کی صفائی کرنا پڑتی ہے یہ فولادی بھٹی ۲۵ پاؤنڈ کی ہے جسے قوی ہیکل مرد نے سیٹ کیا ہے۔ خاتون زیر لب کہتی۔ میں اندر سے چورا چورا اور باہر سے زخمی ہو چکی ہوں ...... میرا کام تھا کہ ہر لمحہ ایک تھوڑا اٹھاؤں جس کا طول پچیس سے پچاس انچ تک اور وزن پینتیس پاؤنڈ، یہ تھوڑا ایک کلنٹے میں لٹکانا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ہمیشہ ورم اور ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔"

مضمون میں ایک اور خاتون کا درد دل، پریشانی و بے چینی کی داستان ہے۔ اس کا شوہر بحریہ میں قلی تھا۔ ایک مرتبہ بحریہ کے افسر اعلیٰ نے مردانہ جہاز میں کچھ عورتوں کی بھرتی کا اعلان کیا .... لکھتی ہے، ان دنوں بحریہ کے ایک جہاز میں چالیس عورتیں اور چارسو اسی مرد ڈیوٹی پر بھیجے گئے۔ جب یہ جہاز اپنے پہلے مخلوط سفر سے واپس آیا تو معلوم ہوا کہ قلیوں کی بیویوں کا خوف وہراس بے جا نہ تھا کیونکہ انھیں تھوڑی سی مدت میں معلوم ہوا کہ یہاں خالی خولی عشق کی داستانیں ہی نہیں بلکہ ہر عورت کئی کئی اشخاص کے ساتھ جنسی آمیزش میں ملوث ہوئی ہے۔

مقالہ نگار لکھتا ہے۔ "فلورائیڈ میں آزادی کے بعد بیوہ عورتوں کو عجب پریشانیوں کا سامنا ہے۔ یہاں قانون کے مطابق ہر بیوہ کو پانچ سو ڈالر تک ٹیکس معاف تھا، ایک جج "ٹامس ٹناڈ" نے اس قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور کہا کہ یہ قانون مردوں کے حق میں مداخلت کرتا ہے (اور صرف عورتوں کو رعایت دیتا ہے)

آگے لکھتا ہے: "مسز میک ڈانلڈ کے ہاتھوں میں سوزش (جلن) تھی، مسز اسٹون (جن کے شوہر قلی تھے) اضطراب اور تشویش سے دوچار ہوتی ہے، صوبہ فلورائیڈ میں بیوہ عورتوں پر نقد جرمانہ ہوا ہے۔ اب ہر ایک آزادی کا مزہ چکھے گی۔ بہت لوگوں کے ذہن میں یہ سوال آرہا ہے کہ خواتین نے جن حقوق سے فائدہ اٹھایا تھا کیا اس سے زیادہ نقصان برداشت نہیں کر رہی ہیں؟ خیر یہ بحث بے فائدہ ہے کیونکہ کھیل شروع

ہو چکا، تماشائی اپنی اپنی کرسیاں حاصل کر کے بیٹھ چکے اب کی سال طے ہوا ہے کہ امریکہ کے آئین کا ستائیسواں "ترمیم شدہ پیراگراف" منظور ہو جس کے مطابق جنسی اختلافات کی ہر برتری خلاف قانون قرار پائیں .... اور یوں ان بیانات کی تصدیق ہو جائے جو ہارورڈ یونیورسٹی کے استاد قانون رسکو باؤنڈ نے دیے تھے۔ "امریکہ میں عورتوں کی آزادی عورت کے قانونی خصوصیات کی بنا پر افسوسناک نتائج کا باعث ہے۔

کیر ولین شمالی کے سنیٹر "جی ایروین" نے امریکہ کے معاشرتی مطالعے کے بعد تجویز رکھی تھی ...... خاندان سے متعلق قوانین مکمل طور پر بدل دیے جائیں۔ اب مرد کو قانونی طور پر خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار نہ ہونا چاہیے۔

یہ رسالہ لکھتا ہے۔ "مسز خانم میکڈانلڈ" کے بقول، ایک خاتون بھاری بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیلان خون کی شکایت میں مبتلا ہے۔ ہم اپنی پرانی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرد عورتوں سے عورتوں کا سلوک کریں، مزدور جیسا نہیں۔ آزادی نسواں کے حامیوں کی نظر میں یہ بات بہت معمولی ہو گی کہ اپنے شاندار ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر کہیں۔ عورت مرد برابر ہیں۔ ان حضرات نے اب تک کارخانوں کی صورت نہیں دیکھی ہے۔ انھیں خبر نہیں کہ اس ملک کی اکثر مزدور خواتین کارخانوں میں کام کرتے کرتے جان پر کھیل رہی ہیں۔ ہمیں یہ برابری نہیں چاہیے، ہم سے مردوں کے کام نہیں ہوتے۔ مرد جسمانی لحاظ سے ہم سے زیادہ مضبوط ہیں۔ اگر یہ طے ہو جائے کہ ہم ان کے مقابلے میں کام کریں اور ہمارے کام کا ان کے کام سے موازنہ ہو، تو ہم اپنی حد تک مستعفی ہیں۔ صوبہ اھایو" میں مزدوروں نے قانون تحفظ حقوق سے جو کچھ پایا ہے، اس سے زیادہ کھویا ہے۔ ہم نے اپنی نسوانی شخصیت ضایع کر دی۔ ہمیں آزادی کے بعد نہیں معلوم کہ فائدہ کیا ہوا۔ ہو سکتا ہے۔ گنتی کی چند عورتوں نے بہتر حالات دیکھے ہوں لیکن ہم بہرحال ان میں نہیں ہیں۔"

یہ تھا اس مقالہ کا خلاصہ۔ مضمون کے اندراجات سے صاف نظر آتا ہے کہ خواتین "آزادی و مساوات" کے نام سے جن مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کے نتیجے میں انھیں ان دونوں لفظوں سے چڑھ ہوگئی۔ وہ بھول رہی ہیں ان دونوں لفظوں کا گناہ کوئی نہیں۔ زن و مرد، دو الگ الگ مداروں کے دو ستارے ہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے مدار اور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرنا چاہیے۔

"لا الشمس لھا ان تدرک القمر...... [1]" سورج کو حق نہیں کہ چاند پر جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے جا سکتی ہے ہر ایک اپنے اپنے فلک میں گردش کر رہا ہے۔" مرد و زن کی اصل سعادت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں دو جنس رہ کر اپنے اپنے دائرہ کار میں سفر جاری رکھے۔ آزادی و برابری کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا، جب ہر ایک اپنی فطری و طبیعی راہ پر چلتا رہے۔ معاشرے میں خلفشار پیدا ہونے کا سبب فطرت و طبیعت کے فرمان سے سرتابی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔

"نظامِ حقوقِ خواتین، خاندان اور معاشرے میں"۔ ہم مدعی ہیں کہ یہ مسئلہ اساسی مسئلہ ہے اور اس پر نئے سرے سے نظر کرنا چاہیے۔ گذشتہ اقدار پر اکتفا نہ کی جائے، از سرِ نو اقدار دریافت ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے طبیعت و فطرت کو رہنما اصول بنائیں۔ دوسرے مرحلے میں گذشتہ اور موجودہ صدیوں کے تلخ و شیریں تجربے سامنے رکھیں اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت تحریکِ حقوقِ خواتین صحیح معنی میں کامیاب طور پر آگے بڑھ سکے گی۔

○

قرآن کریم — دوست، دشمن دونوں کے نزدیک "حقوقِ خواتین" کا احیا

---

[1] سورہ یٰسٓ کی چالیسویں آیت ہے: "لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار وکل فی فلک یسبحون"

کرتے والا۔ مخالفین کم از کم اتنا تو اقرار کرتے ہی ہیں کہ زمانۂ نزول میں قرآن نے "خواتین کے فائدے" اور حقوقِ انسانی کے لیے بڑے بڑے اقدام کیے۔ لیکن قرآن مجید نے انسان کے عنوان سے "احیاءِ زن" اور اسے مرد کی شریکِ انسانیت و حقوق انسانی کے نام عورت کے عورت ہونے اور مرد کے مرد ہونے کو طاق نسیاں کے سپرد نہیں کیا۔

دوسرے لفظوں میں :-

قرآن مجید نے عورت کو اسی زاویے سے دیکھا جو اس کی جبلت و طبیعت کا زاویہ ہے۔ لہذا فرمانِ قرآن و فرمانِ طبیعت میں ہم آہنگی ہے۔ قرآن میں جو عورت ہے وہی عورت طبیعت میں ہے۔ اللہ کی یہ دو بڑی کتابیں — ایک کتاب تکوین دوسری کتاب تدوین — ایک دوسرے پر منطبق ہیں۔

مقالات کے اس سلسلے میں اگر کوئی مفید بات دکھائی دے گی تو وہ اسی انطباق و ہم آہنگی کی توضیح ہو گی۔

○

محترم ناظرین کے سامنے مقالات کا ایک مجموعہ ہے جو ایک خاص موقع پر ۴۵-۴۶ (شمسی) مطابق ۱۹۶۶ء، ۶۷ ۱۹ء) کے "رسالہ زنِ روز" کے لیے لکھے گئے تھے۔ موضوع تھا "قانون اسلام میں خواتین" (زن در حقوق اسلامی)۔ مقالات نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ جن حضرات کو گذشتہ معاملات سے رابطہ نہیں یا اس ماجرے میں موجود نہ تھے، ان کو حیرت ہو گی۔ یہ مقالات پہلی مرتبہ اس رسالے میں چھپے تھے! میں نے مقالات کے اس سلسلے کے لیے اس رسالے کو کیسے منتخب کیا؟ وہ رسالہ بھی انھیں چھاپنے کے واسطے کیونکر آمادہ ہوا؟ اس بنا پر "شانِ نزولِ" مقالات کا بتانا ضروری ہے۔

سنہ ۱۳۴۵ خورشیدی (۱۹۶۶ء) میں "قوانین مدنی" کا "حقوق خانوادگی" بدلا جانے

والا تھا، رسائل کی سطح پر، خصوصاً، خواتین کے رسائل مسئلے کو لے اڑے، چونکہ اکثر تجاویز جو تھے وہ کھلم کھلا آیات قرآن کے برعکس تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانانِ ایران میں بے چینی دوڑ گئی۔ مرحوم ابراہیم مہدوی زنجانی، جج اس ہنگامے میں سب سے زیادہ خاک اڑا اور گرمی دکھا رہے تھے۔ موصوف نے "چالیس نکاتی منشور" تیار کیا، اور مجلہ "زنِ روز" میں شایع کیا۔ مذکورہ رسالے نے جدول دار صفحات میں۔ اس دور کی زبان میں "کوپن" بنا کر۔ چھاپا، اور اپنے پڑھنے والوں سے ان نکات پر رائے طلب کی۔ ادھر قانونی منشور لکھنے والے نے مخالف رائے دینے والوں کا جواب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

انہی دنوں، تہران کے ایک عالم جلیل و محترم نے مجھے ٹیلیفون کیا ادارۂ کیہان و ادارۂ اطلاعات کے مدیر حضرات سے انھوں نے ملاقات کی اور ان دونوں اداروں سے نکلنے والے زنانے رسائل میں جو مضامین چھپے ہیں۔ ان پر اظہار خیال فرمایا۔ دونوں حضرات نے کہا کہ اگر آپ رائے دیں تو ہم اسے بعینہ چھاپنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

موصوفِ محترم نے واقعہ بیان کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا کہ اگر وقت اور فرصت اجازت دے تو یہ کام انجام دوں۔ یعنی ہر شمارہ پڑھوں اور ضروری نوٹ لکھوں۔ میں نے کہا کہ اگر میری بات پر رسالے میں جوابی حاشیہ نہ لکھا جائے تو میں تیار رہوں لیکن جناب مہدوی نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ رسالہ "زنِ روز" میں اپنے چالیس نکات کی حمایت کے سلسلے میں اسی رسالے کے لیے مقالات لکھیں گے، میں بھی تیار ہوں کہ اسی مجلہ میں مقابل کے صفحے پر بحث کروں یوں دونوں نظریوں کے دلائل افکار عوام کے سامنے آجائیں گے۔

موصوفِ مکرم نے کچھ دن کی مہلت مانگی، وہ ان لوگوں سے دوبارہ رابطہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مجھے ٹیلیفون پر رسالے کی طرف سے میری پیش کش منظور ہونے سے مطلع فرمایا۔ اس واقعے کے بعد میں نے اس رسالے کو خط لکھا جس میں

"قوانینِ مدنی" [1] جہاں تک فقہِ اسلام کے مطابق ہوں گے میں ان کا دفاع کروں گا۔ مگر میرے اور جناب مہدوی کے مقالات آمنے سامنے اور برابر برابر اسی رسالہ میں شایع ہوں۔ ضمنی طور پر یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مجلہ کو میری تجویز منظور ہے تو میرا اصل خط مع علامت منظوری رسالے میں شایع کر دیں۔ رسالے نے یہ بات منظور کر لی اور متنِ خط، شمارہ ۸۷، مجریہ ۴۵/۸/۷ ش (۲۹، اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں چھاپ دیا، اور میرا پہلا مضمون شمارہ نمبر ۸۸ میں شایع ہو گیا۔

مطالعات کے دوران "حقوقِ زن" پر مہدوی صاحب کی کتاب پڑھ چکا اور ان کی منطق و نظائرے باخبر تھا۔ اس کے علاوہ مجھے بذاتہ "اسلام میں عورت کے حقوق" کے موضوع سے گہری دلچسپی تھی اور بہت سی یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ مہدوی صاحب کے مقالات اور یہ مقالات آمنے سامنے چھپنے لگے۔ ظاہر ہے میں نے بات وہیں سے شروع کی جہاں سے موصوف نے بات چھیڑی تھی۔ ان مقالات کے سلسلے نے موصوف کو سخت مشکل میں ڈال دیا۔ ابھی چھ ہفتے سے زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ ان کا ہارٹ فیل ہو گیا اور جواب نویسی سے فراغت مل گئی۔ ان چھ ہفتوں میں یہ مقالات اپنی راہ نکال چکے تھے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات نے مجھ سے اور مجلہ سے مقالات کے تسلسل کو براہ راست جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ اور میں اس خیال سے متفق ہو گیا۔ اور تینتیس قسطوں تک یہ سلسلہ جاری رہا ان مقالوں کی تحریر کا یہ پس منظر تھا۔

میرے پیشِ نظر جو مسائل تھے ان میں سے کچھ مباحث ان تینتیس مقالوں میں لکھ سکا، اس سے زیادہ حقائق لکھنا باقی ہیں۔ لیکن میں اپنی تھکن اور مصروفیات کی بنا پر انھیں لکھنے اور مرتب کرنے سے رکا رہا۔ اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کا مطالبہ اس وقت سے

---

[1] CIVIL LAW

اب تک یہی رہا کہ انھیں دوبارہ کتابی صورت میں چھاپا جائے۔ میں وقت کا منتظر تھا کہ اس کام کو مکمل طور پر "اسلام میں عورت کے حقوق" کے نام یکجا چھپواؤں، لہذا مکرر اشاعت پر تیار نہ ہوا۔ آخر کار جب یہ محسوس ہوا کہ اب مجھ سے خود مجھے یہ امید رکھنا ٹھیک نہیں تو جو کچھ موجود تھا، اسی کو کافی سمجھا۔

سلسلہ وار مقالات میں جو مسائل زیر بحث آئے ہیں ان کی سرخیاں:۔

خواستگاری (منگنی)۔ ازدواج موقت (متعہ)۔ عورت اور معاشرتی استقلال۔ اسلام اور زندگی میں جدیدیت۔ قرآن میں عورت کا درجہ۔ حیثیت و حقوق انسانی۔ خاندانی حقوق کی طبیعی بنیادیں۔ زن و مرد میں فرق۔ مہر و نفقہ۔ میراث۔ طلاق۔ تعدد ازدواج۔

جو مسائل رہ گئے اور یادداشتیں تیار ہیں:

خاندان میں مرد کا حق حکومت۔ حق پرورش اولاد۔ عدہ اور اس کا فلسفہ۔ عورت اور اجتہاد و فتویٰ۔ عورت اور سیاست۔ عورت عدالتی ضوابط۔ عورت اور سزا کے دستور۔ عورت کے اخلاق و تربیت۔ عورت کا لباس۔ جنسی اخلاق۔ غیرت۔ عفت۔ حیا وغیرہ۔ ماں کے مراتب۔ عورت اور باہر کے کام کاج نیز دوسرے معاملات۔

اگر خدا نے توفیق عنایت فرمائی تو یہ حصہ بھی جمع و تدوین کے بعد جلد دوم کی صورت میں چھپے اور شایع ہوگا۔

میں اللہ سے توفیق و ہدایت کی دعا کرتا ہوں۔

۲۸ شہریور ماہ سنہ ۱۳۵۲ ہجری شمسی
مطابق ۲۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۴ ہجری قمری
(۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۷۴ء)

مرتضیٰ مطہری

پیش گفتار :-

- ــــ عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات
- ــــ آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں۔
- ــــ تاریخ کا جبر۔
- ــــ ایرانی معاشرے میں مذہبی رجحانات۔

خلاصہ از مؤلف

مجھے خوشی ہے۔ رسالۂ "زنِ روز" نے میری خواہش قبول کی اور رسالے میں شائع شدہ، عائلی قوانین کے بارے میں چالیس نکاتی منشور پر میرے ان مقالات کو شایع کرے گا جو "قانون مدنی ایران" میں ترمیم و تنسیخ سے مربوط ہیں۔ میں نے ایک خط میں اپنی آمادگی کی جو شرط لکھی تھی، رسالے نے خط کی اشاعت کے ساتھ اسے منظور کر لیا ہے۔

میں یہ موقع غنیمت سمجھتا ہوں، اس طرح میں اسلام کے فلسفۂ معاشرہ کا ایک گوشہ جوانوں کے سامنے لاؤں اور ان کے ذہن میں یہ بات واضح کروں کہ اسلام خاندانی (عائلی) روابط کے مسائل پر کیا روشنی ڈالتا ہے۔

میں نے اپنے خط میں یاد دلایا ہے، میں "قانونِ مدنی" کا دفاع کرنا نہیں چاہتا نہ یہ کہنا ہے کہ وہ قانون جامع و کامل و مکمل اور سو فی صد قانون اسلام اور صحیح معاشرتی اقدار کے مطابق ہے۔ بلکہ مجھے بھی اس پر اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ نیز میں اپنے عوامی اکثریت کا رویہ بھی صحیح و مطابق انصاف نہ جاننے کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ان باتوں کے برخلاف خاندانی تعلقات میں بدنظمی و سراسیمگی بہر حال دیکھ رہا ہوں، اور اس سلسلے میں اساسی اصلاحات کا قائل ہوں۔

"کتاب انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی"[1] اور "پیمان مقدس یا میثاق ازدواج"[2]

---

[1] منوچہریان، بانو مہر انگیز ۔ "انتقاد بر قانون اساسی و مدنی، ایران"۔

[2] زنجانی، ابراہیم مہدوی ۔ "پیمانِ مقدس یا میثاق ازدواج" نام بتاتا ہے کہ مصنف عیسائی فکر سے متاثر ہے اور اسلام کے فلسفے کو نظر انداز کر رہا ہے۔

کہ جیسے مصنفین کی طرح ایرانی مردوں کو سو فیصدی بری نہیں سمجھتا، نہ سارے عیب قانونِ مدنی کے ذمے لگاتا ہوں، نہ میری رائے میں اصلاح کی صرف ایک تدبیر ہے، "قانونِ مدنی" کے دفعات کی مکمل تبدیلی، نہ میرے نزدیک قانون مدنی کا فقہ اسلام کے زیر ہونا کوئی عیب ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ قانونِ مدنی کے دفعات کی تبدیلی کے علاوہ اصلاح کا کوئی راستہ ہی نہیں۔ میں قوانین اسلام کے ان دفعات پر گفتگو کروں گا جس کا تعلق "حقوق زن وشوہر" سے ہے اور ان کے روابط یا اولاد یا باہر کے افراد سے تعلقات پر نظر ڈالوں گا۔ جہاں جہاں اشارہ کیا اور ان کی تبدیلی کی تجویز رکھی گئی ہے۔ میں ایک ایک نکتے کو ان مقالات میں زیر بحث لاکر ثابت کروں گا کہ یہ قوانین گہری نظر ڈالنے سے نفسیاتی، طبیعی و معاشرتی تقاضوں کے مطابق ہیں اور عورت و مرد کی حیثیت اور انسانی شرافت کا ان میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر ان پر عمل کیا جائے اور اچھی طرح نافذ کیے جائیں تو خاندانی روابط میں خوبیوں کے ضامن ہیں۔

محترم پڑھنے والوں کی اجازت سے بحث میں داخل ہونے سے پہلے چند نکتے پیش کرتا چلوں:۔

عائلی روابط کے بین الاقوامی مشکلات

خاندانی اور عائلی تعلقات کی مشکل کا حل اتنا آسان نہیں ہے کہ جیسے آج کل لڑکے لڑکیوں کو سوالنامے دیدے جاتے ہیں کہ انھیں پر کردیں، یا ایسے سیمینار منعقد کیے جائیں جو ہم روزانہ دیکھتے سنتے رہتے ہیں اور ہمیں ان کی فکری سطح معلوم ہے۔ پھر یہ کہ ان مسائل کا حل ہمارے ہی ملک کا کام نہیں ہے، دوسرے ممالک بھی حل نہیں کرسکے ہیں، نہ کسی حقیقی حل کا کسی نے دعویٰ کیا ہے[1]۔

"ویل ڈیورانٹ" "تاریخ تمدن" پر مشہور فلسفی و مصنف کہتا ہے: فرض کریں ہم ۱۹۲۰ء

---

[1] یہ تجربہ ایران ہی میں کیوں کیا جائے۔ مترجم۔

میں ہیں۔ اور معلوم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول میں سب سے بڑا واقعہ کیا ہوا تھا؟ اس وقت ہمیں اندازہ ہو گا کہ وہ واقعہ جنگ یا انقلاب روس نہیں، بلکہ بڑا واقعہ خواتین کی وضع میں تبدیلی ہے۔ ایسا جھٹکا لگانے والا واقعہ اور وہ بھی مختصر سی مدت میں تاریخ نے بہت کم دیکھا ہوگا۔ ہمارا مقدس گھر، جو ہمارے معاشرتی نظم و ترتیب کا بنیادی پتھر تھا درہم برہم ہو گیا۔ میاں بیوی کا وہ رویہ نہ رہا جو ہوس رانی اور انسانی ہیئت کی تبدیلی کے لیے رکاوٹ تھا۔ وہ پیچیدہ اخلاقی ضابطے ختم ہو گئے، جنھوں نے ہمیں جنگلی زندگی سے تمدن و آداب معاشرت سے آگاہ کیا تھا۔ اور اب کھلم کھلا ہم اس اخلاق کو چھوڑ کر ایسے عالم میں منتقل ہو چکے ہیں، جہاں زندگی کی صورت و شکل اور فکر و ذہن سب کچھ ایک شکنجہ میں ہے۔

خاندانی نظم و نسق کی بربادی، ازدواجی رشتہ کی کمزوری، جوانوں کا شادی کے بوجھ اٹھانے سے فرار۔ مادری رشتے سے نفرت۔ اولاد سے ماں باپ کے رابطے کی ناستواری خصوصاً مادری تعلق کا انقطاع، آج کی عورت کا شرافت سے دست بردار ہو کر گھٹیا قسم کی عشق بازی پر اتر آنا۔ روز افزوں طلاق کا زور، میاں بیوی میں خلوص و محبت کی نایابی اس صدی کے آخری ربع میں بڑے زور و شور کے ہنگامے اور فریادیں سنائی دے رہی ہیں۔

آزاد رہیں یا مغرب کی تقلید کریں؟

افسوس کی بات ہے۔ کچھ بے خبر لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ گھریلو زندگی کے مسائل ایسے ہی ہیں جیسے ٹیکسی بس، ٹریفک کنٹرول، واٹر پمپ، بجلی کی لائن کا کام، مدت ہوئی یورپ میں ختم و آسان ہو چکا ہے اسی طرح یہ مسائل بھی ہماری نالائقی کی وجہ سے حل نہیں ہوئے۔ ہمیں یورپ کی تقلید و پیروی کر لینا چاہیے۔

دراصل یہ خام خیالی ہے، یورپ والے ان مسائل میں زیادہ مجبور، زیادہ جکڑے ہوئے ہیں، ان کے سمجھ دار لوگ بری طرح سے چیخ رہے ہیں، تعلیم نسواں کے مسائل سے لے کر تمام معاملات میں اہل مغرب کی پریشانیاں ہم سے کہیں زیادہ ہیں۔ اور گھریلو خوش نصیبی تو انھیں نصیب ہی نہیں ہے۔

تاریخی جبر[1]

کچھ لوگ سمجھتے ہیں، گھریلو زندگی میں بدنظمی و کمزوری اور اندرون خانہ فساد و تباہی کا باعث، عورت کی آزادی ہے، اور خواتین کی آزادی نتیجہ ہے، علم و تمدن کے فروغ، اور صنعتی ترقی کا۔ یہ ایک تاریخی جبر ہے جسے برداشت کرنا پڑے گا۔ بدنظمی، اور پرانے زمانے کی خاندانی خوش حالی سے رخ موڑنے پر تیار ہونا چاہیے۔

اگر ہماری یہ سوچ ہے تو بڑی سطحی اور گھٹیا سوچ ہے۔ ٹھیک ہے صنعتی زندگی بہر حال گھریلو تعلقات پر اثر انداز ہوئی ہے اور یہ اثر پڑتا رہے گا۔ لیکن یورپ کے اندر خاندانی روابط کی ٹوٹ پھوٹ میں دو اور چیزوں کا دخل ہے:۔

ایک وہ رسم و رواج جو ظالمانہ قانون اور جاہلانہ ضابطوں کے طور پر اس صدی سے پہلے ان کے یہاں رائج تھے، اور انھیں بالادستی حاصل تھی، حد یہ ہے کہ عورت پہلی مرتبہ مالکیت کے حق سے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل میں بہرہ مند ہوئی، یورپ میں اسے مالک ماننے کا زمانہ اب آیا۔

دوسری بات اصلاح احوال کی ہے۔ جو لوگ خواتین کے مسائل میں بہتری پیدا کرنے اٹھے وہ ایسی راہ چلے جو آج کل ہمارے روشن خیالوں نے اختیار کر رکھی ہے، اور اس کا نمونہ چالیس نکاتی قانونی منشور یا مسودہ ہے۔ یہ لوگ خاتون کی

---

[1] تاریخی جبر یعنی HISTORICAL DETERMINISM

بھویں بنانے سنوارنے اٹھے اور اس کی آنکھیں پھوڑ بیٹھے۔

مشینی زندگی کی ذمہ داری سے زیادہ ذمہ داری اور اس تباہی بربادی کا بوجھ یورپ کے پرانے قوانین اور پھر جدیدیت پرست لوگوں پر ہے جنھوں نے نئے اصلاحات کا ڈھونگ رچایا۔ لہذا ہم مشرق کے رہنے والوں کو اس کی ضرورت ہی نہیں کہ ہم بھی اسی راستے پر چلیں جو راہ وہ چل چکے ہیں اور جس دلدل میں وہ پھنسے ہم بھی پھنسیں۔ ہمیں یورپی زندگی کا مطالعہ بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہیے۔ علوم صنعت، تکنیک اور معاشرتی ضابطے جو بھی قابل تعریف ہوں، انھیں غور سے دیکھیں۔ انھیں قبول کرنے، ان کی تقلید کرنے اور ان کے رسم ورواج اور قانون قاعدوں کو اپنانے میں ان ہزاروں بدنصیبوں پر بھی نظر رکھیں جن سے اہل یورپ دوچار ہیں۔ خود قانون مدنی ایران، اور گھریلو تعلقات پر یورپ کے قوانین کا انطباق بھی قابل احتیاط ہے، ہم کو اہل یورپ کی تقلید سے بہت احتیاط کرنا چاہیے۔

اساسی قانون اور ہم:

۲۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تجاویز خانہ برانداز ہیں، اور نفسیاتی، طبیعی و معاشرتی تقاضوں سے ان کا جوڑ بھی نہیں ـــ تفصیل آگے لکھیں گے ـــ خود اساسی قانون سے ان کی تطبیق کیسے ہوگی؟ دستور میں تو یہ ہے کہ ـــ جو قانون شریعت اسلامی کے خلاف ہوگا اسے "قانونیت" ہی حاصل نہ ہوگی۔ وہ اسمبلی میں پیش ہی نہیں ہو سکتا۔ اور ان تجاویز کے اکثر دفعات، واضح طور پر مخالفِ قانون اسلام ہیں۔ کیا مغرب کے باشندے اسی طرح اپنے آئین سے کھیلتے ہیں جیسے ہمارے مغرب زدہ ان کی اندھی تقلید میں ان کے پیچھے دوڑ لگانا چاہتے ہیں؟

مذہب سے قطع نظر، ہر ملک کا قانونِ اساسی اس ملک والوں کے لیے مقدس ہوتا ہے۔ ایران کا قانونِ اساسی بھی تمام ملت ایران کے لیے قابل احترام ہے۔

کیا نام نہاد سیمنار، سوالناموں کی اشاعت، اور اسمبلی کے ممبروں کی اٹھک بیٹھک سے قانون اساسی کو روندا جاسکتا ہے؟

ایرانی معاشرے کے مذہبی رجحانات

۳۔ تجویزوں کے عیوب اور ان کی قانون اساسی کے خلاف ہونے کو نظرانداز کرنے کے بعد، ہر چیز کا انکار ممکن ہے مگر یہ بات جھٹلائی نہیں جاسکتی کہ ملت ایران پر جس رجحان واحساس کا غلبہ وحکومت ہے ان میں سے سب سے بڑا جذبۂ مذہبیتِ اسلامی ہے۔ ان معدودے چند کو چھوڑیے جنھوں نے سب کچھ چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چیز کی پابندگی سے آزاد اور ہر شور وشر کے طرفدار ہیں۔ ہمارے عوام کی اکثریت مذہبی اصولوں کی پابند ہے۔

پیش بندی کے باوجود، تعلیم اور تعلیم یافتگی سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ عوام اور اسلام کو الگ الگ کردے۔ اس کے برعکس صحیح قسم کی مذہبی تبلیغ کمزور ہونے کے باوجود کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ جوان مذہب کی طرف دن بہ دن زیادہ مائل ہورہے ہیں۔ حالانکہ استعماری طاقتیں مذہب کے خلاف زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈے میں مصروف ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کے نفسیاتی ماحول میں ـ جو بہرحال بن چکا ہے۔ کیسے موزوں ہوگا کہ رائج الوقت قانون ایسا بنایا جائے جو عوام کے نزدیک شریعتِ اسلام سے مطابقت نہ رکھتا ہو؟ ایسے سوال نامے سے کیا نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے؟

فرض کریں، غصے اور اختلاف کے نتیجے میں ایک عورت عدالت سے رجوع کرکے شوہر کی رضا کے برعکس طلاق حاصل کرلیتی ہے۔ اور کسی دوسرے کے عقد میں چلی جاتی ہے۔ رائج قانون کے مطابق وہ میاں بیوی کہلاتے ہیں، مگر ان کے

مذہبی وجدان کی گہرائی کو بھی دیکھیے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو غیر سمجھنے، وہ جنسی عمل کو غیر شرعی جانتے اور اپنی اولاد کو زنازادہ اور مذہبی نقطۂ نظر سے گردن زنی فرض کرتے ہیں۔

اس صورتِ حال میں ذرا غور تو کریں کس قدر سنگین اور نفسیاتی لحاظ سے پریشان کن مشکل میں وہ گرفتار ہوں گے۔ ان کے مذہبی دوست اور رشتے دار، انھیں کس نظر سے دیکھیں گے؟ ہم وضع و قانون سازی کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی احساسات تو نہیں بدل سکتے۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اکثیریت بلکہ قریب قریب سب ہی لوگ مذھبی احساسات سے سرشار، ورنہ اس جذبے سے خالی تو بہر حال نہیں ہیں۔

اگر آپ بیرون ملک سے کسی ماہر کو بلاکر مشورہ کریں، ان سے پوچھیں کہ ہم اس قسم کے قوانین وضع کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے عوام کا مذھبی ماحول یہ ہے، اور ان کے نفسیات یہ ہیں۔ پھر دیکھیے، وہ ایسے ماحول میں آپ کے حق میں رائے دیتا ہے؟ وہ یہ نہ کہے گا کہ ایسا اقدام ہزاروں روحانی اور سماجی پریشانیاں پیدا کرنے کا سبب ہوگا؟

اس قسم کے قوانین کا، قوانین سزا سے مقابلہ غلط ہے۔ اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ قوانین سزا کی ترمیم تنسیخ سے سماج کا ایک حصہ متاثر ہوتا ہے اور اسی پر چوٹ پڑتی ہے۔ منحرف گروہ جبری ہو جاتا ہے۔ لیکن "میاں بیوی کے رشتے" اور اولاد کی نجی زندگی سے متعلق قوانین کی نوعیت یہ نہیں۔ اس سے فرد اور افراد کی نجی زندگی کا تعلق ہے۔ یہ بات براہِ راست آدمی کے شخصی مذہبی جذبے سے جنگ ہے۔ اس طرح کے قانون یا اس لیے بے اثر ہو جائیں گے کہ مذہب و مذہبی رجحانات کا غلبہ ہے۔ یا خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے ان قوانین سے بدامنی پیدا ہوگی۔ پھر یا تو یہ قانون عملاً بے کار ہو جائیں گے یا اندرونی و جذباتی و نفسیاتی جانکاہی کے بعد مذہبی طاقت کو کمزور بنا دیں گے۔

آغازِ کتاب

پہلا حصّہ :

خواستگاری

- کیا مرد کی طرف سے خواستگاری، عورت کی توہین ہے ؟
- مرد کی فطرت، طلب و نیاز ۔ عورت کی فطرت جلوہ و ناز ہے ۔
- مرد خریدار وصال ہے ۔ عورت کا خریدار نہیں ہے ۔
- حیثیت و احترام خواتین کے تحفظ کا دانشمندانہ اور نفیس طریقہ منگنی ہے ۔
- قانون مدنی کے چالیس نکات کے مصنّف کی غلط فہمی ۔

۔ خلاصہ از مؤلف ۔

خواستگاری

ہم اپنی گفتگو کا آغاز "چالیس" نکات میں اسی نقطے سے کر رہے ہیں جو اس پیش نہاد میں حرفِ آغاز ہے، "قانونِ مدنی" کی ترتیب کے مطابق پہلی بات ہے منگنی اور نامزدگی۔
باوجودیکہ قانونِ مدنی میں خواستگاری (منگنی) اور نامزدگی کا تذکرہ ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق براہ راست اسلام سے نہیں ہے، یعنی "نص" اور صریحی حکم اسلام اس سے مربوط نہیں تک نہیں پہنچا ہے اور قانونِ مدنی" نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اسلام کے قواعد کلیہ سے ایک استنباط (نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش) ہے۔ اس بنا پر ہم "قانونِ مدنی" کے دفاع کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ہم تجویز پیش کرنے والے کے جزئیاتِ نظر سے بحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ حالانکہ تجویز کنندہ اس بارے میں بڑی بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ موصوف چند سادہ دفعات کے صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر رہے۔
ہاں، دو مقصد ایسے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کر سکتے:

کیا مرد کی طرف سے خواستگاری عورت کی توہین ہے؟

۱۔ تجاویز پیش کرنے والے کا بیان ہے:
"ہمارے قانون ساز نے موجودہ دفعات (خواستگاری و نامزدگی) میں بھی اپنے رجعت (غیر انسانی نکتے کو نہیں بھولا کہ مرد اصل ہے اور عورت اس کی ضمن، اسی خیال کے زیر اثر دفعہ نمبر ۱۰۳۴ کو کتابِ نکاح وطلاق میں "پہلی دفعہ قرار دیا اور یوں لکھا ہے۔" دفعہ ۱۰۳۴ موانع نکاح سے خالی عورت کی خواستگاری ہو سکتی ہے۔" آپ نے ملاحظہ فرمایا بموجب

دفعہ مذکور، باوجودیکہ کوئی پابندی بیان نہیں کی گئی ہے۔ لیکن "ازدواج" کے معنے ہوتے ہیں، مرد کا "عورت لینا" مرد خریدار و مشتری تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے مقابل عورت کو ایک "سودا" ظاہر کیا ہے۔ "معاشرتی قوانین میں ایسی تعبیر انتہائی ناگوار اور برے تاثرات پیدا کرتی ہے۔ قانون ازدواج میں، زن و مرد کے تعلقات پر خاص طور سے برا اثر ڈالتی ہے۔ اس میں مرد کو "آقائی" اور مالکیت، عورت کو مملوک یا کنیزہ کا درجہ دیا گیا ہے۔"

اس گہری نفسیاتی نظر کے بعد! تجاویز کے مرتّبِ تے "خواستگاری کے ذیل میں جو دفعات لکھے ہیں۔ ان میں "خواستگاری" کو خواتین اور مردوں کے لیے یکساں قرار دیا ہے۔ تاکہ "عورت لینا" جو یک طرفہ بات ہے اسے ختم کردیں۔ "زن گرفتن" کے مقابلے میں "مرد گرفتن" بھی ہونا چاہیے۔ یا پھر نہ "عورت لینا" کہا جائے نہ "مرد لینا"۔ اچھا، اگر "عورت لینا" کہیں، یا لڑکی کا رشتہ مانگنا مرد کا فریضہ قرار دیں تو گویا عورت کی حیثیت گرادی، اور اسے قابل خرید سودا بنا دیا۔

مرد کی فطرت، طلب و نیاز
عورت کی فطرت، جلوہ و ناز

اتفاقاً بڑی غلط فہمیوں میں سے ایک غلط فہمی یہ بھی ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ زیر نظر تجاویز میں "مہر و نفقہ" کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مہر و نفقہ پر ہم تفصیل سے بحث کریں گے۔

عہد قدیم سے، مرد، عورت کے گھر جاتے اور لڑکی کا رشتہ مانگتے ہیں۔ یہ رسم، حیثیت و احترام عورت کا بہت بڑا سبب ہے۔ فطرت نے مرد کو طلب و عشق و تقاضا کا مظہر بنایا اور عورت کو مطلوب و مدعا، اور معشوق۔ عورت کو فطرت نے گل، مرد کو بلبل، عورت کو شمع، مرد کو پروانہ پیدا کیا۔ یہ حکیمانہ تدبیر اور خلقت کا شاہکار ہے۔ کہ مرد کی طبیعت (غریزے) میں طلب و نیاز، اور عورت کے غریزے میں جلوہ و ناز

قرار دیا۔ عورت کی جسمانی کمزوری، مرد کی قوتِ جسمانی کے اس پہلو سے ہموار کردی۔

عورت کا مرد کے پیچھے دوڑنا اس کے وقار و شخصیت کے خلاف ہے۔ مرد کسی عورت کے بارے میں منگنی کو جائے اور لڑکی والے رشتہ ٹھکرا دیں تو مرد برداشت کرسکتا ہے وہ دوسرے گھر اور وہاں سے تیسرے گھر جاکر درخواست کرسکتا ہے تاآں کہ اس کی درخواست قبول ہو۔ اور کوئی خاتون اس کی رفیق زندگی بننے پر تیار ہو۔ عورت جو محبوب و معشوق بن کر اپنی پوجا کراتی، اور مرد کے دل میں جگہ حاصل کرکے مرد کے پورے وجود پر حکومت کرنا چاہتی ہے اس عورت کی فطرت میں یہ نہیں ہے کہ ایک مرد سے شادی کی درخواست کرے اور اتفاقاً نفی میں جواب سن کر دوسرے مرد کے سراغ میں نکلے۔

مشہور امریکی فلسفی "ولیم جیمز" کے خیال میں: حیا اور حسین خودداری عورت کی فطرت میں نہیں ہے۔ حوا کی بیٹیاں پوری تاریخ سے یہ سیکھتی رہی ہیں کہ مردوں کے پیچھے نہ دوڑنے ہی میں ان کی عزت و احترام ہے، وہ اپنے تئیں نہ گرائیں اور مردوں کی دسترس سے دور رہیں۔ خواتین نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا اور اپنی بیٹیوں کو یاد کرایا۔

جنس انسان ہی کی خصوصیت نہیں، دوسرے جانوروں کا رویہ بھی یہی ہے۔ نر کی جنس پابند ہے کہ وہ جنسِ مادہ کے لیے نیاز و دیوانگی کا اظہار کرے۔ جنسِ مادہ کو فطرت نے پابند پیدا کیا ہے وہ اپنے حسن، دل کشی، لطف اور خودداری اور پرلطف بے نیازی کا اظہار کرے، اور سخت دل ہم جنس کو جتنا زیادہ ہوسکے، اپنے قابو میں لے تاکہ وہ قلبی جذبات اور اپنے ارادہ و اختیار سے خدمت گذاری کے لیے تیار ہو۔

مرد خریدارِ وصال ہے عورت کا خریدار نہیں

تعجب ہے۔ فرماتے ہیں:۔ "قانون مدنی نے ایسا لہجہ کیوں اختیار کیا جس سے یہ معلوم ہو کہ مرد، عورت کا خریدار ہے؟"۔ پہلے تو اس کا تعلق قانون مدنی سے ہے نہیں۔ یہ تو قانونِ تخلیق

سے متعلق بات ہے۔ دوسرے، ہر خریداری، چیزوں کی مالکیت و ملکیت ہی کے لیے ہوتی ہے ؟! ہنر دوست، ہنر ور کا خریدار ہوتا ہے۔ کیا اس کی تعبیر "ملکیت" سے ہو سکتی ہے ؟ اس عمل کا نام مالکیت رکھا جائے ؟ اور عالم و صاحب فن کی حیثیت کے خلاف قرار دیں ؟ مرد، وصالِ زن کا خریدار ہے۔ اس کی ذات کا گاہک نہیں ہے۔ کیا سچ مچ آپ حافظِ شیریں سخن، حافظ کو، اہانتِ جنسِ خواتین کا مجرم سمجھتے ہیں ؟ وہ کہتا ہے :

شیراز معدنِ لب لعل است و کانِ حسن

من جوہریِ مفلس ازآں رو مشوشم

شہریست پر کرشمہ و خوبان زشش جہت

چیزیم نیست ورنہ "خریدار" ہر ششم

شیراز خزانۂ لبِ لعلیں اور مرکزِ حسن ہے، وہ خود شیراز کا جوہری ہے، مگر مفلسی کی بنا پر تشویش ہے کہ شہر کی شش جہت میں حسین ہیں اور ناز و انداز۔ ہائے، اس کے پاس کچھ نہیں ورنہ وہ چھ کی چھ سمتیں خرید لیتا۔ حافظ کو حسرت ہے، اس کے ہاتھ خالی ہیں ورنہ وہ سب کچھ حسینوں پر قربان کر دیتا، ان کی نگاہ التفات حاصل کر لیتا۔ یہ مرتبۂ نسوانیت کی توہین ہے ؟ یا زندہ و جذبات دل میں عورت کے بلندیٔ مرتبہ کا اظہار ؟ کہ مردانگی و دلیری کے باوجود بارگاہ حسن و جمالِ خاتون میں عاجزی و انکساری کا اظہار کر رہا ہے۔ خود نیاز مند اور اسے بے نیاز بتا رہا ہے۔

عورت کی ہنر مندی کی انتہا یہ ہے کہ وہ جہاں اور جس جگہ بھی ہے، مرد کو اپنے آستانے پر بلائے۔

غور کیا آپ نے، حقوق خواتین کے نام سے عورت کے کتنے بڑے اعزاز و شرف اور اس کی حیثیت کو داغدار کیا جاتا ہے ؟

یہی بات میں نے کہی تھی کہ محترم حضرت بے چاری عورت کی بھوؤں کو

آراستہ کرنے کے بہانے اندھا بنانا چاہتے ہیں۔

حیثیت و احترام خواتین کے تحفّظ کا دانشمندانہ و نفیس طریقہ منگنی ہے۔

میں نے عرض کیا، قانونِ تخلیق میں، مرد کو مظہر نیاز و طلب قرار دیا گیا ہے عورت مظہر مطلوبیت و جواب بنائی گئی ہے۔ یہی نکتہ، عورت کی شخصیت و احترام کی ضمانت مہیا کرتا ہے جو مرد کی قوت جسمانی کے مقابلے میں اس کی کمزور تخلیق کو متوازن کرتا ہے۔ اسی سے مشترک زندگی میں توازن و برابری پیدا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ ایک قسم کا طبیعی امتیاز ہے جو عورت کو عطا ہوا ہے اور ایک قسم کا تقاضائے ضمیر ہے جو مرد کے حوالے کیا گیا ہے۔

جب انسان قانون بنانا چاہیں۔ دوسری لفظوں میں جب قانونی انتظامات کی ضرورت ہو تو عورت کے اس امتیاز کو عورت کے لیے اور مرد کی اس ذمہ داری کو مرد کے لیے ملحوظ رکھنا چاہیے۔ زن و مرد کی یکسانیت پر مبنی قوانین میں، ذمہ داری و ادب کے زاویے خواستگاری کا دستور۔ عورت کے نفع اور احترام کو نقصان نہ پہنچائے اور دونوں میں برابری کے معنی یہ ہیں کہ دونوں میں توازن رہے، چاہے دیکھنے میں مرد کی رعایت ہو لیکن درحقیقت طرفین کی بھلائی پائی جائے۔

اس بنیاد پر "چالیس نکات" پیش کرنے والے نے جو دفعہ، عورت کو خواستگاری کا پابند کرتی ہے، بے وزن ہے اس کی کوئی اہمیت نہیں اس سے انسانی معاشرے کو نقصان پہنچے گا۔

چالیس قانونی نکات مرتب کرنے والے کو قانون مدنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی!

اس پیراگراف میں جس دوسرے نکتے پر متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ جناب مہدی

کی ایک غلط فہمی ہے۔ موصوف نے، زن روز کے شمارہ نمبر ۸۶، صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے:

"دفعہ نمبر ۱۰۳۷ کے بموجب جن دو کے درمیان رشتہ طے ہو جائے۔ اس کے بعد معقول سبب کے بغیر اسے توڑ دیا جائے تو فریق مقابل یا اس کے والدین یا تیسرے افراد نے رشتے کی بنیاد پر جو تحفے اور سوغاتیں دی تھیں، واپس کرنا ہوں گی۔ اور اگر اصل تحفے یا ہدیے اتفاقاً ضایع ہو گئے ہوں تو ان کی قیمت ادا کریں۔ مذکورہ دفعہ کی توضیح کے بعد۔ ہمارے قانون بنانے والے کی نظر میں ـــ نامزدگی بھی وعدۂ نکاح کی طرح قانونی طور پر مؤثر نہیں، نہ اسے اجرا کی ضمانت حاصل ہے۔ اور طرفین میں اس سے کوئی معاہدے کی تشکیل نہیں دی جا سکتی۔ صرف اتنا اثر پڑتا ہے۔ انکار کرنے والا فریق۔ بقول قانون ساز ـــ "معقول وجہ" کے بغیر رشتے کو توڑنے پر اصل یا قیمت اس فریق کو واپس کرے جس نے بہ امید نکاح وہ چیزیں دی تھیں۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت تحفوں کی لین دین میں نکاح ہونے کا خیال پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ ان غیر معمولی اخراجات کا سبب تو براہ راست "نامزدگی" کی تقریب ہی ہوتی ہے ...."

ملاحظہ فرمایا آپ نے ـــ جناب مہدوی کا اس "دفعہ" پر اعتراض یہ ہے کہ دفعہ "نامزدگی" پر کوئی قانونی اثر نہیں مرتب کرتی، اور اس کے اجرا کی ضمانت نہیں دیتی۔ اس کا اثر صرف اتنا ہے کہ رشتہ توڑنے والا اصل تحفے یا ان کی قیمت دو کر فریق کو واپس کرے۔ حالانکہ نامزدگی کے سلسلے میں اس شخص کے نقصانات اس کے علاوہ ہیں، مثلاً جشن اور مہمان داری، نام زد کو لے کر پھرنا اور سلسلے میں بھاری اخراجات۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس دفعہ پر ایک اور اعتراض بھی ہو سکتا ہے۔ قانون کہتا ہے کہ "رشتہ توڑنے والا" اگر معقول وجہ کے بغیر رشتہ توڑ دے تو حاصل کردہ اصل تحفے یا ان کی قیمت دو کر فریق کو دے"۔

اعتراض یہ ہے کہ قاعدے کے مطابق اگر رشتہ توڑنے والا معقول وجہ کی بنا پر بھی رشتہ توڑے جب بھی اسے کم از کم فریقِ ثانی کے مطالبے پر تحفے تو واپس کرنا ہی چاہیے۔

حقیقت میں دونوں اعتراض ٹھیک نہیں ہیں۔ قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۳۶ ہے:

"دو نامزد افراد میں رشتے کی منظوری کے بعد کوئی فرد "علتِ موجہ" معقول سبب کے بغیر رشتہ توڑ دے حالانکہ فریقِ مقابل یا اس کے والدین یا دوسرے افرادِ نکاح ہونے کی خیال میں (مغرور) ہوں انھوں نے اخراجات بھی کیے تھے۔ تو جس فریق نے رشتہ توڑا ہے وہ نقصان کی تلافی کرے گا مگر یہ تلافی عام دستور کے اخراجات کی بنیاد پر ہوگی۔"

اس دفعہ نے اسی بات کی پیش بندی کر رکھی ہے جس کے بارے میں جناب مہدوی کے بقول "قانونی پیش بندی نہیں کی گئی"۔ دفعہ میں "بدونِ علتِ موجہ۔ کی شرط ہے۔ معقول وجہ کے بغیر۔ اس دفعہ کی رو سے رشتہ توڑنے والا، فریقِ ثانی کے اخراجات بضمنِ نامزدگی ہی کا دین دار نہیں بلکہ والدین یا دوسرے افراد کے اخراجات کا بھی دین دار قرار پاتا ہے۔

اس دفعہ میں "مغرور شدہ" (فریب میں مبتلا) کا جملہ قانونی کلیۂ "غرور" ۔ فریب ۔ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قانونِ مدنی میں "تسبیب" ۔ ایک ہے فریب دینا، نقصان پہنچانا۔ دوسرا ہے فریب یا نقصان کے اسباب فراہم کرنا۔ یعنی اسباب نقصان مہیا کرنے پر بھی جبری ضمانت مہیا کی گئی ہے۔ دفعہ نمبر ۳۳۲، تسبیب سے متعلق ہے، یہ دفعہ بھی منحرف فریق کے خلاف قابلِ استفادہ ہے۔

بنا بریں قانونِ مدنی یہی نہیں کہ "خسارت ہائے نامزدگی (نامزدگی کے ضمن میں ہونے والے نقصانات) کے بارے میں خاموش ہے بلکہ اس نے اس بات کو دو دفعات

میں سمیٹا ہے۔

"خسارت ہائے نامزدی" کو منشور لکھنے والے نے "خود نامزدی" سمجھ لیا۔؟

قانونِ مدنی کی دفعہ ۱۰۳۷ ہے:

"ہر ایک نامزد کو حق ہے کہ منظور شدہ رشتے کو توڑ دینے والے (لڑکے یا لڑکی) سے منظوری رشتہ کے موقع پر اپنی طرف سے یا اپنے والدین کی طرف سے دیے جانے والے تحفے واپس مانگ لے اگر اصل تحفے موجود نہ ہوں تو مطالبہ کرنے والا قیمت کا حق دار ہوگا۔ مگر بطور رسم ایسے تحفے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ چیزیں کسی کوتاہی کے بغیر فریق ثانی سے تلف ہو گئی ہوں"

یہ دفعہ ان چیزوں سے متعلق ہے جو فریقین ایک دوسرے کو دیتے ہیں آپ نے دیکھا کہ اس دفعہ میں کسی قسم کی قید نہیں ہے کہ ایک فریق بغیر "علت موجبہ" (معقول سبب) کے رشتے کو توڑ دے۔ "بدون علت موجبہ" ایک بے جا استنباط ہے جس کے مرتکب مہدوی صاحب ہوئے۔

تعجب ہے، جو لوگ قانونی سادہ فقرات (دفعات) سمجھنے سے معذور ہیں۔ ان میں یہ داعیہ کیسے پیدا ہو گیا کہ وہ ان آسمانی قوانین کو بدل دیں جن میں ہزاروں باریکیاں اور گہرائیاں کام میں لائی گئی ہیں۔ (یہ صاحب وہ ہیں جن کی زندگی انھیں قانونی نکات کو حل کرنے میں گذری ان کا کام ہی یہی رہا۔ اسی فنی مہارت کے نام سے موصوف نے ملک کا ایک بجٹ صاف کیا ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح رہے کہ جناب مہدوی پانچ سال پہلے تک کہ جب "پیمان مقدس یا میثاق ازدواج" کی تالیف میں مصروف تھے۔ اس جملے (بدون علت موجہی) کو "بدون علت و موجبی" پڑھتے رہے۔ چنانچہ مذکورہ کتاب میں ایک طویل فصل اسی داد و فریاد پر لکھ ڈالی ــ ہائے، کیا دنیا میں کوئی کام بے علت و سبب کے بھی ہوا ہے ــ لیکن بہت بعد یہ خیال آیا کہ برسوں یہ جملہ غلط پڑھا کیے۔ اصل عبارت " بدون علت موجہی تھی۔

خواستگاری کے ضمن جو مزید اعتراضات "منشور" نگار نے کیے ہیں ہم سرِ دست ان سے قطع نظر کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ:

نکاحِ مؤقت

(متعہ)

- متعہ اور آج کی زندگی۔
- آیا نکاح موقت رہبانیتِ عملی ہے؟
- کونسا طریقہ؟ موقت رہبانیت، جنسی کمیونزم یا نکاح موقت؟
- آج کے جوان کم عمری میں شادی نہیں کر سکتے، لہذا بلوغ اور جنسی ہیجان میں کیا کریں؟
- اگر متعہ کا منصوبہ یورپ سے آیا ہوتا تو جدت پسند اسے سب سے زیادہ ترقی یافتہ قانون سمجھتے۔
- آج کی زندگی میں کل سے زیادہ متعہ ضروری ہو چکا ہے۔
- آزمائشی شادی۔
- متعہ کے بارے میں رسل کا نظریہ۔
- خواتین کی راہ میں بیسویں صدی کے مرد کے جال
- بیسویں صدی کی عورت کی شرافت یورپ و امریکہ کی سرمایہ داری کی خدمت میں۔

- — کونسی عورت، کرایے کی عورت، یا اِس کی اُس کی ؟
- — قرآن، عورت کا سچا حامی اور حق گو ہے۔
- — متعہ پر اعتراض اور جواب۔
- — متعہ اور مسئلہ آبادی حرم سرا۔
- — بیسویں صدی کے مردوں نے خواتین سے لذت اندوزی کے مقابلے، ہارون رشید و فضل برمکی سے سیکھے ہیں۔
- — بیسویں صدی کے مرد نے صرف بے بہا دولت لٹائی ہے۔
- — "لذت پرست" مرد، اسلام میں ملعون سمجھا گیا ہے۔

خلاصہ از مؤلف مرحوم

نکاحِ مؤقت

(۱)

بہت سے افراد کے برعکس، اسلامی مسائل میں لوگوں کے شکوک و شبہات ایجاد کرنے سے کبھی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ باوجودیکہ میرا تمام تر رابطہ واعتقاد صرف اسلام سے ہے۔ میں سچے دل سے خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے، اور زندگی میں تجربہ و مشاہدہ کیا ہے کہ یہ آسمانی مقدس آئین، وہ ہے جس کے محاذ پر بہ شدت حملہ آور اسے مضبوط تر بنا دیتے ہیں۔ جس رخ پر حملہ کیا جائے۔ اس رخ پر زیادہ طاقت، سربلندی و جلوہ نمائی اور زیادہ آب و تاب آجاتی ہے۔

حقیقت کی خوبی یہی ہے کہ شک اور تردد اس سے روشن کرنے اور چمکانے میں زیادہ مدد دیتا ہے۔ شک، یقین کی تمہید اور تردید، تحقیق کی سیڑھی ہے۔ "زندہ بیدار"[1] نامی رسالے میں، غزالی کی "میزان العمل" سے نقل ہے کہ:

"ہماری گفتگو کا یہی فائدہ بہت ہے کہ تمہیں تمہارے موروثی اور پرانے عقائد کے بارے میں مبتلائے شک کر دیا، کیونکہ شک تحقیق کی اساس ہے۔ جو شک نہیں کرتا وہ صحیح طور پر توجہ نہیں دے رہا ہے، جو شخص باریک بین نہیں ہے وہ اچھی طرح دیکھتا نہیں۔ ایسا آدمی اندھے پن اور سرگردانی میں گذارے گا۔"

آزادی دیجیے، لوگ بولیں، لکھیں، سیمینار کریں، اعتراض کریں، نتیجہ میں ان کی خواہش کے برعکس اسلام کے منوّر ہونے کا وسیلہ بنیں۔

اسلام کے تابناک قوانین میں سے، بنگاہ فقہ جعفری میں شادی دو طرح کی ہے۔

---

[1] ۔ زندہ بیدار ۔ حی بن یقظان کی کتاب کا ترجمہ از بدیع الزمان فروزانفر۔

دائمی اور موقّت -

مذہب جعفری ہی ہمارے ملک کا رسمی مذہب ہے ۔ نکاحِ موقّت و نکاح دائمی چند باتوں میں یکساں اور چند معاملات میں علیحدہ ہیں ۔

سب سے پہلی جگہ جہاں یہ دونوں الگ ہوتے ہیں وہ زن و مرد کا معین وقت کے لیے نکاح کرنا، جب مدتِ معین ختم ہو جائے اور دونوں متفق ہوں تو مدت بڑھا سکتے ہیں اور اگر دونوں مائل نہ ہوں تو الگ ہو جاتے ہیں ۔

دوسری بات شرائط کی ہے، متعہ میں دونوں کو زیادہ آزادی ہے، جو شرائط و معاہدہ چاہیں کرلیں، مثلاً نکاحِ دائمی میں مرد بہرحال روزانہ کے اخراجات، پوشاک، مکان کا ذمہ دار ہے، اس کے علاوہ بیوی کے دوسرے ضروریات، جیسے دوا، علاج، معالج وغیرہ کا انتظام بھی شوہر کرے گا۔ لیکن نکاحِ موقّت ۔ متعہ ۔ ان ذمہ داریوں اور آزادیوں کا تعلق معاہدہ پر ہے۔ ممکن ہے مرد نہ چاہے یا اخراجات ادا کرنے کے قابل نہ ہو۔ یا عورت اپنے شوہر کی دولت سے فائدہ نہ اٹھانا چاہے ۔

نکاحِ دائمی میں، بیوی بہرحال شوہر کو سردارِ خاندان ماننے کی پابند ہے ۔ اور گھریلو بھلائی کی حد تک مرد کے احکام کی تعمیل کرے گی ۔ لیکن نکاحِ منقطع میں باہمی معاہدے کے مطابق عمل ہوگا ۔

نکاحِ دائمی میں میاں بیوی بہرحال ایک دوسرے کا ترکہ پائیں گے ۔ نکاحِ منقطع میں یہ نہیں ہے ۔

دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ نکاحِ منقطع، حدود اور پابندیوں سے آزاد ہے، ہر قسم کی قید طرفین کے معاہدے سے وابستہ ہے، فریقین جس قرارداد پر راضی ہوں گے وہی عمل میں آئے گی حتیٰ کہ زمانے کی پابندی میں دونوں کو آزادی ہے اور مدت نکاح بھی طرفین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے ۔

نکاحِ دائمی میں، میاں بیوی ایک دوسرے کی رضامندی کے بغیر مانعِ حمل کوئی کام نہیں کر سکتے، لیکن نکاحِ منقطع میں ایک دوسری کی رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی زن و شوہر کو آزادی دی گئی ہے۔

اس شادی کے نتیجے۔ یعنی اولاد۔ اور نکاحِ دائمی کے نتیجے میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مہر، نکاحِ دائمی میں بھی ضروری ہے اور نکاحِ منقطع میں بھی لازم ہے۔ فرق یہ ہے کہ نکاحِ منقطع میں اگر مہر کا ذکر نہ ہو تو عقد باطل ہو گا۔ اور نکاحِ دائم میں مہر کا تذکرہ نہ کرنے سے نکاح باطل نہیں ہوتا مگر "مہرِ مثل" معین ہو گا (مہرِ مثل سے مراد وہ مہر ہے جو بیوی کی قرابت دار خواتین کا مہر تھا وہی مہر اس خاتون کا قرار پائے گا)

جس طرح عقدِ دائم میں، شوہر پر بیوی کی ماں اور بیٹی اور بیوی پر شوہر کے باپ اور بیٹے حرام ہیں، اسی طرح عقدِ منقطع میں بھی یہی صورت ہے۔ جیسے دائمی زوجہ سے دوسرے فرد پر خواستگاری حرام ہے اسی طرح متاعی بیوی سے رشتہ کی درخواست ہر شخص پر حرام ہے۔ یا دائمی زوجہ سے زنا کرنے والے پر وہ عورت ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ یہی حکم متاعی زوجہ کے لیے ہے۔ طلاق کے بعد دائمی نکاح والی عورت عدہ رکھنے کی پابند ہے۔ متاعی بیوی بھی مدتِ نکاح معاف یا ختم ہونے کے بعد عدے کی پابند ہے۔ البتہ عدے کی مدت میں اختلاف ہے۔ نکاحِ دائمی والی بیوی تین ماہواری تک اور متاعی بیوی دو ماہواریاں یا پینتالیس دن کا عدہ رکھے گی۔ نکاحِ دائمی میں دو بہنوں کو بیک وقت بیوی نہیں بنایا جا سکتا، متعہ میں بھی یہی حکم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو "ازدواجِ مؤقت" یا "نکاحِ منقطع" کے نام سے شیعہ فقہ میں مذکور اور ایران کے قانونِ مدنی میں بعینہٖ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہم اس قانون کے ان خصوصیات کے ساتھ حامی ہیں۔ رہا یہ کہ ہمارے افراد نے اس قانون سے ناجائز فائدے اٹھائے اور اٹھاتے ہیں۔ اس کا قانون سے کیا تعلق ہے؟ اس قانون کے بدلنے سے ناجائز فائدے نہ اٹھائے جانے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ صرف شکل بدل جائے گی۔ بلکہ قانون کے مسترد کرنے سے سینکڑوں فساد اور پیدا ہوں گے۔

اگر عوام کی اصلاح اور انکو آگاہ نہ کرسکیں تو اپنی ناتوانی اور عوام کی اصلاح نہ کرنے کی لیاقت کو ہمیشہ قانون کی خرابی پر ڈالنا غرض انسان کو بری الذمہ قرار دینا اور قوانین کو ذمہ دار ٹھہرانا مناسب ہے۔

اب یہ دیکھتے ہیں کہ نکاحِ دائمی کے ہوتے ہوئے "ازدواج موقت" کے نام قانون بنانے کی ضرورت کیا ہے۔ آیا بقولِ مضمون نگارانِ رسالہ "زن روز" متعہ خواتین کی نسوانی شخصیت اور اعلامیہ حقوق بشر کے خلاف ہے؟ کیا متعہ کی ضرورت تھی بھی تو پرانے زمانے میں تھی، آج کی زندگی اور آج کے جدید تقاضے اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں؟

ہم اس موضوع کو دو عنوانوں سے زیر بحث لائیں گے:

الف ـ متعہ اور آج کی زندگی۔

ب ـ متعہ کے نقصانات و عیوب۔

متعہ اور آج کی زندگی

ہم مذکورۂ بالا گفتگو سے یہ سمجھ چکے ہیں کہ نکاحِ دائمی میاں بیوی کے لیے بہت سی ذمہ داریاں اور فرائض پیدا کرتا ہے۔ اسی دلیل کی بنیاد پر لڑکی یا لڑکا طبعی بلوغ کو پہنچتے ہی جنسی جذبات سے مغلوب ہونے کے باوجود نکاحِ دائمی پر تیار نہیں ہوتا۔ عہد جدید کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس نے طبیعی بلوغ اور معاشرتی بلوغ (خاندان کی تشکیل کے امکان) میں فاصلے بڑھا دیے ہیں۔ اگر گذشتہ سیدھے سادھے زمانے میں ایک کم سن لڑکا اوائل بلوغیت میں کسی کام میں لگا دیا جاتا تھا تو زندگی بھر اسے انجام دیتا تھا۔

مگر آج کی دنیا میں یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک کامیاب لڑکا، اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے امتحانات پاس کرتا ہے، کبھی اسے اعلیٰ ترین سند کے لیے کچھ مدت یونیورسٹی میں گذارنا پڑتی ہے پچیس سال میں دانشگاہ سے فراغت ہوئی، یقینی طور سے تین چار سال اس فکر میں گذارتا ہے کہ تھوڑی بہت آمدنی اور کچھ سر و سامان ہو تو نکاحِ دائمی کی سوچے

یہی حال اس لڑکی کا ہے جو تعلیمی دور مکمل کرنا چاہتی ہو۔

آج کا جوان اور بلوغ وبحرانِ جنسی کا عہد:

جنسی ہیجان میں آئے۔ آج کے کسی اٹھارہ سالہ لڑکے سے شادی کی بات کرکے دیکھیے۔ وہ آپ پر ہنسے گا، اور یہی ردِ عمل سولہ برس کی لڑکی دکھائے گی۔ عملاً ممکن نہیں، اس طبقے کے لوگ اس سن و سال میں نکاحِ دائمی کرکے اس بوجھ تلے نہیں آسکتے جس میں ایک دوسرے کی ذمہ داریاں اٹھانا پڑتی ہیں اور کچھ دن بعد ہونے والی اولاد کا مسئلہ اس پر مستزاد بن جاتا ہے۔

وقتی رہبانیت، آزمائشی شادی یا نکاحِ موقت (متعہ)، کون بہتر ہے:

ہم آپ سے پوچھتے ہیں، اس صورتِ حال میں اس مزاج اور اس خمیر کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیے؟ آج کی دنیا میں، زندگی کے حالات ہمیں سولہ اور اٹھارہ برس کی عمر میں شادی کی اجازت نہیں دیتے، کیا فطرت بلوغ کا دور آگے بڑھا سکتی ہے؟ اور جب تک تعلیمی زمانہ مکمل نہ ہو جنسی جذبات ہم سے دست بردار ہو سکتے ہیں؟

"وقتی رہبانیت" — ترکِ دنیا، ترکِ لذات — کا چلہ کھینچنے کے لیے آج کے جوان تیار ہیں؟ کچھ عرصہ ریاضت کریں اور شادی کے امکانات حاصل ہونے تک ذرا سختی جھیل لیں؟ فرض کرلیا کہ "وقتی" رہبانیت کے لیے کچھ جوان تیار ہو گئے۔ کیا ان کا خمیر بھی راضی ہے؟ کیا ان میں خطرناک نفسیاتی بیماریاں پیدا نہ ہوں گی؟ یہ بیماریاں ان کی جنسی خواہشات کے اثر سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا سراغ آج کے ماہرینِ نفسیات لگا چکے اور ان کی حقیقت بتا چکے ہیں۔ کیا اس پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے؟

اب دو راستے ہیں، جوانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور ان کے معاملے کو سامنے رکھیں ہی نہیں۔ ایک لڑکے کو چھوٹ دے دیں کہ سو لڑکیوں سے کام نکالے۔ ایک

لڑکی کو ڈھیل دے دیں وہ جائے اور دس لڑکوں سے ناجائز طریقے پر تعلقات قائم کرے اور کئی مرتبہ اسقاط کرالے۔ یعنی عملی طور پر جنسی کمیونزم قبول کرلیں ہم لڑکے لڑکی کو "برابری" دے ہی چکے ہیں، "منشور حقوق انسانی" کی روح سے خوشی ہو چکی ہے۔ آخر بہت سے کوتاہ خیال افراد کی نظر میں "اعلامیۂ حقوق بشر" کی روح یہ ہے کہ اگر مرد و زن جہنم کے کسی درجے میں داخل ہونا چاہیں تو دوش بدوش اور ہاتھ میں ہاتھ ملا کر، خلاصہ یہ کہ "برابر برابر" گریں۔

سوچیے، ایسے لڑکے لڑکیاں جنہیں طالب علمی میں اتنے زیادہ تعلقات حاصل ہو چکے ہوں مستقل شادی کے بعد مرد زندگی اور خاتون خانہ بننے کے قابل رہیں گے؟

کیا متعہ بہتر ہے؟

دوسرا راستہ ہے، ازدواجِ موقّت و آزاد۔ متعہ پہلے مرحلے میں عورت کو پابند کرتا ہے کہ بیک وقت دو مردوں کی بیوی نہ بنے۔ صاف سی بات ہے، جب عورت ایک مرد کی پابند ہو گی تو مرد کو بھی خواہ مخواہ ایک عورت کا پابند رہنا پڑے گا۔ جب ایک عورت ایک معین مرد کی پابند ہوتی ہو تو مرد بھی مجبوراً اسی ایک عورت کا ہو رہے گا۔ سوائے اس کے کہ عورتیں (لڑکیاں) فراواں ہوں اور ان کی طرف سے لڑکوں پر دباؤ زیادہ ہو)۔

یہی ایک راستہ ہے جس میں وقتی رہبانیت اور اس کے نقصان دہ اثرات سے بچاؤ ہوتا ہے اور جنسی کمیونزم میں بھی نہیں پھنسنا پڑتا۔

آزمائشی شادی: زمانہ طالب علمی ہی نہیں، دوسرے حالات میں بھی ضرورت پیش آسکتی ہے، اصولاً ممکن بھی ہے کہ "زن و مرد نکاح دائمی کرنا چاہیں مگر باہمی اعتماد اور مکمل بھروسے کے واسطے آزمائشی طور پر کچھ دنوں کے لیے عقد کرلیں، اس مدت میں اعتماد حاصل ہو جائے تو نکاح دائمی سے منسلک ورنہ مدت ختم ہو جائے اور دونوں جدا ہو جائیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں: اہلِ مغرب جو بدکار عورتوں کی معین تعداد کو ہر شہر میں حکومت کی نگرانی میں رکھنے کو لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ بے شادی شدہ افراد جو دائمی شادی نہیں کر سکتے، کو خاندانی اور گھریلو زندگی بسر کرنے والوں کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہیں[1]۔

رسل اور نظریۂ ازدواج موقت:

"برٹرنڈ رسل" مشہور انگریز فلسفی نے، اخلاق اور خانگی تعلقات زن و شوہر میں لکھا ہے[2]:

"... سنجیدگی سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ فاحشہ عورتیں، ہماری گھریلو زندگی، ہماری خواتین اور عصمتِ دختران کی حفاظت کرتی ہیں۔ "ملکہ وکٹوریا" کے زمانے میں "لکی" نے یہ بات کہی تو اخلاق کے طرفدار بہت ناراض ہوئے، وہ اس کی علت نہ سمجھ اور "لکی" کے نقطۂ نظر کی غلطی ثابت کرنے میں ناکام رہے، اخلاق پرست طبقے کی زبانِ حال اور استدلال تھا۔" اگر عوام ہمارے تعلیمات کو قبول کرتے تو فحاشی ناپید ہو جاتی۔ لیکن وہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ انکی بات پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔"

فرنگیوں کا یہ فارمولا، ان مردوں، عورتوں کے لیے ہے جو نکاح دائمی نہیں کر سکتے، اور وہ تھا فارمولا جو اسلام نے تجویز کیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، اگر فرنگی فارمولے پر عمل کیا جائے اور کچھ بدنصیب عورتیں اس معاشرتی ذمہ داری کے لیے مخصوص کر دی جائیں، تو کیا، عورت کا حقیقی رتبہ اور اس کی انسانی حیثیت برقرار، اور "اعلامیہ حقوق انسانی" کی روح

---

[1] - بیسویں صدی میں حکومت کی طرف سے لائسنس دار فاحشہ عورتوں کے اڈے مغرب سے ایران میں آئے اور پہلوی حکومت نے اس کی بڑے پیمانے پر سرپرستی و ہمت افزائی کی۔

[2] - رسل کی کتاب کا نام ہے: "MARRAGE AND MORALS"

خوش ہو جائے گی؟

برٹرنڈرسل نے اپنی کتاب میں "آزمائشی شادی" کے عنوان سے ایک باب الگ لکھا ہے، اس کی رائے ہے:

"جسٹس لینڈزے، جو ڈینور کے طویل المعاد جج تھے موصوف نے اپنے مشاہدات اور مطالعۂ حقائق کے بعد تجویز رکھی تھی کہ "فرینڈ شپ میرج" ۔ ازدواج رفاقتی، کا پروگرام شروع کیا جائے ۔ افسوس، انھیں اپنی سرکاری ملازمت "امریکہ" میں چھوڑنا پڑی ۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ نوجوانوں کی خوش حالی اور سعادت کی فکر کو ان میں سیاہ کاری کی حس کو بیدار کرنے سے زیادہ حامی تھے ۔ کیتھولک اور کالوں کے مخالف گروہوں نے جج صاحب کو برطرف کرنے کی مہم چلا دی ۔

فرینڈ شپ میرج کی معتدل تجویز ایک دانشمند نے کی ہے ۔ وہ جنسی روابط میں استحکام پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ لینڈزے سمجھ گیا کہ شادی کی راہ میں بنیادی رکاوٹ مفلسی ہے، پیسے کی ضرورت صرف اولاد کے ہونے پر ہی نہیں، اصل بات بیوی کا معاشی سہارا نہ دینا ہے ۔ لہٰذا ، رفاقتی شادی جوانوں کے لیے مفید ہو سکتی ہے ۔ اس میں عام شادی سے تین اختلاف ہیں:

۱۔ شادی سے بچے پیدا کرنا مطلوب نہ ہوں گے ۔

۲۔ جواں عورت جب تک ماں نہ بنے گی، حاملہ نہ ہو گی، طرفین سے طلاق برضامندی آسان ہو گی ۔

۳۔ طلاق کی صورت میں عورت کو اپنے آذوقے کے لیے کچھ امداد کی ضرورت ہو گی ۔

...... میں لینڈزے کی تجویز کے مفید و مؤثر ہونے میں کوئی شک نہیں رکھتا ۔ اگر قانون اسے منظور کر لیتا تو اخلاقی فلاح و بہبود میں اچھا

اضافہ ہوتا۔"

لینڈزے اور رسل جسے "ازدواج رفاقتی" کہتے ہیں اگرچہ اسلامی "ازدواجِ مؤقت" سے اس میں کچھ فرق تو ہے لیکن یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ مفکرین اس نکتہ کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ تنہا "ازدواج دائمی" تمام معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں۔

نکاح مؤقّت

(۲)

قانونِ متعہ کے خصوصیات، اس کے وجود کی ضرورت اور فقط نکاح دائمی تمام انسانوں کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ خاص کر موجودہ زمانے میں۔ یہ تھے وہ نکات جن پر بحث و تحقیق کی گئی۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ متعہ کے ممکنہ نقصان کیا ہو سکتے ہیں۔ تمہید میں ایک بات یاد دلاتے چلیں:

تاریخ عقائد نویسی: انسان جن موضوعات و مسائل و مباحث پر اظہار رائے کرتا چلا آرہا ہے، ان میں تاریخ علوم و عقائد اور رسم و رواج اور انسانی آداب (جیسے موضوعات سب سے زیادہ نامفہوم اور مشکل ہیں)

چنانچہ کسی موضوع پر انسان نے اس موضوع سے زیادہ بے معنی باتیں نہیں کی ہیں۔ اتفاق سے کسی اور موضوع پر اظہار رائے کا اتنا شوق بھی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر، اگر کسی کو اسلامی فلسفہ و تصوّف و عرفان و علم کلام سے واقفیت ہے اور اس نے آج کے مصنفین کی تحریریں پڑھی ہیں — یہ تحریریں عموماً یا بیرونی مصنفین سے ماخوذ یا اصل گفتگو کی نقل ہیں — بہرحال ان سے باخبر حضرات میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے، یعنی اورینٹلسٹ، ان کے پیروکار اور دم چھلے ان مسائل پر گفتگو ضرور کی جانتے ہیں لیکن براہِ راست موضوع کو شاید ہی گہرائی کے ساتھ جانتے پہچانتے ہیں۔

اسلامی تصوّف کے ایک مسئلہ کو لیجئے "وحدتِ وجود" اب یہ مسئلہ زبان زد ہے۔ کیا کیا باتیں نہیں کہی گئی ہیں۔ بس ایک بات تشنۂ گفتگو ہے اور وہ ہے "وحدتِ وجود کیا ہے اور اسلامی تصوف و عرفان کے بڑے بڑے مفکر جیسے محی الدین ابن عربی اور

صدر المتالہین شیرازی کا تصور وحدت وجود کیا ہے؟

رسالہ "زنِ روز" میں چھپنے والے مضامین، جن میں نکاح منقطع پر اظہار رائے کی گئی پڑھتے وقت مجھے "مسئلہ وحدتِ وجود" یاد آتا رہا۔ یہ محسوس ہوا کہ سب باتیں زیر بحث آئیں لیکن اصل روح مسئلہ جو یہ قانون بتاتی ہے اور قانون ساز نے اس کو پیش نظر رکھا ہے تشنہ بحث ہے۔

دراصل یہ قانون چونکہ "مشرقی ترکہ" ہے لہذا بے توجہی کا مستحق ہے اور اگر یہی "مغربی تحفہ" ہوتا تو بحث یوں نہ ہوتی۔

یہ قانون سرزمینِ مغرب سے آیا ہوتا تو آج اس پر کانفرنسوں اور سیمناروں کا سلسلہ جاری ہوتا، قرار دادیں پاس ہوتیں کہ بیسویں صدی کے آخری پچاس سال میں ماحول اتنا بدل گیا ہے کہ فقط نکاحِ دائمی کو شادی قرار دینا مطابق حالات نہیں ہے۔ موجودہ نسل نکاح دائمی کے فرائض برداشت کرنے کی قوت سے محروم ہے۔ آج کا جوان ان ذمہ داریوں کو نہیں اٹھا سکے گا اسے آزادی چاہیے۔ آزاد زندگی میں آزاد نکاح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ آزاد نکاح میں آج کا جوان لڑکا اور لڑکی آزادی سے شرطیں طے کرتی ہے ....

اور اسی دلیل کی بنیاد پر مغرب سے ایک زمزمہ اٹھا کہ "دوستانہ شادی" وقت کی ضرورت ہے اور "برٹرنڈرسل" جیسے مفکر اس میں شریک ہو گئے۔ حالات بتاتے ہیں کہ مستقبل میں اسلام کی صوابدید کو مغرب والے پسند کریں گے اور ہم ازدواج دائم کے خلاف مہم کا دفاع اور اس کا پروپیگنڈہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اعتراضات و جوابات

متعہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان کی نوعیت یہ ہے:

۱۔ شادی کی بنیاد دوام پر ہونا چاہیے۔ میاں بیوی جب یہ بندھن قبول کریں تو

ہمیشہ کے لیے پابند رہیں اور جدائی کا خیال ذہن میں نہ آنے دیں، اور متعہ میاں بیوی میں دوامی قول وقرار ہی نہیں لہذا وہ نکاح بھی نہیں۔

ازدواج کو مستحکم بنیاد قائم ہونے کی بات بہت صحیح بات ہے لیکن متعہ پر اعتراض اس وقت ہو سکتا ہے جب نکاح دائم کو منسوخ کر کے متعہ کو اس کی جگہ رکھدیا جائے۔ بے شک فریقین دائمی نکاح پر متفق ہوں، دونوں کو مکمل اطمینان ہو، دونوں پکا ارادہ کریں تو نکاح دائمی کا قانون موجود ہے۔

ازدواج موقت کا قانون تو بنا ہی اس لیے ہے کہ فقط ازدواج دائم، ہر حالت یا ہر صورت حال اور ہر وقت ممکن نہیں، نہ انسانی ضروریات کا پورا کرنا نکاح دائمی کے دائرہ کار میں ہے۔ ایک دائمی نکاح کی محدودیت نے افراد کو جز وقتی رہبانیت یا جنسی کمیونزم قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سامنے کی بات ہے، جب لڑکی اور لڑکے میں دائمی نکاح کی زمین ہموار ہو تو وہ ہرگز نکاح منقطع پر تیار نہ ہوں گے۔

۲۔ ایرانی عورتوں اور لڑکیوں نے نکاحِ منقطع کو پسند نہیں کیا، حالانکہ وہ شیعہ ہیں، ان کے خیال میں یہ توہین کی بات ہے۔ اسی بنیاد پر شیعہ مرد بھی اسے مسترد کرتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ عورتوں میں متعہ کی ناپسندیدگی ہوس پیشہ مردوں کے غلط رویّہ سے ہے، قانون کو اس رویے پر بند باندھنا چاہیے۔ ہم اس قانون کے غلط استعمال پر آگے بحث کریں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ متعہ کے بارے میں اس پسندیدگی کی توقع جو نکاح دائمی کے بارے میں ہے — غلط ہے، کیونکہ قانون متعہ ہے ہی اس موقع کے لیے جب فریقین نکاح دائم کے لیے تیار و متفق نہ ہوں۔

۳۔ نکاح منقطع، عورت کی شخصیت و احترام کے خلاف ہے، اس کے معنی ہیں انسان کو کرایہ پر لینا، یا جسم فروشی کا شرعی جواز، عورت کی شخصیت اور انسانی حیثیت سے گری ہوئی بات ہے کہ مرد سے کچھ پیسے لے کر اپنا وجود، اپنا جسم اس کے حوالے کر دے۔

یہ اعتراض سب سے زیادہ تعجب خیز ہے۔

۱۔ ازدواج موقت کے بارے میں جو امتیازات ہم گذشتہ سطور میں لکھ چکے،

ان کے ہوتے ہوئے اجارے اور کرایے کا ربط کیا ہے، آیا مدت ازدواج کی محدودیت نے ایسے نکاح (ازدواج) کی صورت سے خارج کر دیا اور کرایہ و اجارہ کی ہیئت دے دی؟ یا، مہر کے قطعی تعین کی وجہ سے کرایہ و اجارہ کی شکل بن گئی ہے؟ یعنی اگر مہر کے بغیر ہو اور مرد کوئی چیز عورت پر نچھاور نہ کرے تو عورت اپنی انسانی حیثیت واپس لے لیتی؟ —— مہر کے بارے میں آگے گفتگو کریں گے۔

اتفاقاً، علماء فقہ نے تصریح کر دی اور "قوانین مدنی" نے اسی بنیاد پر اپنے دفعات مرتب کیے ہیں کہ ازدواجِ موقت و ازدواجِ دائم دونوں میں معاہدے کی حیثیت ایک ہی ہے ان میں کسی طرح کا کوئی فرق نہیں ہے نہ کوئی فرق کرنا چاہیے۔ دونوں "ازدواج" ہیں، دونوں "مخصوص الفاظ CODE WORDS سے "ازدواج" کی صورت حاصل کرتے ہیں۔ اگر نکاحِ منقطع اجارہ و کرایہ کے "مخصوص صیغوں" سے پڑھا جائے تو باطل ہے۔

۲۔ انسان کا اجارہ و کرایہ کب اور کس تاریخ سے کینسل ہوا ہے؟ درزی، حجام، ڈاکٹر اور تمام ماہرین اور ملازمینِ سرکار۔ وزیر اعظم سے لے کر چپراسی تک تمام کاری گر، کارخانے کے سب کارکن کرائے کے انسان ہیں۔

جو عورت اپنے ارادہ و اختیار سے کسی معیّن مرد سے "عقدِ ازدواجِ موقت" کرتی ہے کرایہ کی آدم زاد نہیں بنتی۔ نہ اس نے انسانی حیثیت و شرافت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے۔ اگر آپ کو کرائے کی عورت دیکھنا، اور اگر آپ عورت کی فروخت اور کنیزی کا جائزہ لینا چاہیں تو یورپ اور امریکہ چلے جائیں۔ وہاں ایک مرتبہ فلم کمپنیوں کو دیکھ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کرائے کی عورت کیا ہوتی ہے؟ کمپنیاں، عورت کی ایک ایک جسمانی حرکت، اس کی نسوانی ساخت، نسوانی عادتیں، اس کے جنسی آرٹ، کس کس طرح بیچے جاتے ہیں۔ سینما اور تھیٹر کے جو ٹکٹ آپ خریدتے ہیں دراصل وہ عورتوں کے اجارے اور کرائے کے پیسے ہیں۔ غور تو کیجیے، بدنصیب عورت صرف دولت کے لیے اپنا جسم کیونکر پیش کرتی ہے؟ تجربہ کار "شرفا

سے "ZAST" "حصول لذت کی تڑپ، جنسی مٹک تھڑک سیکھتی ہے، اپنا جسم، روح اور شخصیت ایک سرمایہ دار کمپنی کے حوالے کرتی ہے، مقصد ہے اس کمپنی کے خریدار زیادہ بنائے اور اس کے لیے پیسے زیادہ فراہم کرائے۔

کیبرے اور ہوٹل بھی دیکھیے، عورت نے کیا شرافت و عزت حاصل کی ہے۔ تھوڑی سی مزدوری، تھوڑا سا معاوضہ، اور وہ بھی (مالک) سرمایہ دار کی جیب میں مزید سرمایہ انڈیلنے کے لیے اپنی شخصیت و شرافت کا مہمانوں سے سودا کرتی ہے۔

کرائے کی عورتیں وہ مائکن۔ تنخواہ دار خواتین دیکھیے جو "شاپنگ سنٹروں" "اقتصادی کمپنیوں" میں خریداروں کا دل موہنے اور گاہکوں کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے، ٹیلو ثرن پر رنگا رنگ چہرے بناتی ہیں۔ ان کا کام کسی تجارتی سامان (مصنوعات) کی شہرت کا باعث بن کر سرمایہ دار کی جیب بھریں۔

کون نہیں جانتا، آج امریکہ اور یورپ میں عورت کا حسن، عورت کی دل کشی، عورت کی جنسی کشش، عورت کی آواز، امریکہ اور یورپ کے سرمایہ داروں کی خدمت گذاری کا عام اور حقیر وسیلہ ہے؟ افسوس ہے کہ آپ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایران کی شریف و معزز خواتین کو مذکورہ بندھوں میں جکڑنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک عورت آزادانہ و شریفانہ شرائط کے ساتھ "ازدواج موقت" کرنے کے بعد اسے کرائے کی عورت کہا جائے اور ایک گلوکارہ کسی کی شادی، یا محفل شب میں ہزاروں لالچی مرد وزن کی آنکھوں کے سامنے فقط ان کی جنسی حس کو آسودہ کرنے کے لیے اپنا گلا پھاڑتی اور ایک ہزار ایک نغمے الاپنی اور طے شدہ مزدوری لیتی ہے۔ کرائے کی عورت شمار نہیں ہوتی؟

وہ اسلام، جو عورت سے مرد کو اس قسم کے فوائد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو عورت کو اس جال میں پھنسنے سے روکتا اور اس اسیری اور اس روزی سے روکتا ہے، کیا وہ اسلام، عورت کا مقام گراتا ہے، یا بیسویں صدی کا نصف دوم کا یورپ؟

جس دن عورتوں کو یہ حقیقت معلوم ہوئی اور وہ خواب غفلت سے بیدار ہوئیں، اور انھیں یہ نظر آیا کہ بیسویں صدی کے مردوں نے ان کے راستے میں کیسے کیسے جال بچھائے ہیں، اسی دن وہ انقلاب کا نعرہ بلند کریں گی اور یہ بھی مانیں گی کہ فقط قرآن ان کی پناہ گاہ، ان کا واقعی حامی اور ان کے سامنے معلّم میں حق گو ہے ــ یقیناً وہ دن دور نہیں (انقلاب اسلامی آیا اور وہ دن لایا خواتین نے آقائے مطہری کی پیش گوئی سچ کر دکھائی)

رسالۂ "زنِ روز" شمارہ ۸۷ صفحہ ۸ میں ایک رپورتاژ چھپی ہے، عنوان ہے "زنِ کرایے ای" مرضیہ و رضا نامی دو کردار ہیں۔ مرضیہ نے عورتوں میں محرومیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

رضا کا بیان ایک لڑکی سے منگنی پر شروع ہوتا ہے۔ فارمولا نمبر ۴۰ کے مطابق پہلا اقدام ہوا، اور لڑکی، لڑکے سے شادی کی خواہش ظاہر کرنے گئی۔ واضح ہے، جب خواستگاری لڑکی سے شروع ہوگی تو انجام داستان اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔

مرضیہ کے "اظہار" کے مطابق، ایک ہوس ران، سنگ دل مرد نے نکاح دائمی کا نام لے کر بات کی، اس کے بچوں کی نگہداشت اور سرپرستی کا وعدہ کیا، پھر ان باتوں کے برخلاف بدنصیب عورت کی اطلاع میں لائے بغیر اس سے متعہ کیا اور اپنا مطلب نکال لینے کے بعد اس سے لاپروائی شروع کر دی۔

اگر اس عورت کا اظہارِ دعویٰ صحیح ہے، تو نکاح باطل تھا جس سنگ دل مرد نے ایک عورت کو شرعی و عرفی قانون سے بے خبری کی بنا پر دست درازی کا نشانہ بنایا، لہٰذا اس کو سزا ملنا چاہیے۔

"رضا" جیسوں کو سزا ملنے سے پہلے، تربیت ملنا چاہیے اور رضا جیسوں کی سزا تربیت سے پہلے "مرضیہ" جیسی خواتین کو باخبر بنانا چاہیے۔

مرد کی سنگ دلی اور عورت کی بے خبری و غفلت کے ہاتھوں رونما ہونے والا جرم، قانون سے کیا تعلق رکھتا ہے؟ جو رسالۂ "زنِ روز" میں رضا کو حق پر بتاتا اور اپنی تلوار

قانون پر سیدھی کرتا ہے۔ کیا اگر "قانونِ ازدواجِ موقت" نہ ہوتا تو، سنگ دل رضا، بے خبر و غافل مرضیہ کو خاموش چھوڑ دیتا؟

عورتوں کی تربیت اور ان کو باخبر بنانے کی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کیوں ہے، مرد و زن کے حقوق و فرائضِ شرعی کو چھپاتے ہیں۔ عورتوں کو غافل بنا کر اس قانون کا بطور دشمن تعارف کراتے ہیں جو تنِ تنہا، عورت کے بارے میں حق گو اور ان کا حامی ہے۔ کیوں اس قانون کو خواتین کے ہاتھوں کچلوانا چاہتے ہیں جو اُن کی پناہ گاہ ہے؟

۴۔ نکاحِ منقطع، چوں کہ تعددِ زوجات کی قسم ہے اور تعددِ زوجات غلط ہے، لہذا نکاحِ منقطع غلط چیز ہے۔

نکاحِ منقطع کس قسم کے افراد کے لیے ہے؟ ہم اسی موقع پر اور تعددِ ازدواج بات ــ بامدادِ خدا ــ الگ اور بہ تفصیل لکھیں گے۔

۵۔ نکاحِ منقطع، چونکہ ناپائدار ہے، لہذا ان بچوں کے لیے ناموزوں آشیانہ ہے جو اس نکاح کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، یہ بچے، حمایتِ پدری اور سرپرست سے محروم، اور مادری سرگرمیوں سے بے نصیب رہتے ہیں۔

یہ اعتراض، رسالہ "زنِ روز" کا وہ نکتہ ہے جس پر پورا زور صرف کیا گیا ہے۔ ہم نے جو توضیحات پیش کیے ہیں، ان کے بعد کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی، ہم گذشتہ مقالے میں ازدواجِ دائم و ازدواجِ موقت کے فرق بتا چکے ہیں اور کہا ہے کہ ایک فرق تولیدِ نسل سے متعلق ہے۔

ازدواجِ دائمی میں زن و شوہر باہمی رضامندی کے بغیر ضبطِ تولید نہیں کر سکتے۔ ازدواجِ موقت اس کے برخلاف ہے، یہاں میاں بیوی دونوں اس معاملے میں آزاد ہیں۔ متعہ میں عورت، مرد کو استمتاع سے تو نہیں روک سکتی مگر مرد کے اس حق میں رکاوٹ ڈالے بغیر مانعِ حمل عمل ضرور بجا لاسکتی ہے۔ اس دور کے مانعِ حمل و ضبطِ تولید کے منصوبوں سے نکاحِ منقطع ہم آہنگ ہے۔

اس بنا پر، متعہ میں، میاں بیوی دونوں چاہیں تو بچہ پیدا کریں اور ہونے والے بچے کی نگہداشت و تربیت کی ذمہ داری اٹھائیں تو بچہ پیدا کریں۔ ظاہر ہے۔ جذباتی و فطری لحاظ سے نکاحی اور رضاعی اولاد میں کوئی فرق نہیں۔ بالفرض اگر ایسا عمل کیا جائے تو قانون پابند و مجبور کرے گا، اور حقوق اولاد تلف کرنے سے روکے گا۔ ہاں، اگر تولید فرزند نہ چاہیں اور ان کا مقصدِ نکاحِ منقطع جنسی تسکین حاصل کرنا ہو تو ضبطِ تولید کریں۔

ہمیں معلوم ہے، کلیسا 'مانعِ حمل عمل' کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ لیکن اسلام کی نظر میں اگر زن وشوہر پہلے ہی سے ضبط تولید کی بات کریں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن اگر نطفہ قائم ہو جائے اور بچّہ کی پہلی تخلیقی منزل شروع ہو جائے تو اسلام اسے ضایع ہونے کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

شیعہ فقہا جو کہتے ہیں کہ ازدواجِ دائم کا مقصد تولیدِ نسل اور ازدواجِ موقت کا مقصد استمتاع اور جنسی تسکین کا حصول ہے اس سے اسی قانونی نکتے کی تشریح ہوتی ہے۔

انتقاد ۔ چالیس نکات پر

چالیس نکاتی منشور (تجاویز) کے مصنف نے "زنِ روز" کے شمارہ ۸۷ میں نکاحِ منقطع کو نشانِ نقد ونظر قرار دیا ہے:

پہلے فرماتے ہیں: "موضوع قانونِ نکاح یا ازدواجِ منقطع اس قدر تکلیف دہ ہے کہ خود قانون کے واضعین بھی اس کی شرح وتفصیل نہ لکھ سکے۔ جیسے وہ اپنے کام سے خوش نہیں تھے، جو کچھ کیا ظاہر داری کے لیے تھا۔ دفعات ۱۰۷۵ و ۱۰۷۶ ـ ۱۰۷۷ کی لفظیں لکھ کر فقرے جوڑ کر چھوڑ دیے۔

قانونی دفعات مرتب کرنے والے "نکاح منقطع (متعہ)" سے متعلق کام سے خوش نہ تھے، نتیجہ یہ کہ انھوں نے بنیادی بات ۔ مذکورہ عقد کی تعریف کی نہیں کی۔ نہ ان کے لوازم و شرائط کی توضیح دی۔ ....."

محترم مقالہ نگار اس کے بعد قانونِ مدنی کے اس نقص کو خود دور فرماتے ہیں اور نکاح منقطع کی تعریف کرتے اور لکھتے ہیں: "نکاحِ مذکور کے معنی ہیں۔ بے شوہر عورت معین اجرت و مزدوری۔ معلوم معین اور محدود وقت کے ساتھ۔ خواہ چند لمحوں یا گھنٹوں کے لیے ہو۔ جنسی خواہش اور تمتع اور جنسی عمل کے لیے مرد کے حوالے کر دے۔"

پھر فرماتے ہیں: نکاحِ مذکور میں ایجاب و قبول کے خاص عربی الفاظ ہیں، جو شیعہ کتب فقہ میں درج ہیں۔ قانون نے مدتوں سے ادھر توجہ نہیں کی، جیسے قانون ساز کی نظر میں جو لفظ بھی مدعا و مذکور پر دلالت کرے (یعنی مفہوم و معنی) کرایہ و مزدوری کے معنی دے چاہے وہ عربی نہ بھی ہو۔ نکاح منقطع واقع ہو جاتا ہے۔

مضمون نگار کی نظر میں:

الف ۔ قانون مدنی، نکاح منقطع کی تعریف نہیں کرتا، اور شرائط کی توضیح نہیں دیتا۔

ب ۔ نکاح منقطع کی ماہیت یہ ہے کہ عورت اپنے تئیں، معین مزدوری کے لیے مرد کو کرایے پر دے۔

ج ۔ قانونِ مدنی کی روشنی میں، عورت کے لیے کرایے (اجارے) کے معنی دینے والے الفاظ، ایجاب و قبولِ نکاحِ منقطع کے لیے کافی ہیں۔

میں مصنف کو دوسری مرتبہ "قانونِ مدنی" پڑھنے کی دعوت دیتا ہوں۔ مگر ذرا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ رسالہ "زنِ روز" کے محترم مطالعہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے، ذرا زحمت کر کے "قانونِ مدنی" کی ایک کاپی حاصل کر کے مطلوبہ حصوں پر نظر ڈالیں۔

قانونِ مدنی، چھٹی فصل، کتاب نکاح، نکاح منقطع کے بارے میں مخصوص ہے۔ اس میں صرف تین سادہ جملے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ نکاحِ وقتی "منقطع" ہے، یہ معین مدت کے لیے واقع ہوتا ہے۔

دوسرا یہ کہ نکاحِ منقطع کی مکمل طور پر مدت معین ہونا چاہیے۔

تیسرا جملہ یہ ہے کہ مہر و میراث میں نکاح منقطع کا وہی قانون ہے جو مہر و میراث سے مربوطا فصلوں میں بیان ہوا ہے۔

چالیس نکات کے محترم مصنف کا خیال ہے کہ۔ کتاب نکاح کی پانچ فصلوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نکاحِ دائم سے مربوط ہے اور فقط یہ تین دفعات نکاحِ منقطع کے بارے میں ہیں۔ اور یہ بھول گئے کہ پانچوں فصلوں کے تمام قانونی دفعات بجز تصریح شدہ مقامات کے جیسے دفعہ ۱۰۶۹ یا طلاق سے متعلق بات۔ نکاحِ دائم و نکاح منقطع میں مشترک ہے مثلاً دفعہ ۱۰۶۲ ہے :۔

"نکاح واقع ہوتا ہے ان الفاظ کے ذریعے ایجاب و قبول سے جو صاف صاف ارادہ ازدواج کے معنے بتائیں"

یہ دفعہ نکاحِ دائم سے مختص نہیں ہے، دونوں نکاح اس کے ضمن میں ہیں۔ عقد کرنے والے، عقد، یا میاں بیوی کے بارے میں جو شرائط مذکور ہیں، ان کا تعلق بھی دونوں نکاحوں سے ہے۔ اگر قانونِ مدنی میں نکاح موقت کی تعریف نہیں تو اس کی وجہ تعریف کی ضرورت کا نہ ہونا ہے۔ نکاح دائم کی تعریف بھی اسی بنا پر موجود نہیں ہے۔ اسے تعریف سے بے نیاز سمجھا گیا ہے۔ "قانون مدنی" میں ہر اس لفظ کو موثر مانا گیا ہے جو نکاح دائمی اور نکاح منقطع کے معنی وضاحت سے ادا کر دے۔ لیکن اگر زوجیت کے لیے کسی لفظ کا مفہوم زوجیت کے علاوہ دوسرے معنی دے، جیسے معاوضہ، لین دین، اجارہ اور کرایہ تو وہ لفظ یا الفاظ، نکاح دائم اور نکاح منقطع دونوں کے لیے کافی نہیں۔

میں اس مضمون میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چند فاضل جج صاحبان اور واقعی تجربہ کار قانون دان حضرات نے خوش قسمتی سے ایسے حضرات عدالتوں میں کثرت سے ہیں۔ یہ کہہ دیں کہ مذکورہ اعتراضات "قانون مدنی" پر واقعاً کیے جا سکتے ہیں، تو میں آج ہی سے "زنِ روز" میں اپنے تمام انتقادی مضامین روک لوں گا۔

نکاحِ موقّت اور حرم سرا

(۳)

مشرق کے خلاف، مغرب کے پاس ایک شوشہ ہے جسے بار بار وہ دکھاتا، فلم بناتا اور تھیٹر کرتا ہے وہ بات ہے حرم سرا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ مشرق کی سرزمین پر حرم سراؤں کے نمونے کچھ زیادہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔

مشرقی خلفا و سلاطین میں کچھ لوگوں کی زندگی ان داستانوں کا بھرپور نمونہ تھی۔ ان کی حرم سرا سازی، ان کی ہوس رانی و ہوس پرستی کی تصویر تیار کرتی ہے۔

کہتے ہیں۔ متعہ کو جائز سمجھنا، حرم سرا بنانے کی اجازت ہے۔ یورپ کے مقابلے میں ایشیا کا یہ کمزور پوائنٹ ہے۔ متعہ کا جواز، ہوس رانی کا جواز، ہوس رانی کا جواز، اور شہوت پرستی و ہوس رانی جس شکل و صورت میں، خلافِ اخلاق و ترقی ہے۔ ذلت و تباہی کا باعث ہے۔

تعدادِ ازدواج کے بارے میں بھی یہی بات دہرائی جاتی ہے۔ یہ تو ایوانِ عشرت و حرم سرا بنانے کا جواز ہے۔

تعدادِ ازدواج کی بحث ہم آگے کریں گے سردست تو ازدواجِ موقّت ہی سے بحث کرنا ہے۔ اس موضوع کا دو طرح سے جائزہ لینا چاہیے، ایک اس زاویے سے کہ حرم سرا کی تشکیل کا عامل معاشرتی لحاظ سے کیا تھا؟ کیا قانونِ ازدواجِ موقّت تشکیل حرم سراءِ مشرق میں کوئی موثر ہے، یا نہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ "قانونِ ازدواجِ موقّت" کے بنانے کا مقصد ضمنی طور پر ہوس رانی، اور چند افراد کے لیے حرم سرا بنانے کا جواز مہیا کرنا تھا، یا نہیں؟

حرم سرا سازی کے معاشرتی اسباب

پہلا حصہ۔ حرم سرا کی ایجاد دو عوامل کا نتیجہ ہے:

۱۔ حرم سرا سازی کا پہلا عامل، خواتین کی پاکدامنی و تقوی ہے۔ یعنی ماحول کے اخلاقی ضابطے اور معاشرتی اصول ایسے ہوں جہاں عورت کو اجازت نہ دی جائے کہ جب کسی مرد سے جنسی رابطہ پیدا کرلے تو دوسرے مردوں سے تعلقات قائم کریں۔ معاشرے کے اس دباؤ کی بناپر عیاش آدمی کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ عورتوں کا ایک ٹولہ جمع کرے اور حرم سرا تعمیر کرے۔

سادہ سی بات ہے۔ اگر اخلاقی و معاشرتی نقطۂ نظر سے عورتوں پر پاک دامنی و تقوی کی پابندی نہ ہوتی اور عورت مفت یا بلا زحمت اپنے تئیں مرد کے سپرد کرسکتی اور مرد بھی ہر وقت ہر عورت سے ہوس رانی کرسکتے، تو مردوں کی مذکورہ صنف لمبی چوڑی حرم سرائیں نہ بناتے اور ان کے بھاری اخراجات اور انتظامات نہ کرتے۔

دوسرا عامل ۔ اجتماعی عدالت کا فقدان ۔ جب اجتماعی عدالت معدوم ہو۔ ایک سمندر میں ڈوب رہا ہو، نعمت و دولت کے سمندر میں۔ دوسرا کشتی میں پھنسا ہو۔ فقر و افلاس، معذوری و بے چارگی کی کشتی ۔ مردوں کی وافر تعداد خاندان سازی و شادی سے محروم رہتے ہیں، اس سے غیر شادی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پس منظر میں حرم سرا کی تعمیر کے لیے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔

اگر اجتماعی عدالت ہو، خاندان کی تشکیل ممکن ہو، وسائل موجود ہوں اور ہر شخص شادی کرسکتا ہو تو لازمی طور پر ہر عورت کے لیے ایک مرد ہوتا اور عیاشی و ہوس رانی و حرم سرا کی تعمیر کا ماحول نہ بننے پاتا۔

عورتوں کی تعداد مردوں سے کتنی زیادہ ہوگی، یعنی اگر تمام بالغ مرد شادی کریں تو اس کا امکان کہاں رہتا ہے کہ ہر آدمی حرم سرا بنوا سکے یا ہر دولت مند آدمی ایک حرم سرا کا مالک ہو؟

تاریخ اپنی عادت کے مطابق درباروں اور خلفاء و سلاطین کی حرم سراؤں

کا تذکرہ کرتی ہے۔ ان کی کامرانیوں عیش و عشرت کی تفصیل لکھتی ہے۔ اور محلوں کی دیوار تلے ناکامیوں، محرومیوں، مردہ حسرتوں اور آرزوں کے ساتھ مرنے والوں کا ذکر نہیں کرتی۔ ان کے بارے میں چپ رہتی ہے جن کو معاشرے کے تقاضوں نے رفیق حیات ڈھونڈنے کی مہلت نہیں دی۔ بیسیوں اور سینکڑوں عورتیں حرم سرا میں زندگی بسر کر چکی ہیں۔ مگر ایسی عورتوں کی تعداد بھی کم نہیں جن کو فطری حق سے محروم رکھا گیا اور انہیں ایک شوہر بھی نصیب نہ ہوا وہ بیچاریاں تنہا زندگی کے دن کاٹ کر گذر گئیں۔

طے شدہ بات ہے۔ اگر معاشرے پر پاک دامنی کا راج ہو۔ عورت کے لیے تقوے کی پابندی لگ جائے، جنسی کامیابی کا کیڈر نکاح بنا دیا جائے (دائم ہو یا منقطع) اور کوئی صورت ممکن نہ رکھی جائے۔ اقتصادی عدم توازن اور معاشرتی ناہمواری ختم کر دی جائے، ہر بالغ شخص، انسانی طبیعی حق یعنی رفیق حیات حاصل کرنے کا اہتمام ہو تو حرم سرا کی تشکیل محال و ناممکن بن جائے۔

تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ قانونِ ازدواج موقت کا ذرہ برابر بھی دخل حرم سرا کی تعمیر و تشکیل میں نہیں تھا۔ عباسی خلفا یا عثمانی سلاطین جو اس ضمن میں سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ کبھی شیعہ مذہب سے وابستہ نہ تھے کہ قانونِ ازدواج منقطع سے استفادہ کرتے۔

شیعہ سلاطین باوجودیکہ اس قانون سے فائدہ اٹھا سکتے اور نکاح موقت کر سکتے تھے، مگر وہ ایسے عباسی خلفا اور عثمانی سلاطین کی تعداد و حالات کے برابر نہیں پہنچ سکے۔ یہ قصہ بھی خاص حالات اور خاص معاشرتی رجحان کی بنا پر ہے۔ صاحبانِ دانش اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔

کیا ازدواج مؤقت ہوس رانی کے لیے جواز مہیا کرتا ہے؟

بحث کا دوسرا حصہ ــ آدمی ہر چیز میں شک کر سکتا ہے۔ مگر اس بات میں کوئی شک و تردید نہیں کہ آسمانی مذاہب ہوس رانی کے خلاف ہیں، مذاہب نے خواہش پرستی کے خلاف محاذ لگایا ہے۔ اکثر ادیان و مذاہب کے لوگ

ترکِ ہوس و ترکِ خواہش کے لیے بڑی بڑی ریاضتیں جھیلتے ہیں۔

اسلام کے واضح اور مسلم اصول میں ایک بنیاد، خواہشات کی پرستش سے مقابلہ ہے۔ قرآن مجید نے خواہش پرستی کو بت پرستی کے ہم پلہ قرار دیا ہے۔ اسلام میں وہ شخص ملعون اور خدا کا قابلِ نفرت انسان سمجھا گیا ہے جس کا مقصد ہی رنگارنگ عورتوں سے لذت حاصل کرنا ہو۔ "ذواق"۔ طلاق پر بحث کے ضمن میں اس موضوع پر کچھ اسلامی مصادر و مدارک نقل کریں گے۔

متعدد شریعتوں کے مقابلے میں اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اسلام، ریاضت و رہبانیت کو مسترد کرتا ہے۔ ہوس رانی کو جائز قرار دینے کے لیے نہیں، بلکہ اسلام کی نظر میں تمام انسانی جبلیں، طبیعی تقاضے، جنسی ہوں یا غیر جنسی۔ تقاضے کی حد میں رہیں اور طبیعت کی ضرورت بڑی حد تک پوری ہو جائے، ہاں، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ غرائز (جبلتوں) کو ہوا دے اور انھیں نہ بجھنے والی روحانی پیاس بنا لے۔ لہٰذا، جو چیز بھی عیاشی، حرم سرا سازی اور ہوس ران افراد کی ہوس پرستی کا وسیلہ ہو، جس سے ایک عورت در بدر اور بچے لاوارث بنیں وہ غیر اسلامی ہے۔

ائمہ علیہم السلام کی طرف سے ازدواجِ مؤقت کی تشویق و ترغیب پر احادیث کی روایت کا ایک فلسفہ ہے جس پر عن قریب گفتگو ہوگی۔

آج کی دنیا میں حرم سرا!

یہ بھی دیکھیے کہ آج دنیا میں حرم سرا کے لیے کیا ہوا ہے؟ آج کی دنیا حرم سرا کو منسوخ کر چکی ہے۔ آج کل حرم سرا کو منسوخ کیا جا چکا ہے۔ ان دنوں حرم سرا کو ناپسندیدہ کام جانتے ہیں۔ اس کے سبب (عامل)، وجود کو ختم کر دیا گیا ہے۔ مگر کون سا عامل و سبب؟ کیا معاشرتی ناہمواریوں کو اٹھا دیا ہے اور اب تمام نوجوان شادیاں کرنے لگے، اس طریقے سے حرم سرا بنانے کا عمل ختم ہو گیا؟

نہیں، ایک اور کام ہوا ہے۔ پہلا عامل و سبب یعنی عورت کی پاک دامنی و تقویٰ

نے مقابلہ کیا، اور مرد کے لیے بہت بڑی خدمت انجام دی۔ تقویٰ اور پاک دامنی جس قدر عورت کو قدر و قیمت بخشتی ہے اس قدر مرد کے لیے رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

آج کی دنیا نے ایک کام کیا ہے، اس صدی کا عیاش مرد، بڑے بڑے اخراجات برداشت کر کے حرم سرا بنانے کا محتاج نہیں ہے۔ اس صدی کے مرد کو مغربی تمدن کی برکت سے ہر جگہ حرم سرا میسّر ہے۔ اس صدی کا مرد ضروری نہیں سمجھتا کہ ہارون رشید و یحییٰ برمکی جیسی دولت کا مالک ہو پھر وہ اس تعداد میں رنگا رنگ عورتوں سے لذّت اٹھائے۔

اس صدی کے مرد کو ایک موٹر کار اور ماہانہ دو تین ہزار روپے (نہ ہی دس بیس ہزار روپے) درکار ہیں۔ وہ جنسِ خواتین سے ایسی عیاشی اور لطف اندوزی کر سکتا ہے جو ہارون رشید نے خواب میں بھی نہ دیکھی ہو گی۔ ہوٹل، ریسٹورنٹ اور کافے، حرم سرا کے عوض اپنے یہاں مردوں کو بلا رہے ہیں۔

"عادل کوتوالی" جیسے بہت سے مرد اس صدی میں، سینہ تان کر کہتا ہے ۔ وہ بیک وقت بائیس حسینائیں، مختلف شکل و صورت کی عورتیں، میرے پاس ہیں۔ اس صدی کے مرد کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ اس قرن کا مرد مغربی تمدن کی برکت سے اگر کچھ کھو سکتا ہے تو وہ وسیع اخراجات اور زحمت و دردِ سر کے ساتھ حرم سرا ہے۔

اگر "الف لیلہ" کا ہیرو قبر سے نکل آئے اور عیش و عشرت کے وسیع امکانات اور سستی یا بلا قیمت ملنے والی ماڈرن عورت کو دیکھ لے، تو کسی صورت میں اتنے زیادہ اخراجات اور مصیبتوں کے ساتھ حرم سرا بنانے کی جرأت نہ کرے۔ یورپ والوں نے حرم سرا کے انتظامات اور زحمتوں سے اسے معاف کر رکھا ہے۔ وہ اس بات پر ان کا شکر گزار ہوتا۔ تعدد ازدواج اور نکاحِ موقت ختم ہے، کیونکہ یہ سب عورتوں کی ذمہ داری اور جواب دہی کا بوجھ ڈالنے والے کام ہیں۔

اگر آپ پوچھیں، کہ آج اور کل اس کھیل میں بازی جیتنے اور کھیل ہارنے والا کون ہے؟

افسوس کے ساتھ اس کا جواب یہ ہے کہ آج اور گذشتہ زمانے میں بھی جو بازی ہاری ہے۔ وہ خوش فہم اور سادہ دل ۔ جنسِ خاتون ۔ ہے ۔

ازدواج موقّت سے خلیفہ کی ممانعت :

ازدواجِ موقت ، فقہ جعفری کے خصوصیات میں ہے دوسرے فقہی سلسلے اسے جائز نہیں جانتے ۔ میں کسی انداز سے بھی شیعہ سنی بحث (جس نے اسلام کو کمزور کیا ہے) میں حصہ لینے کو تیار نہیں ہوں صرف مسئلہ کی مختصر تاریخ کی طرف اشارہ کرنا ضروری جانتا ہوں ۔

مسلمانوں کا اتفاق و اجماع ہے کہ صدر اسلام میں متعہ جائز تھا ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر میں ان مسلمانوں کو متعہ کی اجازت دی تھی جن کی بیویاں دور تھیں اس پر بھی اتفاق ہے کہ دوسرے خلیفہ نے اپنی خلافت میں متعہ کو حرام کر دیا تھا ۔ انھوں نے ایک مشہور جملہ فرمایا : " دو چیزیں زمانۂ پیغمبرؐ میں جائز تھیں میں ان دونوں کو حرام قرار دیتا ہوں ، جو بھی وہ دونوں کام کرے گا میں سزا دوں گا ۔ متعۂ زن ۔ اور متعۂ حج "[1]

اہلِ سنت کے ایک گروہ کے خیال میں ، رسول اکرمؐ نے آخر عمر میں خود ، متعہ کو ممنوع کر دیا تھا اور دوسرے خلیفہ کی ممانعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تھی لیکن جو عبارت جناب خلیفہ کی طرف سے نقل ہے وہ اس مدعا کے خلاف ہے ۔

اس مفہوم کی صحیح تعبیر وہی ہے جسے علامہ کاشف الغطا نے پیش کیا ہے ۔ خلیفہ بخیال خود یہ حق رکھتے تھے کہ وہ اس بارے میں پابندی لگا سکیں ۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے ولی امر کے دائرہ اختیار میں تھا اور جو حاکم وولی چاہے وہ تقاضائے وقت کے مطابق اس قسم کے اختیارات سے فائدہ اٹھائے ۔

---

[1] ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے شیخ عبدالحسین امینی مرحوم کی کتاب الغدیر جلد ششم ۔

دوسری لفظوں میں خلیفہ دوم کی ممانعت سیاسی تھی شرعی و قانونی نہیں تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اپنی قیادت کے زمانے میں صحابہ کے دور دراز علاقوں میں منتشر ہونے کو پسند نہ کرتے تھے، وہ تازہ مفتوحہ علاقوں میں پھیلنے اور نومسلم قوموں سے میل ملاپ کے بارے میں اپنی پریشانی نہ چھپاتے تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے انھیں مدینے سے باہر پھیلنے سے روکتے رہے۔ لہٰذا وہ اس بات کو بہت برا جانتے تھے کہ نومسلم جو ابھی اسلامی تعلیمات کی گہری تربیت سے آراستہ نہیں، ان کے خون سے ان مسلمانوں کے خون کی آمیزش ہو۔ وہ آیندہ نسل کے لیے اسے خطرہ سمجھتے تھے۔ کھلی سی بات ہے کہ یہ مصلحت وقتی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے مسلمان ان کی ممانعت کو ایک سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت سمجھ کر حکم مان گئے۔ نہ کہ دائمی قانون۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ خلیفۂ وقت یہ کہے کہ پیغمبرؐ نے یوں حکم دیا ہے اور میں یہ فرمان جاری کرتا ہوں، پھر مسلمان بھی اسے مان لیتے۔

لیکن بعد میں خصوصی واقعات کی وجہ سے "سیرتِ خلفاء ما سبق" خصوصاً پہلے دو خلیفہ۔ یہ اصول بن گیا اور تعصب اس درجہ پر پہنچ گیا، کہ اس نے قانون کی شکل حاصل کرلی۔ اس صورتِ حال میں خود ہمارے سنی بھائیوں پر جو اعتراض ہے وہ خود جناب خلیفہ سے زیادہ ہے۔ خلیفہ نے بطور سیاسی اور وقتی ضرورت کے ــــ جیسے ہماری صدی میں سرکار میرزائے شیرازی نے تمباکو نوشی حرام کی تھی[1] ــــ نکاحِ منقطع کو حرام کیا، دوسروں کو یہ حق نہ تھا کہ اسے دوامی قانون بنا لیتے۔

---

[1] ـ ناصر الدین شاہ قاچار نے برطانوی کمپنی سے ایران میں تمباکو کی پیداوار اور فروخت کے ٹھیکے کا معاہدہ کرلیا جو ایرانی عوام اور ملک کے لیے انتہائی خطرناک تھا اس وقت مرجع اعظم میرزا محمد حسن شیرازی نے تمباکو نوشی کی حرمت کا فتویٰ دے دیا، جو انقلاب اور برطانوی استعمار کے خلاف اس نتیجہ انقلاب پر منتج ہوا جس کے بعد مشروطہ قائم ہوئی۔

ظاہر ہے کہ علامہ کاشف الغطاؒ (شیخ محمد حسین)، کی نظر میں یہ بحث نہیں ہے کہ خلیفہ کا یہ دخل اصلاً صحیح تھا یا نہیں؟ یہ بھی زیر نظر نہیں کہ آیا مسئلہ متعہ ان مسائل میں ہے بھی جن پر خواہ تھوڑی ہی دیر کے لیے کیوں نہ ہو، مسلمانوں کا شرعی ولی قدغن لگا سکتا ہے یا نہیں؟ زاویہ نظر صرف یہ ہے کہ شروع میں جو بات ہوئی ہے، اس کا عنوان یہ تھا، اور یہی سبب ہے کہ مسلمانوں نے اس کی مخالفت نہیں کی۔

خلیفہ کی شخصیت اور اثر، عوام کا ان کی سیرت و رویہ کو اپنانا حکمرانی کے معاملے میں ان کے طور و طریقوں کا انداز سبب تھا کہ یہ قانون بھول کی نذر ہو گیا اور یہ دستور جو نکاح دائمی کی تکمیل کا ذریعہ تھا، ہمیشہ کے لیے متروک ہو گیا۔ نتیجہ میں متعدد مشکلات پیدا ہوئے۔

ائمہ معصومینؑ کو دین مبین اسلام کا محافظ سمجھا جاتا ہے اسی بنا پر ان حضرات نے اسلام کے اس دستور کو فراموشی اور گم نامی سے بچانے کے لیے بڑھ چڑھ کر تشویق کی۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ایک بات جسے بیان کرنے میں کبھی تقیہ نہ کروں گا، وہ مسئلہ "متعہ" ہے۔

اسی نکتے پر "تشریع متعہ" کی مصلحت و حکمت ثانوی حکمت اولی سے مل جاتی ہے۔ اور وہ ہے "متروک شدہ دستور" کا احیا۔ میرے نقطۂ نظر سے، جہاں جہاں ائمہ اطہارؑ نے شادی شدہ مردوں کو متعہ سے منع کیا ہے وہاں، "قانون کی حکمت اولیہ" کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ قانون متعہ ان لوگوں کے لیے وضع نہیں کیا گیا جن کو ضرورت نہیں ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے علی بن یقطین سے فرمایا: "تمھیں متعہ کرنے کی ضرورت کیا ہے، خدا نے تمھیں بے نیاز کیا ہے۔"

دوسرے شخص سے فرمایا: "متعہ اس کے لیے ہے جسے اللہ نے بیوی کے ہوتے ہوئے اس سے بے نیاز نہ کیا ہو۔ جس کی بیوی ہو وہ صرف اس صورت میں متعہ کر سکتا ہے جب اپنی بیوی پر دسترس

؎ شیخ محمد حسین ابن شیخ علی الکاشف الغطا المتوفی ۱۳۷۳ھ مشہور مصنف و فقیہ نجف۔

نہ رکھا ہو۔"

جہاں عمومی طور پر ترغیب و تشویق کی بات ہے وہاں اس قانون کی دوسری جہت سامنے رکھی گئی ہے، یعنی "متروک دستور کی بحالی" ورنہ فقط ضرورت مند افراد کو ترغیب و تشویق سے مقصد کا حصول کافی نہ تھا۔

شیعہ روایات سے یہ مطلب بخوبی واضح ہے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ قانون ساز کے پیش نظر، اور ائمہ طاہرینؑ کے سامنے ترغیب و تشویق کا مدعا جانور صفت انسانوں کے لیے ہوس رانی و حرم سرا سازی کا بہانہ مہیا کرنا نہ تھا، یہ بھی نہیں کہ چند ناواقفِ حال خواتین اور بے سرپرست بچوں کو جبر و مشکلات میں مبتلا کیا جائے۔

حضرت علی علیہ السلام کی ایک حدیث

زن روز شمارہ ۸۷ میں جناب مہدوی لکھتے ہیں، ابو زہرہ کی "کتاب الاحوال الشخصیہ" میں امیر المومنینؑ سے منقول ہے:

"لا اعلم احداً تمتع وھو محصنٌ اِلّا رجمته بالحجارة"

جناب مہدوی نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نا اہل آدمی نے متعہ کیا ہے میں اس پر "زنا محصن" کی حد، سنگساری کی سزا جاری کروں گا۔"

پہلی بات۔ اگر یہ طے کر لیا جائے کہ حضرت علیؑ کی حدیث کے سامنے ہمیں سر تسلیم خم کرنا ہی چاہیے، تو، حضرت کی اتنی حدیثیں جو شیعہ و غیر شیعہ کتابوں میں درج ہیں اور متعہ کی تائید و تاکید کرتی ہیں انھیں کیوں چھوڑا جائے اور ایک ایسی روایت۔ جس کے راوی علماء اہل سنت کے ایک عالم ہیں۔ قبول کر لی جائے، پھر اس کی بھی سند معلوم نہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام کے قیمتی ارشادات میں سے ایک یہ ہے:

"اگر عمر آگے نہ بڑھتے اور متعہ کو حرام نہ کرتے، تو بدنصیب افراد کے سوا کوئی زنا نہ کرتا۔"

یعنی اگر متعہ حرام نہ کیا جاتا تو غریزہ کے جبر سے متاثر ہو کر کوئی شخص زنا پر آمادہ نہ ہوتا۔ یہ کام وہی لوگ کرتے جو قانون شکنی کو ترجیح دینے کے عادی ہیں۔

دوسری بات ـــ مذکورہ بالا عبارت کے معنی ہیں:

"جب بھی مجھے معلوم ہوا کہ نااہل آدمی نے متعہ کیا ہے اسے سنگسار کروں گا۔"

مجھے نہیں معلوم، جناب مہدوی نے "محصن" کے معنی "نااہل" کہاں سے لکھ دیے جبکہ اس کے معنی ہیں "وہ شخص جس کی بیوی ہو"۔

بنابریں روایت کا مطلب ہے کہ جن کی شادی ہو چکی، بیوی موجود ہے، انھیں متعہ کرنے کا حق نہیں۔ اگر مقصد یہ ہوتا کہ متعہ کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، تو "وھو محصن" کی قید بے معنی ٹھہری گی۔ خیر۔ اگر اس روایت کی کوئی بنیاد ہے تو اس سے تائید ہوتی ہے اس نظریے کی جو کہتے ہیں:

"قانونِ متعہ ان لوگوں کے لیے وضع ہوا ہے جو عورت کے محتاج ہے مجرد ہیں، یا ان کی بیویاں ان کے پاس نہیں ہیں۔"

یعنی یہ روایت "متعہ" کے جواز کی دلیل ہے نہ کہ حرمتِ متعہ کی۔

تیسرا حصہ:

عورت اور معاشرتی آزادی

- ــــــ پیدا ہونے سے پہلے شوہر۔
- ــــــ لڑکیوں کا تبادلہ۔
- ــــــ حضرت علیؑ کی خواستگاری کے جواب میں آنحضرتؐ کا جواب "میں فاطمہؑ کے سامنے بات رکھوں گا۔
- ــــــ خواتین کا اسلامی انقلاب ۔ سفید ۔ تھا۔
- ــــــ اسلام کے نزدیک باپ مختار مطلق نہیں ہے .....
- ــــــ مرد بندۂ خواہشات، عورت اسیرِ محبت۔
- ــــــ اسلام نے عورت کو بے اختیار نہیں کیا۔ اس کو مردوں کی شکار دوستی سے بچایا ہے۔
- ــــــ بیٹی پر باپ ولایت ۔ ایک بحث۔

خلاصہ از مؤلفؒ

سرنوشت کے انتخاب میں آزادی

پریشاں و ہراساں لڑکی رسول اکرمؐ کے حضور میں پہنچی :

یا رسول اللہ ! اس باپ کے ہاتھوں ....

.... آخر تمہارے باپ نے کیا کیا ہے تجھ سے ؟

۔ ایک بھتیجے سے ، میرے مشورے کے بغیر میری شادی کر دی !

۔ اب تو وہ کر چکا ، تم چپ ہو جاؤ مخالفت نہ کرو ۔ تائید کر دو اور چچا زاد کی بیوی بن کر رہو ۔

۔ یا رسول اللہؐ ! چچا زاد سے مجھے محبت نہیں ، ایسے شخص کی بیوی کیسے بنوں جس سے محبت نہیں کرتی ؟

۔ اگر اس سے محبت نہیں ، کوئی بات نہیں ۔ تمہیں اختیار ہے ، جاؤ ، جس سے تمہیں محبت ہے اسے اپنا شوہر چن لو !

۔ اتفاقاً ، میں اس کو بہت چاہتی ہوں ۔ اس کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتی ۔ اس کے سوا کسی کی بیوی نہیں بن سکتی ۔ بات تو اتنی ہے کہ میرے والد نے مجھ سے رائے کیوں نہ لی ۔ میں جان کر حاضر ہوئی ہوں کہ آپ سے سوال جواب کروں اور یہ جملہ سن لوں ، خواتینِ جہاں کو بتا دوں کہ باپ بطور خود حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اپنی بیٹیاں جس کو ان کا دل چاہے اس کے حوالے کر دیں ۔

شہید ثانی[1] نے "مسالک" اور شیخ حسن[2] نے "جواہر الکلام" میں اور دوسرے فقہائے اہل سنت[3] کی یہ روایت نقل کی ہے۔ جاہلیت عرب میں غیر عربوں کی طرح باپ اپنی بیٹیوں، اپنی بہنوں بھی تو اپنی ماں کے بارے میں اپنا حق یہی سمجھتے تھے کہ جس سے چاہیں بیاہ دیں۔ اور خواتین بے اختیار تھیں۔ وہ اپنی پسند اور اپنے اختیار سے شوہر کا انتخاب نہیں کر سکتی تھیں۔ یہ اختیار ان کے خیال میں باپ کو پھر بھائی اور ان دونوں کی غیر موجودگی میں چچا کو حاصل تھا۔

اختیار کے استعمال کی حد یہاں تک پہنچی کہ لڑکیاں پیدا ہونے سے پہلے، مرد کے رشتے میں دے دی جاتی ہیں، لڑکی کے پیدا ہونے اور بڑی ہونے کے بعد اس مرد کو حق تھا کہ وہ لڑکی کو اپنے لیے جائے۔

جنم سے پہلے نکاح

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری حج تھا، ایک روز آپ ہاتھ میں کوڑا لیے سوار جا رہے تھے، ایک آدمی نے راستہ روک کر کہا:

— ایک شکایت ہے!

— بیان کرو!

— چند برس پہلے، جاہلیت کے دنوں میں، میں اور طارق ابن مرقع ایک جنگ میں شریک ہوئے، مصروفیات جنگ میں طارق کو نیزے کی ضرورت پڑی۔ اس نے پکار کر کہا: کوئی ہے جو مجھے نیزہ پہنچا کر مزدوری لے! میں آگے بڑھا اور پوچھا کیا صلہ دو گے؟ اس نے کہا، میرے یہاں

---

[1] شہید ثانی، زین الدین ابن علی ابن احمد العاملی (۹۱۱ - ۹۶۶ھ) کی کتاب فقہ مفصل کا نام ہے مسالک۔ شرح لمعہ بھی انھیں کی تالیف ہے۔

[2] جواہر الکلام، شرائع الاسلام کی مفصل شرح کے مصنف تھے شیخ محمد حسن نجفی متوفی ۱۲۶۶ھ۔

[3] سنی کتابوں میں دیکھیے السنن، ابن ماجہ ج ۱ ص ۵۰۸

شیعہ کتابوں میں دیکھیے جواہر الکلام، چاپ بیروت ج ۲۹ ص ۱۷۷

جو لڑکی پیدا ہوگی وہ تمھاری، اسے پال پوس کر جوان کروں گا۔ میں نے صلہ منظور کر لیا اور اپنا نیزہ اسے دے دیا۔ قصہ ختم ہوا، جنگ کو کئی برس گذر گئے۔ ایک دن خیال آیا، خبر پوچھی، معلوم ہوا اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اب وہ شادی کے قابل ہے۔ میں طارق کے پاس گیا اور وہ بات یاد دلائی اور اپنے قرض کا مطالبہ کیا۔ اس نے حیلے حوالے اور بہانے کرنے شروع کر دیے۔ وہ مجھ سے دوبارہ مہر لینے کی فکر میں ہے۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، یہ فرمائیے میں حق پر ہوں یا وہ؟

— لڑکی کا سن کیا ہے؟

— لڑکی بڑی ہو چکی ہے، سر کے بال بھی سفید ہو چکے ہیں۔

— اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو حق پر تم ہو، نہ طارق۔ غریب عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دو، اور تم اپنا کام کرو۔

وہ آدمی حیران ہوا، پیغمبر علیہ السلام کو دیکھتا رہا۔ سوچ رہا تھا، یہ کیسا فیصلہ ہے۔ باپ کو اپنی بیٹی پر اختیار نہیں۔ میں لڑکی کا نیا مہر، باپ کو دے دوں اور وہ اپنی خوشی و رضامندی سے اپنی لڑکی میرے حوالے کر دے تو غلط کام ہوگا۔؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی پھٹی پھٹی نگاہوں کو دیکھ کر سمجھ گئے، اس پریشانی خیال کو ملاحظہ فرما کر کہا:

— "پریشان نہ ہو، میں نے جو بات کہی ہے اس سے نہ تم گنہ گار ہو گے نہ تمھارا دوست طارق۔"

لڑکیوں کا ادلہ بدلہ:

لڑکیوں پر باپ کے مکمل اختیار کا ایک مظہر نکاحِ "شغار" تھا۔ "نکاح شغار" یعنی لڑکیوں کا عوض معاوضہ۔ دو آدمیوں کی دو لڑکیاں شادی کے قابل ہوں۔ لوگ ان کا ادل بدل کرتے تھے۔ یعنی ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر بنتی تھی۔ اسلام نے یہ دستور، منسوخ کر دیا۔

رسول اللہؐ نے اپنی صاحب زادی حضرت زہراؑ کو انتخاب شوہر میں آزاد رکھا

حضرتِ علی علیہ السلام طلب گاریِ حضرت زہراؑ مرضیہؑ کے لیے حاضر ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو جواب دیا، اب تک کئی آدمی طلب گاری کے لیے آئے، میں نے خود ان کی بات زہراؑ سے کہی، انھوں نے چہرے کے آثار سے اظہار نامنظوری کیا۔ اب میں تمھاری بات بھی کہوں گا۔

پیغمبرؐ، فاطمۂ زہراؑ کے پاس گئے اور پیاری بیٹی کو رشتے کا آیا ہوا پیام سنایا۔ سیدۂ عالمیان نے، منہ نہ پھیرا اور خاموش بیٹھی رہیں، سکوت سے رضامندی کا اظہار دیکھ کر آنحضرتؐ تکبیر کہتے ہوئے فاطمہؑ کے پاس سے اٹھ کر باہر آئے۔

اسلامی تحریک میں خواتین کا انقلاب سفید

خواتین کے لیے اسلام نے بہت بڑی خدمتیں انجام دی ہیں۔ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ بیٹی پر باپ کے تمام تر اور مکمل اختیارات واپس لے لیے۔ بلکہ اسلام نے عورت کو مکمل آزادی اور شخصیت عطا کی۔ فکر و نظر کو آزادی بخشی، عورت کے طبیعی حقوق کو قانونی حیثیت دی۔ حقوقِ خواتین کے بارے میں اسلام نے جو اقدامات کیے ہیں اور یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے، دوسرے ممالک جو اس کی رَو میں بہہ رہے ہیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو اساسی طور پر دو فرق ملیں گے۔

ایک تو زن و مرد کے نفسیات کے زاویۂ نظر سے فرق ہے۔ اسلام نے اس سلسلے میں معجزہ دکھایا۔ ہم آیندہ اوراق میں اس پر گفتگو کریں گے اور کچھ مثالیں سامنے رکھیں گے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خواتین کو ان کے انسانی حقوق، ان کی شخصیت و حیثیت و آزادی و خود مختاری دے رہا تھا۔ اس لمحہ جنسِ مرد سے انھیں بغاوت سرکشی و نافرمانی پر نہیں ابھارا اس نے کبھی بھی مردوں سے بدبینی اور ان کے بارے

میں غلط اندیشی کی تحریک نہیں کی۔

خواتین کا انقلاب سفید تھا، سیاہ، سرخ، نیلا اور بنفشی نہ تھا۔ یہ انقلاب بیٹیوں سے باپ کا احترام اور بیویوں سے شوہروں کا احترام چھیننے نہیں آیا۔ اسلام کے انقلاب نے گھریلو زندگی کی بنیاد نہیں ہلائی، بیویوں کو شوہروں کی خبرگیری اور ماں کو تربیت اولاد سے بدظن نہیں بنایا، بے شادی شدہ لڑکوں کے لیے ایسے وسائل نہیں پیدا کیے جن کے سہارے وہ معاشرے میں مفت کے شکار کھیل سکیں، خواتین کو شوہروں کی پاک آغوش اور بیٹیوں کو ماں باپ کے سایۂ مہر و محبت سے نکال کر افسروں اور سرمایہ داروں کے حوالے نہیں کیا۔ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا کہ آنسوؤں کے سمندر میں طوفان اٹھے۔ ہائے، گھر کا امن و سکون تباہ ہوگیا، باپ کے دل سے اطمینان چھن گیا۔ اس افراتفری میں آدمی کیا کرے؟ نومولود بچوں کا قتل، اسقاط، کا علاج کیا ہے؟ چالیس فی صد ناجائز بچوں کی پیدائش کا حل کیا ہے؟ نومولود بچے، جن کا باپ نہیں ملتا، ماؤں نے یہ بچے اپنے گھروں میں جنے ہیں۔ چاہنے والے باپ کے گھر میں پیدا نہیں ہوئے۔ ان کا اس بچے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بچہ "پرورش گاہ" کے حوالے کر دیا جاتا ہے، وہاں کوئی ان کی خبر لینے نہیں آتا۔

ہمارے ملک میں "خواتین کے انقلاب" کی ضرورت ہے۔ لیکن سفید اسلامی انقلاب، مغربی کالی کلوٹی انقلابی تحریک درکار نہیں۔

ایسا انقلاب جس میں شہوت پرست جوانوں کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ وہ انقلاب جو براہ راست اسلام کے اعلیٰ تعلیمات سے مستفید ہو۔ یہ نہیں کہ اس کا مدعا صرف "قانون مدنی" بدلنا ہو۔ یعنی اسلام کے مسلمہ قوانین ہوا و ہوس کا نشانہ بنائے جائیں۔ وہ انقلاب جس کی پہلی منزل عمیق اور گہرا مطالعہ ہو۔ تاکہ یہ بات کھل کر سامنے آئے کہ جس معاشرے کا نام اسلام سے وابستہ کیا گیا ہے، وہ کس حد تک اسلام کو نافذ کرتا ہے۔

خدا کی توفیق سے اگر یہ سلسلۂ مضامین باقی رہا تو اہم مسائل کو مکمل کرنے کے بعد خواتین کے

اسلامی انقلاب کا ایک پروگرام شائع کروں گا جس سے واضح ہو گا کہ ایرانی خواتین واقعاً ایک ایسا انقلاب لا سکتی ہیں، جو نیا اور دنیا پسند بھی ہو اور منطقی و با دلیل ہونے کے ساتھ ساتھ چودہ سو سالہ اسلامی تعلیمات کے سرچشمے سے سیراب بھی ہو جس میں مغرب کی طرف بھیک کا ہاتھ نہ پھیلایا گیا ہو۔

باپ کی اجازت: باپ، لڑکی کا ولی ہے۔ یعنی، کیا دوشیزہ لڑکیاں جو پہلی مرتبہ شادی کرنا چاہیں انھیں باپ کی اجازت لینے کی شرط ہے یا نہیں؟

اسلام کی نظر میں چند باتیں طے شدہ ہیں: لڑکا اور لڑکی اگر اقتصادی طور پر خود کفیل ہوں بالغ و عاقل، نیز "رشید" بھی ہوں۔ یعنی معاشرتی لحاظ سے ان کا فکری معیار اس قدر ہو جس کی بنیاد پر وہ اپنے مال کا تحفظ و نگہداشت کر سکیں، ان کا سرمایہ ان کے ہاتھ میں رہ سکے۔ تو ماں یا باپ، ماں یا شوہر، بھائی یا کسی دوسرے آدمی کو ان پر نظارت و دخل اندازی کا حق نہیں ہو سکتا۔

دوسری طے شدہ بات شادی کے بارے میں ہے۔ اولاد، بالغ ہونے کی عمر پر پہنچ جائے، عقل و رشد بھی ہو۔ تو اپنے بارے میں وہ خود مختار ہیں، کسی کو ان کے معاملات میں دخل دینے کا حق نہیں۔ لڑکیوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی ایک مرتبہ شوہر کر چکی ہے اور اب بیوہ ہے تو وہ بھی لڑکے کی طرح خود مختار ہے اور کسی کو اس کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ ہاں اگر دوشیزہ ہے اور اس کا پہلا نکاح ہے تو...؟

باپ کو مکمل اختیار نہیں، لڑکی کا عندیہ اور اس کی رضامندی کے بغیر جس کے ساتھ بیاہنا چاہے نہیں بیاہ سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم نے دیکھا باپ نے بیٹی کی رائے کے بغیر نکاح کر دیا تو آپ نے فرمایا: "پسند نہیں تو دوسرے کے ساتھ

شادی کر سکتی ہو۔" ۔ فقہا میں اس نقطۂ نظر سے اختلاف ہے کہ آیا دوشیزہ لڑکیاں، باپ کی رضامندی حاصل کیے بغیر شادی کا حق نہیں رکھتیں؟ یا باپ کا اتفاق رائے کسی طرح شرط صحت نکاح نہیں ہے؟

البتہ ایک مسئلہ قطعی و مسلّم ہے، کہ اگر باپ کسی سبب کے بغیر لڑکی کے نکاح کو منع کریں تو ان کا حق (ولایت) ساقط ہو جاتا ہے۔ اور باتفاقِ تمامِ فقہا، لڑکی انتخاب شوہر میں مکمل آزادی کی مالک ہیں۔

رہا یہ کہ آیا باپ کی رضامندی شرط ہے، یا نہیں؟ ہم نے بتایا کہ فقہا میں اختلاف ہے۔ شاید اکثر فقہا خصوصاً متاخرین علما (آخری دور کے فقہا)، باپ کی رضامندی کو شرط نہیں جانتے، مگر بعض علما متأخر، شرط جانتے ہیں۔ ہمارے "قانونِ مدنی" نے دوسرے گروہ کے فتوے کو قانون بنایا ہے کیونکہ احتیاط کا راستہ یہی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے کیونکہ مسئلہ مورد اتفاق نہیں اس لیے ہم اسلامی نقطۂ نظر سے بحث بھی نہیں کرتے۔ البتہ، معاشرتی لحاظ سے بحث ضروری سمجھتا ہوں اس کے علاوہ میری رائے میں "قانون مدنی" نے صحیح راہ اختیار کی ہے۔

مرد بندۂ شہوت اور عورت اسیرِ محبّت ہے:

بن بیاہی لڑکیوں پر لازم ہے۔ کم از کم ان کے لیے اچھا ضرور ہے۔ کہ باپ کی ہم خیالی کے بغیر کسی مرد سے شادی نہ کریں۔ اس کا فلسفہ یہ نہیں ہے کہ لڑکی کو ناقص، اور معاشرتی لحاظ سے اس کا شعور مرد سے کمتر سمجھا گیا ہے۔ اگر یہی بات ہوتی تو سولہ برس کی بیوہ اور اٹھارہ برس کی بن بیاہی میں فرق کیا ہو گا، سولہ برس کی عمر والی بیوہ ہو باپ کی رضامندی کی پابند نہ ہو اور اٹھارہ برس کی بن بیاہی رضاء پدر کی پابند ہو۔ پھر یہ بات بھی دیکھیے، اگر لڑکی اسلام کی نظر میں اپنے معاملات میں ناقص سمجھی جاتی تو بالغہ و رشیدہ لڑکی اپنے مالی امور اور ملینوں، بلینوں سرمایے کے معاملے میں، باپ بھائی

اور شوہر کے راضی ہونے یا اجازت لینے کی پابند کیوں نہیں؟ اور انھیں دخل دینے کا حق کیوں نہیں؟ اس کے اقدامات صحیح اور وہ سب سے بے نیاز کیوں ہے؟ دراصل یہاں ایک دوسرا فلسفہ ہے۔ فقہی دلائل سے قطع نظر۔ اس فلسفے کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور "قانونِ مدنی" تیار کرنے والوں کی اس بنیاد پر داد دینا چاہیے۔

بات، عورت میں کمی یا عقلی و فکری نقص ہی کی نہیں۔ اس کا تعلق مرد و عورت کے نفسیات سے ہے۔ اس کا ربط ایک طرف مرد کی فطرتِ شکار پسندی اور دوسری طرف عورت کے حسنِ ظن سے ہے وہ مرد کی وفا، سچائی اور محبت پر جلدی سے ایمان لے آتی ہے۔ مرد، خواہشات کا غلام اور عورت اسیرِ محبت ہے، مرد کے پیر شہوت سے لڑکھڑا جاتے ہیں مگر ماہرینِ نفسیات کے بقول عورت، جنسی خواہشات کے بارے میں مرد سے زیادہ صابر و پائدار ہے۔ ہاں، عورت کو چت کرنے والی چیز اظہارِ محبت و خلوص، وفا و خلوص ہے وہ مرد سے یہ باتیں سن کر لڑکھڑا جاتی ہے۔ عورت کی خوش فہمی یہاں کھل جاتی ہے۔ عورت جب تک بن بیاہی ہے، جب تک اس کے لباس نے مرد کا صابن مَس نہیں کیا، اس وقت تک وہ مرد کے زمزمۂ محبت کو جلدی سنتی اور ماننے لگتی ہے۔

معلوم نہیں آپ نے "زن روز" کے شمارہ نمبر ۹۰ میں، امریکی ماہرِ نفسیات کا مضمون پڑھا یا نہیں؟ پروفیسر "ریگ" کے مضمون کا عنوان تھا "عورت و مرد کے لیے دنیا ایک جیسی نہیں ہے"۔ پروفیسر لکھتا ہے کہ بہترین فقرہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ ہے۔ پیاری! میں تمھیں چاہتا ہوں"۔ روزمرہ و محاورہ۔ پھر "ریگ" نے لکھا۔ ایک عورت کے واسطے سب سے بڑی خوش نصیبی، ایک مرد کا دل موہنا، اس کی زندگی بھر دیکھ بھال ہے"۔

رسولِ اکرمؐ، وہ نفسیات کے خدائی ماہر، اس حقیقت کو چودہ سو برس پہلے بیان کرچکے ہیں۔ آپ نے فرمایا: "میں تمھیں چاہتا ہوں۔ ایسا جملہ ہے جو عورت کے دل سے نہیں نکلتا۔

شکاری مرد، عورت کی اس نفسیاتی کمزوری سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "پیاری"

ہم تو تمھارے عشق میں مر رہے ہیں"۔ مردوں کے ہتھکنڈوں سے ناواقف لڑکیوں کے لیے یہ بہترین جال ہے۔

"زن روز" کے تازہ شماروں میں، افسر نامی خاتون کی داستان چھپ رہی ہے۔ یہ خاتون خودکشی کرنا چاہتی ہے۔ جواد نے اس کو فریب دے رکھا تھا، بات کچہری تک پہنچی اور زبان زد عام ہو گئی۔ جواد نے افسر کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے، مذکورہ فارمولے سے فائدہ اٹھایا، بقول رسالۂ زن روز، افسر کہتی ہے:

"میں نے اس سے بات تو نہیں کی، مگر ہر ساعت اور ہر لمحے اسے دیکھنے کو ترپتی تھی میں تو عاشق نہ تھی، مگر جس عشق کا اظہار وہ کرتا تھا اس سے میری روح کو نیازمندی ضرور تھی۔ ساری عورتوں کا حال یہی ہے "عشق" کو پسند کرنے سے پہلے "عاشق" پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ لڑکیوں اور خواتین کی پیدائش سے پہلے، عاشق ان کے بعد عشق پیدا ہوتا ہے۔ اس قانون سے میں بھی مستثنیٰ نہ تھی۔"

تجربہ کار، بیوہ پر یہ تازہ واردات بیت گئی تو ناتجربہ کار لڑکیوں کا حال کیا ہوگا۔ یوں لازم قرار پایا کہ "مرد ناآموزدہ" لڑکی باپ کی رضامندی بہرحال حاصل کرے۔ باپ مرد کے احساسات، جذبات و نفسیات سے بہتر آگاہ ہوتے ہیں۔ چند افراد و حالات کو چھوڑ کر، باپ اپنی بیٹی کی خیر خواہی کے طلب گار ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان سے مشورہ مفید و لازم ہے۔

قانون، اس نکتے پر کسی انداز سے بھی عورت کی توہین نہیں کرتا۔ اس نے تو حمایت کا ہاتھ کاندھے پر رکھا ہے۔ اگر لڑکا دعویٰ کرے کہ قانون نے انھیں باپ یا ماں کی رضا حاصل کرنے کا پابند کیوں نہیں کیا۔ تو ان کا دعویٰ منطق کے خلاف نہ ہوگا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو لڑکیوں کی ہم آہنگی پدر پر معترض ہیں۔

تعجب کرتا ہوں، لوگ روزانہ "بیوک و زہرہ" "عادل و نسرین" کے افسانے

اور ڈرامے دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ پھر لڑکیوں کو اولیا کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔

ان کے کردار میں تضاد محسوس کرتا ہوں۔ عورت کے بارے میں ان کی ہمدردی و غم خواری دیکھیے، پھر سکاریوں کے لیے سکار تیار کرتے، گولیاں دیتے اور لڑکیوں کے گلے کو ہنکا کر نشانے پر پہنچاتے ہیں۔

○

"زنِ روز" شمارہ ۸۸ میں چالیس نکاتی قرارداد کے مصنف نے کہا ہے:

"دفعہ ۱۰۴۳۔ بلوغ ورشد سے متعلق تمام دفعات، کی مخالف اور ان کو توڑنے والی دفعہ ہے۔ نیز آزادیِ انسان اور منشور اقوام متحدہ کے خلاف ......"

معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے سوچ رکھا ہے کہ مذکورہ دفعہ باپ کو حق دیتی ہے وہ جسے چاہیں اپنی بیٹی دے دیں اور انھیں بلاوجہ شادی روکنے کا بھی حق ہے۔

باپ غلط اندیش اور بدنیت نہ ہو، جو لڑکی کو شادی ہی نہ کرنے دے۔ اس صورت میں لڑکیوں کو بااختیار مان کر شادی کے صحیح ہونے کی شرط باپ کی رضامندی مان لی جائے تو کیا خرابی ہے، اور انسانی آزادی کے منشور کی کیا خلاف ورزی ہے؟ یہ تو ایک احتیاطی اقدام اور پیش بندی ہے۔ ان خواتین کے لیے جن کا سابقہ تجربہ کچھ نہیں ہے۔ اور مرد کی جبلّت و طبیعت کے بارے میں بے اطمینانی کی وجہ سے یہ احتیاطی تدبیر کی گئی ہے۔

مضمون نگار کہتے ہیں:

"ہمارے قانون ساز نے تیرہ برس کی لڑکی کو شادی کے قابل قرار دیا ہے۔ ابھی اس کی فکری نشوونما پوری نہیں ہوئی۔ اصولاً اسے شادی کے معنی اور بیوی بننے اور شوہر بنانے کا مطلب بھی نہیں آتا۔ ایسی مخلوق جو دو چار سیر ترکاری بھی نہیں خرید سکتی اسے حق ہے کہ شادی کرے اور زندگی بھر کا ساتھی قبول کرے۔ اس کے مقابلے میں پچیس یا چالیس سالہ خاتون، تعلیم یافتہ، یونیورسٹی کی ہوا کھائے، اعلیٰ درجے کی دانش ور کو شادی کا حق نہیں،

بلکہ ضروری ہے، وہ بے پڑھے باپ یا دادا سے اجازت اور رائے حاصل کرے ...."

پہلے تو قانون کے کس جز سے آپ نے یہ دریافت کیا کہ تیرہ برس کی لڑکی باپ کی اجازت لیے بغیر شادی کر سکتی ہے اور پچیس یا چالیس برس کی لڑکی " دانش گاہ دیدہ "خاتون شادی نہیں کر سکتی۔ دوسرے یہ ہے کہ باپ کی اجازت انھیں حدود میں ہے جہاں وہ جذبۂ پدری اور مرد کے ان احساسات کا اندازہ کر سکے جو عورتوں کے بارے میں ہوا کرتے ہیں لیکن اگر رکاوٹ بننے کا روپ دھارے تو اس کی اجازت بے قیمت ہے۔

تیسرے میں نہیں سمجھتا کہ عہد قدیم سے آج تک کوئی ایسا جج پیدا ہوا اور دکھائی دیا ہو جس نے "قانونِ مدنی" کی رو سے کہا ہو کہ فکر و عقل کی پختگی (رشد عقلی) شادی میں شرط نہیں ہے۔ اور بقول مضمون نگار، تیرہ سالہ لڑکی جسے شادی اور انتخابِ شوہر کے معنی معلوم نہ ہوں وہ شادی کر سکتی ہے۔

قانون مدنی، دفعہ ۲۱۱ میں ہے:

"دو معاملہ کرنے والے اہل سمجھے جائیں، اس کے لیے بالغ و عاقل و رشید ہونا چاہیے۔"

قانون کے اس فقرہ میں اگرچہ "معاملہ کرنے والے" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور بابِ نکاح - معاملہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ایک مجموعی عنوان ہے۔ "عقود، معاملات، پابندیاں" یہ پیراگراف دفعہ ۱۸۱ سے شروع ہوتا ہے۔ قانونِ مدنی کے ماہرین نے دفعہ ۲۱۱ کو "اہلیتِ عام" — عمومی صلاحیت — کے طور پر مانا ہے۔ یہ اہلیت تمام "عقود" میں (جہاں جہاں صیغۂ معینہ جاری کیا جائے) لازمی قرار دی ہے۔

تمام پرانی دستاویزوں اور نکاح ناموں میں "بالغ و عاقل و رشید" کے بعد شوہر کا نام اور "بالغہ، عاقلہ و رشیدہ" کے بعد بیوی کا نام لکھا ہوا موجود ہے۔ "قانون مدنی" کے مرتب کرنے والے اس نکتے سے کیونکر غافل رہ سکتے تھے۔

"قانونِ مدنی" کے مرتبین باور نہیں کر سکتے تھے کہ فکری گراوٹ یہاں تک پہنچے گی کہ "عمومی اہلیت" بیان کرنے دینے کے باوجود، باب نکاح میں دوبارہ "بلوغ و عقل و رشد" کے لیے ایک دفعہ لکھنا چاہیے۔

دفعہ ۱۰۶۴ پر قانونِ مدنی کے ایک شارح، جناب ڈاکٹر سید علی شائگان، فرماتے ہیں: "عاقد کو بالغ و عاقل و بااراده ہونا چاہیے"۔ موصوف نے سوچا کہ اس کا تعلق میاں بیوی سے ہے اور آگے ان نکاح کی اہلیت کا بیان ہے۔ رشد کا تذکرہ موجود نہیں لہٰذا فیصلہ کر دیا کہ مذکورہ دفعہ، دفعہ ۲۱۱ کے خلاف ہے، جس میں عام اہلیت کا تذکرہ ہے۔ یہ کہنے کے بعد توجیہ کرتے ہیں کہ دفعہ ۱۰۶۴ اگر "عاقد" کے بارے میں ہے اور وہاں ضروری نہیں کہ "رشید" ہو۔

یہاں محلِ اعتراض ایرانی عوام کا طریق کار ہے، نہ قانون مدنی پر اعتراض ہو سکتا ہے نہ قانونِ اسلام پر۔ ہمارے عوام کی اکثریت میں اب بھی دورِ جاہلیت کی طرح باپ اپنے تئیں مکمل اختیار کا مالک سمجھتے ہیں۔ اور انتخاب شوہر و شریک زندگی، اور نسل آیندہ کے باپ کے بارے میں لڑکی کی رائے کا اظہار، بے حیائی و تہذیب کے خلاف جانتے ہیں۔ فکری پختگی (رشدِ فکری)، جسے لڑکی کے بارے میں اسلام مسلّم جانتا ہے۔ توجہ کے قابل نہیں سمجھتے۔ کتنے ہی نکاح ہیں جو لڑکیوں کے رشد سے پہلے ہو چکے، حالانکہ وہ غیر مؤثر اور شرعاً باطل تھے۔

عقد کرنے والے، لڑکی کے رشد کے بارے میں چھان بین کرتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک لڑکی کا بالغ ہونا کافی ہے۔ دراں حالیکہ بڑے بڑے علما کے بہت سے واقعات ہمارے علم میں ہیں، انھوں نے لڑکیوں کے عقلی و فکری پختگی کے تجربے کیے ہیں۔ کچھ علما، لڑکی میں رشدِ دینی (دینی پختگی)، کو شرط مانتے ہیں۔ یہ علما صرف انھیں لڑکیوں کا عقد پڑھتے تھے جن کو اصولِ دین پر استدلال کرنا آتا تھا۔ افسوس، آج کل بچوں کے اکثر ولی اور نکاح کرنے والے ان باتوں کا خیال نہیں رکھتے۔

عوام کے روّیوں پر گفتگو چونکہ مطلوب نہیں، لہٰذا سارے پیالے پیالیاں "قانونِ مدنی" کے سر پر توڑنا چاہیے، عوام کے ذہن اس "قانونِ مدنی" کے خلاف کرنا چاہیے جو قوانینِ اسلام سے پیدا ہوا ہے۔

میری نظر میں "قانونِ مدنی" پر جو اعتراض ہوتا ہے وہ دفعہ ۱۰۴۲ سے مربوط ہے یہ دفعہ کہتی ہے:۔

"پندرہ برس پورے کرنے کے بعد بھی لڑکیاں جب تک اٹھارہ سال کی نہ ہو جائیں اس وقت تک ولی کی اجازت کے بغیر شوہر نہیں کر سکتیں۔"

اس دفعہ کی رو سے، پندرہ اور اٹھارہ برس کے درمیانی عمر کی بیوہ بھی بلا اجازت ولی، شادی نہیں کر سکتی۔ حالانکہ فقہِ شیعہ اور عقلی بنیاد پر، جو عورت شرائط کے مطابق بالغہ و رشیدہ ہے۔ ایک مرتبہ شادی کر چکی ہے تو اسے باپ کی اجازت و رضا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

چوتھا حصّہ :

اسلام اور بدلتی زندگی

- —— وقت کے تقاضے۔
- —— دین اور وقت کے تقاضے نہرو کی نظر میں۔
- —— اسلام کا زندگی کی ترقیوں سے انطباق، غیروں کے لیے تعجب آفریں ہے۔
- —— اسلام نے مستقل ضروریات کے مستقل ضابطے اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کے لیے غیر مستقل ضابطوں کو پیش نظر رکھا ہے۔
- —— اگر ہر چیز کو زمانے سے منطبق (ہم آہنگ) کریں تو خود زمانے کو کس سے ہم آہنگ بنائیں ؟
- —— زمانے سے اسلام کی ناہم آہنگی، ایک گروہ کے جمود اور ایک گروہ کی جہالت کا نتیجہ ہے۔
- —— قرآن نے، اسلامی معاشرے کی تشبیہ اس سبزے سے دی ہے جو پھک رہا ہو۔
- —— "صدی کی پیداوار" ایسی اصطلاح ہے جس نے بہت سے خاندان تباہ کر دیے۔

- —— جامد (غیر متحرک) ہمیشہ پرانی چیزسے جوڑ کھاتی ہے اور جاہل ہر تباہی کا سبب تقاضائے زمانہ بتاتے ہیں۔
- —— قوانین اسلام کی تکنیک میں ایسے جوڑ اور موڑ ہیں جن کی بدولت اس میں حرکت اور مڑنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے۔
- —— ہیٹ پہننا حرام نہیں، دم چھلا بننا حرام ہے۔
- —— اسلام "قاعدۂ ضرر" و "قاعدۂ حرج" کے لئے "ویٹو" کا قائل ہے۔

(خلاصہ از مؤلف)

اسلام اور بدلتی زندگی

(۱)

زمانے کے تقاضے: مقدمۂ کتاب "انسان دسرنوشت" میں، مسلمانوں کے عروج وزوال کے مسئلے پر بحث کرچکا ہوں۔ وہاں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں موضوع کے تین حصے کرکے بحث و تحقیق کی ہے.

اسلام کا حصہ۔ مسلمانوں کا حصہ۔ اجنبی عوامل کا حصہ۔

اس مقدمہ میں جن ستائیس نکات پر تحقیق کی ضرورت پر زور دیا ہے، ایک موضوع یہ بھی ہے۔ میں نے وہاں وعدہ کیا ہے کہ "اسلام اور مقتضیاتِ زمان" پر ایک کتابچہ لکھوں گا چنانچہ کچھ نوٹ بہت دنوں سے تیار کر رہا تھا۔

مقالات کے اس سلسلے میں، سب باتیں تو لکھنا مشکل ہیں، تفصیل کے لیے تو مستقل کتاب ہی ہونا چاہیے۔ ہاں، اس موضوع پر یہاں اتنا ضرور لکھوں گا جو مختصر طور پر قاری کے ذہن کو منور کر دے۔

مذہب و ترقی۔ ایسا موضوع ہے، ہم مسلمانوں سے پہلے، اور ہم سے زیادہ دوسرے مذاہب واہل مذاہب کے سامنے آتا رہا ہے۔ دنیا کے بہت سے روشن دماغ اس لیے مذہب چھوڑ بیٹھے کہ ان کے خیال میں مذہب اور آئے دن بدلتی ہوئی زندگی میں جوڑ نہیں بیٹھتا۔ دونوں ہم آہنگ نہیں ہوسکتے۔ ان کی سوچ میں دینداری، ٹھہراؤ اور سکون کا نام ہے۔ مذہب حرکت اور تبدیلی سے برسرپیکار رہتا ہے۔ دوسری عبارت میں، وہ سمجھتے ہیں کہ مذہب، ثبات، یک رخی، اور شکل وصورت کی یکسانیت چاہتا ہے۔

آنجہانی نہرو، ہندوستان کے وزیر اعظم، مذہب کے خلاف تھے۔ اور (بقول خود) کسی دین و مذہب کے قائل نہ تھے۔ ان کی باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذہب کے جمود اور اس کے منفرد رویّے سے بیزار ہو گئے تھے۔ نہرو، زندگی کے آخری دور میں اپنے اندر اور پوری دنیا میں ایک خلا محسوس کرنے لگے تھے۔ ان کے خیال میں یہ خلا روحانی طاقت ہی سے پر ہو سکتا تھا اس کے باوجود، مذہب کے منفرد رویّے اور اس کے جمود کی بنا پر۔ بخیال خود۔ ہر مذہب سے گھبراتے تھے۔

"کرنجیو" ایک ہندی نامہ نگار نے ان کی آخری عمر میں ایک انٹرویو لیا۔ جو فارسی میں چھپ چکا ہے۔ غالباً یہ ان کے آخری نظریات تھے جو دنیا کے مجموعی حالات پر انھوں نے ظاہر کیے۔

"کرنجیو" گاندھی کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے کہتا ہے:

چند روشن خیال و ترقی پسندوں کا خیال ہے کہ گاندھی جی نے آپ کے نفسیاتی اور روحانی احساسات میں تبدیلی پیدا کی اور آپ کے فکری سوشلزم کو متاثر اور کمزور کر دیا؟

نہرو نے کہا:

..... روحانی اور باطنی رویّوں سے فائدہ اٹھانا ضروری اور اچھا ہے۔ میں اس بارے میں گاندھی کے عقیدے سے متفق تھا، اور اب ان وسائل سے فائدہ اٹھانے کو زیادہ ضروری سمجھتا ہوں، اس دور میں روحانی خلا کی وجہ سے نئے تمدن نے فروغ حاصل کر لیا ہے۔ ہمیں کل کے مقابلے میں آج روحانیت سے جواب لینے کی ضرورت زیادہ ہے۔

کرنجیو، مارکسزم کے بارے میں سوالات کرتا ہے اور نہرو مارکسزم کی نارسائیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دوبارہ اسی روحانی راہوں کی بات کرنے لگے۔ کرنجیو نے سوال کیا:

مسٹر نہرو! اس وقت آپ کے تاثرات جن میں اخلاقی و روحانی طریقوں سے

مسائل کا حل ممکن سمجھتے ہیں، تو کیا جناب والا، اور کل کے جواہر لال میں ۔ نہرو کی جوانی ۔ کوئی فرق نہیں پیدا ہوا؟ آپ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر نہرو عمر کے سورج ڈھلتے خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہیں ۔

نہرو:

جی ہاں، تبدیلی تو محسوس کرتا ہوں۔ مشکلات حل کرنے کے بارے میں جن اخلاقی و روحانی معیاروں کی بات کر رہا ہوں وہ بے فکری و نادانستہ حالت میں نہیں ہیں . . . . . .

اب یہ سوال ہے کہ اخلاق و روحانیت کو بلند سطح پر لایا کیسے جائے ۔

اس کا جواب خود ہی دیا۔ سامنے کی بات ہے اس مقصد کے لیے مذہب موجود ہے ۔ افسوس، مذہب کوتاہ نظری، اور خشک رسم و رواج اور جسم بے روح بن چکا ہے ۔ کچھ تکلفات ہیں اور ظاہری شکل وصورت اور اوپری خول رہ گیا ہے ۔ اس کی روح اور حقیقی مقصد ختم ہو چکا ہے ۔

اسلام اور وقت کے تقاضے:

دنیا بھر کے مذاہب و ادیان میں کسی مذہب نے انسان کی زندگی میں اتنا دخل نہیں دیا جس قدر اسلام کا عمل دخل ہے ۔ اسلام نے اپنے پروگرام میں، چند عبادتوں اور کچھ ذکر و اذکار، پھر اخلاقی نصیحتوں ہی کو نہیں رکھا ہے ۔ وہ تو جس طرح، اللہ اور بندے کے روابط پر روشنی ڈالتا ہے اسی طرح بندگانِ خدا کے تعلقات، انسانوں کے رشتے، ان کے حقوق، فرائض اور ایک فرد کے دوسرے فرد، ایک فرد کے معاشرے سے رنگا رنگ تعلقات بھی دکھاتا اور بتاتا ہے ۔ اسی وجہ سے " زمانے " کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کے مقامات زیادہ موجود ہیں ۔

اتفاقاً، بیرونی دنیا کے بہت سے مفکروں اور مصنفوں نے معاشرتی ڈھیری قانون سازی

کے زاویے سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قوانین اسلامی کو ترقی پسند مانا ہے، ان کے خیال میں اسی بنیاد پر اسلام زندۂ جاوید ہے، اس کے قوانین میں اتنی صلاحیت ہے کہ زمانے کی ترقی کے ساتھ ان کا انطباق کیا جا سکے، اسی لیے قابل توجہ اور لائق تعریف ہیں۔

"برناڈ شاہ" انگلستان کا آزاد خیال، مشہور مصنف نے کہا ہے:

"میں ہمیشہ "دینِ محمدؐ" کا احترام اس لیے کرتا ہوں کہ اس میں زندہ رہنے کی تعجب خیز خاصیت ہے۔ میری نظر میں فقط اسلام ہی ایک ایسا راستہ ہے جو رنگا رنگ حالات و تغیر پذیر زندگی میں ہم آہنگی اور اقتدار پیدا کر سکتا ہے۔ اور اس کا یہ عمل صدیوں کے لیے ہے۔"

میں پیشین گوئی کرتا ہوں ــ اس کے آثار، اب بھی نمایاں ہو رہے ہیں کہ "محمدؐ کے عقائد" آنے والے یورپ کے واسطے قابل قبول قرار پائیں گے۔"

"قرونِ وسطیٰ" کے عمائدہ جہالت یا تعصب کی بنا پر آئین محمدیؐ کے سیاہ خد و خال بناتے رہے۔ انھوں نے عوام کو کینہ و دشمنی سے متاثر ہو کر آپ کو ضدِ مسیحؑ بتایا۔ میں اس شخصیت کے بارے میں ــ فردِ بلند از سطحِ عوام و خواص ۔ مطالعہ کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضدِ مسیحؑ نہ تھے بلکہ ان کو نجات دہندۂ بشر کا لقب دینا چاہیے۔ میرا عقیدہ ہے، اگر ان جیسا صاحبِ اختیار آج کی دنیا میں آجائے تو مشکلات و مسائل دنیا کا حل یوں کر دے کہ دنیا صلح و سعادت انسانی کا گہوارہ بن جائے۔

ڈاکٹر شبلی شمیل، مادہ پرست، لبنانی عرب نے پہلی مرتبہ ڈارون کے فلسفے کو بوخنر جرمنی کی شرح کا ضمیمہ ملا کر عربی میں ترجمہ کیا اور مذہبی عقائد پر حملے کی صورت میں عربی زبان جاننے والوں کے سامنے پیش کیا۔

میٹر یالسٹ ہونے کے باوجود، اسلام کی حیرت انگیزی اور خوبیوں کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اس نے اسلام پیش کرنے والے (رسولؐ) کی تعریف کی اور اسلام

کو دوامی طور پر زندہ آئین اور زمانے کے مطابق قرار دیتے ہوئے ستائش کی۔

"فلسفۃ النشو والارتقاء" کی جلد دوم میں انہوں نے ایک مقالہ شائع کیا ہے۔ "القرآن والعمران"۔ مقالے میں ایک سیاح کے خیالات کی تردید کی ہے۔ وہ سیاح اسلامی ملکوں میں آیا تھا اور وہاں کی زبوں حالی کا سبب اس نے اسلام بتایا تھا۔

شبلی شمیل نے اپنے مقالے میں مسلمانوں کے زوال کا سبب ان کے تعلیمات اسلامی سے انحراف کو قرار دیا ہے اور کوشش کر کے ثابت کیا ہے کہ اسلام کے معاشرتی اصول چھوڑنے کے نتیجے میں زوال رونما ہوا ہے، اسلام سے نہیں۔ اس نے کہا ہے مغرب کے لوگ جو اسلام پر حملہ کرتے ہیں وہ یا تو اسلام کو نہیں جانتے یا نیت اچھی نہیں۔ وہ مشرقی لوگوں کے دلوں سے ان قوانین سے دلچسپی ختم کرنا چاہتے ہیں جو خود ان کی زمین سے ابھرے ہیں۔ وہ اپنی غلامی کا طوق ان کی گردن میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

ہمارے زمانے میں یہ سوال عام ہے کہ آیا اسلام تقاضائے وقت کے مطابق ہے یا نہیں؟ مجھے مختلف طبقے کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ خصوصاً تعلیم یافتہ و تجربہ کار حضرات کے ساتھ ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میرے حلقے میں سب سے زیادہ یہی سوال گردش کرتا رہتا ہے۔

اعتراضات:

کبھی اپنے اس اشکال کو فلسفیانہ رنگ دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی ہے۔ انسانی معاشرہ بھی اسی طرح تغیر پذیر ہے، لہذا بدلتے معاشرے کے قوانین ناقابلِ تغیر کیسے ہو سکتے ہیں؟

سوال کو اگر صرف فلسفی انداز سے دیکھیں تو جواب بہت صاف ہے۔ جو کچھ مسلسل حالتِ تغیر میں ہے، نیا ہے پرانا ہوگا، نشو و نما کے بعد زوال پذیر ہوگا۔ ترقی و ارتقا میں ہے.... یہ سب کائنات کا مادی اور ترکیبات مادی کا حال ہے۔ لیکن جہاں تک قوانینِ کائنات کا تعلق ہے، وہ بہر حال ثابت و قائم ہیں۔ زندہ مخلوق و موجودات اپنے مخصوص قانون کے مطابق "تکامل" پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوانین اہل دانش بیان کر چکے ہیں۔ خود زندہ

موجود کے اندر ہمیشہ ٹوٹ پھوٹ اور ترقی جاری رہتی ہے۔ مگر ان کے قوانین میں تغیر وارتقا نہیں ہے اور ہماری گفتگو قوانین ہی کے بارے میں ہے۔ اب، اس میں کوئی فرق نہیں۔ قانون زیر بحث طبیعی ہو یا وضعی و معاہداتی، سب کا حکم ایک ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وضعی قوانین ممکن ہے طبیعت و فطرت سے ماخوذ ہوں اور ان سے افراد یا انسانی معاشروں کا وہ راستہ بنتا ہو جس پر وہ اپنا ارتقائی سفر کرتے ہیں۔

رہے وہ سوالات جن میں اسلام اور تقاضائے وقت کے ہم آہنگ ہوتے نہ ہونے کی بات کی جاتی ہے۔ ان میں فقط فلسفیانہ یا کلیاتی بات نہیں ہوتی۔

ایک سوال ہر سوال سے زیادہ دھرایا جاتا ہے۔ "قوانین ضرورت کے پیش نظر بنائے جاتے ہیں اور انسان کے مجموعی ضروریات پائدار و یکساں نہیں ہیں۔ لہٰذا اجتماعی قوانین بھی پائدار و یکسان نہیں ہو سکتے۔

سوال اچھا اور بہت قیمتی ہے۔ اتفاق کی بات، دینِ مبین اسلام کے معجزانہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ایسا ہے جس پر سمجھ دار اور دانشمند مسلمان فخر محسوس کرتا ہے۔ یعنی اسلام، فرد یا معاشرے کے پائدار ضروریات کے لیے پائدار قانون رکھتا ہے اور ضروریاتِ انسانی کی بدلتی صورتوں میں اس کے قوانین میں لوچ اور لچک بھی ہے۔ ہم اللہ کی مدد سے جہاں تک مناسب ہوا، تفصیلی بات کریں گے۔

خود زمانہ کس سے منطبق ہوتا ہے؟

بحث شروع کرنے سے پہلے دو باتیں یاد دلاتے چلیں:

پہلی بات یہ ہے کہ ترقی پسندی اور بدلتی دنیا کے تقاضوں کا دم بھرنے والے، معاشرے کی ہر تبدیلی کو ترقی سمجھ لیتے ہیں۔ خصوصاً اگر وہ تبدیلی یورپ سے آئی ہو وہ اسے ارتقائی عمل ضرور مانتے ہیں۔ آج کے عوام میں سب سے زیادہ گمراہ کن یہی فکری رجحان دامنگیر ہے۔

اس گروہ کے خیال میں چونکہ زندگی کا سازوسامان روزانہ بدل رہا ہے، ناقص کی جگہ کامل آرہا ہے۔ علم اور ٹیکنک میں ترقی ہے۔ لہذا انسانی زندگی میں جو تبدیلیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں وہ ایک قسم کی ترقی و پیش رفت ہیں، اور ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے بلکہ "وقت کا جبر" ہے وہ اپنا راستہ خود صاف کرلے گا۔

حالانکہ نہ تو ہر تبدیلی براہ راست علم و صنعت کا نتیجہ ہے اور نہ ضرورت و جبر کا عمل دخل ہے۔ عین اس حالت میں کہ علم ترقی کر رہا ہے ہوس پیشہ طبیعت، درندہ مزاج تربیت بھی خالی نہیں بیٹھی ہے۔ علم و عقل انسان کو کمال کی طرف بڑھاتی ہے اور طبیعت کی ہوسناکی، وحشی درندہ مزاجی خود آگے بڑھ کر "انسان" کو فساد و انحراف کی راہ پر کھینچتی ہے۔ طبیعت کی ہوسناک و درندہ مزاجی کوشش کرتی رہتی ہے کہ علم کو اپنے لیے حربہ بنائے اور اپنی شہوانی و حیوانی ہوس کے لیے استعمال کرے۔ جس طرح زمانے کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے اسی طرح اس سے مقابلہ بھی کرنا ضروری ہے۔ دنیا کے اصلاح پسند اور رجعت پرست دنیا کی ترقی کے خلاف نبرد آزما رہا کیے ہیں۔

اگر زمانے کی تبدیلیوں اور تغیرات کو تمام اچھائیوں اور برائیوں کا پیمانہ مان لیں، تو خود زمانے اور اس کی تبدیلیوں کا علم حاصل کرنے کے واسطے کون سا ذریعہ استعمال ہوگا، اگر ہر چیز کا انطباق اور ہر بات کی تطبیق زمانے سے کرنا ہے تو خود زمانے کی تطبیق کس سے کریں؟ اگر انسان دست بستہ ہو کر زمانہ اور تبدیلیوں کا تابع ہو جائے تو خود انسانیت کی خلاقیت، فعالیت اور اس کے ارادے کی صناعی کہاں جائے گی؟

انسان، وقت کی سواری پر بیٹھا ہے، اور سفر کر رہا ہے۔ اسے لمحہ بھر کے لیے بھی اس کی رہنمائی سے غفلت نہ برتنا چاہیے۔ جو حضرات فقط زمانے کی تبدیلیوں کے گیت گاتے رہتے ہیں، اور اس کی رہبری سے غافل ہیں، وہ انسان کے تعمیری عمل کو بھلا رہے ہیں۔ وہ اس گھوڑے سوار کے مانند ہیں جو گھوڑے کی باگ ڈور

اپنے ہاتھ میں لینے کے بجائے اپنے تئیں اس کے حوالے کر دے۔

انطباق یا نسخ؟

دوسری بات ۔" اسلام اور تقاضائے وقت" کا حل بعض حضرات نے ایک فارمولے کے ذریعے نکالا، یہ فارمولا بہت سادہ اور آسان ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ اسلام جاودانی دین ہے۔ ہر زمانے کے مطابق ڈھل سکتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کیسے؟ اس کے انطباق کا فارمولا کیا ہے؟ جواب دیتے ہیں: جب دیکھیں کہ زمانہ بدل گیا، فوراً اس کے قوانین منسوخ کر دیں، اس کی جگہ دوسرے قوانین لے آئیں!

چالیس نکات کے مصنف نے مشکل کا یہی حل پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں، دنیا کے بارے میں ادیان کے قوانین کو نرم اور مڑنے جھکنے کے قابل ہونا چاہیے۔ تقاضائے وقت پر منطبق ہو سکیں، یہ بات اسلام کے تعلیمات کے برخلاف نہیں بلکہ اس کی روح کے بالکل مطابق ہے۔ (رسالۂ زن روز شمارہ، نوے، صفحہ ۷۵)

مقالہ نگار موصوف مذکورۂ بالا جملے کے آگے پیچھے فرماتے ہیں۔ چونکہ زمانے کے تقاضے بدل رہے ہیں اور ہر وقت نئے قانون کی ضرورت ہے۔ اسلام کے مدنی و معاشرتی قوانین جاہلیت کے عرب رسم و رواج کے مطابق اور ان کی سادہ زندگی سے ہم آہنگ تھے لہٰذا اس وقت ٹھیک تھے۔ آج کے زمانے سے وہ ہم آہنگ نہیں ہیں، لہٰذا آج کے لیے آج قانون بننا ضروری ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھا جائے۔ اگر زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ قوانین منسوخ ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو پھر کون سا قانون ہے جس میں یہ لوچ نہیں ہے؟ کون سا قانون ہے جو اس معنی میں زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہے؟

اسلام کی زمانے سے ہم آہنگ ہونے کی بیان کردہ لچک اور ہم آہنگی کی مثال تو وہی

ہے کہ ایک شخص کہے: کتاب وکتاب خانہ عمر سے مزے لوٹنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس سے پوچھے اس کا مطلب؟ وہ جواب دے۔ یعنی جب آدمی لطف ولذت کا خیال کرے فوراً اسے بیچ کر اس کی قیمت عیش ونوش میں خرچ کردے۔

مضمون نگار موصوف فرماتے ہیں: اسلامی تعلیمات کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم، اصولِ عقائد، جیسے توحید ونبوت وقیامت وغیرہ۔ قسم دوم، عبادات۔ جیسے مقدمات ومتعلقات نماز وروزہ ووضو وطہارت وحج وغیرہ۔ تیسری قسم، وہ قوانین جو عوامی زندگی سے متعلق ہیں۔

پہلی دوسری قسم تو دین کا جزء ہیں، انسان کو ذاتی طور ہمیشہ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ رہی تیسری قسم، تو وہ دین کا جزء نہیں۔ کیونکہ دین کو عوامی زندگی سے سروکار نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان چیزوں کو جزءِ دین کے طور پر نہیں لائے تھے۔ ان کا تعلق فریضۂ رسالت سے نہ تھا۔ اتفاق کی بات ہے، آپؐ حکمراں بھی تھے لہذا یہ کام بھی کرتے رہے۔ ورنہ دین کی شان تو فقط اسی میں ہے کہ آدمی کو نماز، روزے کے لیے تیار کرے دین کا انسانوں کی دنیاوی زندگی سے کیا تعلق؟

میں یقین نہیں کرسکتا کہ جو شخص ایک اسلامی ملک میں زندگی بسر کرتا ہو وہ اسلام کی منطق سے اتنا بھی ناواقف ہوسکتا ہے۔

کیا قرآنِ مجید نے انبیا ومرسلین کا نصب العین نہیں بتایا ہے؟ کیا قرآنِ مجید نے پوری وضاحت سے یہ نہیں کہا؟

> لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔

ہم نے اپنے تمام رسولوں کو روشن دلائل اور کتاب اور ترازو کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ عوام میں انصاف قائم کریں۔

قرآن نے "اجتماعی عدالت" کے قیام کو پیغمبروں کا اصل نصب العین بتایا ہے۔ اگر آپ قرآن پر عمل نہیں کرنا چاہتے تو آگے بڑھ کر اس سے بڑا جرم کیوں کرتے ہیں، اسلام اور قرآن پر تہمت لگاتے ہیں؟ آج انسان کے سر پر جو مصیبتیں آرہی ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ دین؟ جو سب کا پشتیبان اور سہارا ہے اسے ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہی تو منفرد اخلاق و قانون کا سرچشمہ ہے۔

"اسلام بہت اچھا ہے، بشرطیکہ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں رہے، معاشرے سے سروکار نہ رکھے۔ ہم یہ ترانہ، آدھی صدی سے سن رہے ہیں۔ یہ نغمہ، اسلامی سرحدوں کے پار اٹھا تھا، وہاں سے اسلامی دنیا میں آیا اور اس کا خوب پروپیگنڈا ہوا۔ چھوڑیے، ہم اس کا عام فہم زباں میں مطلب بتائیں اور سادہ لفظوں میں لکھیں۔ اس طرح ان دعوے داروں کی بات زیادہ وضاحت سے بیاں ہو سکے گی۔

خلاصہ مدعا یہ ہے۔ "اسلام جہاں تک کمیونزم کے مقابلے کے لیے، اسے آگے رکھو اسے باقی رہنا چاہیے۔ مگر جہاں، مغربی منافع سے ٹکرائے اسے راستے سے ہٹ جانا چاہیے، یورپ کے نزدیک، اسلام کے عبادتی طور طریقے باقی رہیں کوئی حرج نہیں۔ کمیونزم کے خلاف اسے ایک الحادی تحریک اور دشمن خدا فلسفہ کہہ کر استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے سماجی ضابطے، جو مسلمانوں کی زندگی کا فلسفہ ہیں۔ مسلمان جب تک اسے مانتے رہیں گے اس وقت تک وہ یورپ کے مقابلے میں آزادی اور انفرادیت کا احساس بیدار رکھیں گے۔ یہ بات مغرب کے لیے ان کے ہضم کرنے میں رکاوٹ بنے گی۔ اسے درمیاں سے ہٹانا ضروری ہے۔

افسوس ہے کہ یہ نکتہ ایجاد کرنے والے، یہ تھیوری پیش کرنے والے غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں۔

ے شہید کی نہایت خوبصورت و معنی خیز عبارت ہے (بقیہ حاشیہ بر ص)

پہلے تو یہ ہے :

"نؤمن ببعض ونکفر ببعض"

"ہم کچھ مانتے ہیں کچھ نہیں مانتے" ایسا "اصول" ہے جسے قرآن مجید نے پندرہ سو برس پہلے ہی مسترد کر دیا ہے۔

دوسرے یہ ہے :

میرے خیال میں، وقت آچکا ہے کہ مسلمان اب ان شعبدہ بازیوں کا شکار نہ ہوں، عوام کی انتقادی قوت کم و بیش بیدار ہو چکی ہے۔ وہ امتیاز کرنے لگے ہیں کہ انسانی علم و فکر کی طاقت کہاں کہاں شگوفہ بہار کا سبب ہے اور کہاں کہاں فساد و انحراف کا باعث ہے۔ چاہے وہ یورپ سے متعلق کیوں نہ ہو۔

اسلامی دنیا کے عوام پہلے سے زیادہ اسلامی تعلیمات کی قوت و قیمت کو سمجھ چکے ہیں، وہ نصب العین بنا چکے ہیں کہ زندگی کا مستقل فلسفہ اسلام اور اسلامی ضوابط ہیں وہ کسی قیمت پر یہ حقیقت ضایع کرنے پر تیار نہیں ہوں گے۔

مسلمان سمجھ چکے ہیں کہ اسلامی قوانین کے خلاف پروپیگنڈا، استعمار اور سامراج کی ایک چال ہے۔

تیسرے یہ ہے :

یہ تھیوری دریافت کرنے والے سمجھ لیں کہ اسلام میں اگر الحاد کے مقابلے کی قوت ہے تو اس میں غیر الحادی نظام سے بھی ٹکر لینے کی صلاحیت ہے۔ یہ اسی وقت ہے جب وہ

(بقیہ حاشیہ از ص)

"متأسفانہ، ابداع کنندگان این تز کور خوانده" ـ "تز" فرانسیسی میں "THESE" ہے انگریزی میں اسے "THESIS" ـــ "DISSERTATION" کہتے ہیں۔

ایک فلسفے کے طور پر معاشرے میں بالادستی و حاکیت پیدا کرے، مساجد اور عبادت خانوں میں محدود نہ رہے۔ جو اسلام عبادت گاہوں میں بیٹھا رہتا ہے وہ افکار اہل یورپ کے لیے میدان خالی چھوڑ دیتا ہے، بلکہ وہ تو مغربی افکار کی مخالفت کا محاذ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اسلامی ممالک پر یورپ نے جو غضب ڈھایا ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

اسلام اور بدلتی زندگی

(۲)

انسان، معاشرہ اور عقل

انسان فقط ایسا جاندار نہیں جو اجتماعی زندگی کا عادی ہے۔ بہت سے حیوانات، خصوصاً حشرات، اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کا ایک حکیمانہ نظام و دستور ہے جس کے پابند ہیں۔ اصول تعاون، تقسیمِ کار، تولید و تقسیم، حکمرانی فرماں برداری، ان کی زندگی میں حکم واطاعت کا عمل موجود ہے۔

شہد کی مکھی، چیونٹی کی بعض قسمیں اور دیمک یک جا زندگی، تمدن (ان کا خاص تمدن) نظام اور انتظامات سے فیضیاب ہیں۔ برس ہا برس بلکہ صدیاں گذر جائیں تب جاکر انسان، اشرفِ مخلوقات ان تک پہنچے۔

ان کا تمدن، انسانی تمدن کے برخلاف عہد بہ عہد تقسیم نہیں ہوتا۔ پہلے جنگل پھر پتھر اس کے بعد لوہے کا دور اور اب ایٹم کے زمانے تک نہیں پہنچا، انہوں نے اس دنیا میں قدم رکھتے ہی یہ تمدن یہ انتظامات اور یہی دنیا بنی بنائی دیکھی، آج بھی وہی اسلوب ہے اور کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ یہ انسان ہے۔ "اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔" (قرآن) اس کی زندگی زیرو سے شروع ہو کر لاانتہا کی طرف جارہی ہے۔

جانوروں کے لیے وقت کے تقاضے یکساں ہیں۔ دنیا کے تقاضے ان کی زندگی کو دگرگوں نہیں کرتے، جدت پسندی اور نو پرستی ان کے لیے بے معنی ہے۔ ان کے

یہاں نئی پرانی دنیا کا فرق نہیں ہے۔ علم ان کے لیے روزانہ نئے انکشافات نہیں کرتا، ہلکی بھاری صنعتیں جدید سے جدید تر، کامل سے کامل تران کے بازاروں کو انقلاب نہیں لاتیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ جبلتی (غریزہ کی) زندگی گذارتے ہیں عقل سے دور ہیں۔

انسان کی زندگی اجتماعی اور ہمیشہ تغیر پذیر بلکہ تبدیلیوں کی زد پر ہے۔ ہر صدی میں اس کے لیے دنیا بدل جاتی ہے۔ اس کے اشرف مخلوقات ہونے کی بنیاد بھی یہی ہے، انسان، طبیعت کا فرزند بالغ و رشید ہے۔ وہ ایسی منزل پر فائز ہے، جہاں اسے براہ راست طبیعت کی نگہداشت و سرپرستی کی ضرورت نہیں۔ غریزہ (سرشت) نامی چیز اپنی مرموز (اندرونی و اشاراتی) ہدایت کرے۔ انسان اس سے آزاد ہے وہ غریزہ کے بجائے عقل کی زندگی گذارتا ہے۔

طبیعت نے انسان کو بالغ سمجھ کر آزاد کر دیا ہے۔ اپنی سرپرستی سے دست کش ہو گئی ہے۔ حیوان جو کچھ اپنے غریزے اور قانونِ طبیعت کے ماتحت بے چون و چرا کرتا ہے، انسان وہی کام اپنے علم اور وضع شدہ قانون و تشریع سے کرتا ہے، جس سے سرتابی بھی ممکن ہے۔

تباہی و بربادی، انحرافات اور روگردانی جو کچھ بھی وہ ترقی و کسب کمال کی راہ میں دکھاتا ہے، ٹھہراؤ اور پستیاں، گراوٹ اور ہلاکت اسی مقام سے پیدا ہوتی ہے۔

انسان کے لیے جس طرح ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اسی طرح فساد و انحراف اور گراوٹ کی راہیں بھی بند نہیں ہیں۔

انسان اس منزل میں ہے، جہاں بہ تعبیر قرآنِ کریم — "جس امانت کا بوجھ آسمان و زمین اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اسے اپنے کاندھوں پر لے کھڑا ہوا — یعنی آزاد زندگی قبول کر لی۔ پابندیوں، ذمے داریوں اور قانون کے بندھن بھی منظور کر لیے۔ اسی بنیاد پر ظلم و جہالت و خود پرستی میں مبتلا ہوتا اور غلط کاری سے نہیں بچتا۔

قرآن کریم، جہاں انسان کی عجیب و غریب صلاحیت اور امانت و ذمہ داری کے بارے میں بات کرتا ہے وہیں بلا توقف اسے "ظلوم" و "جہول" کی صفتوں سے بھی یاد کرتا ہے۔

ترقی پذیری اور انحراف کی دو صلاحیتیں انسان میں ناقابل جدائی ہیں، انسان جانور کی طرح نہیں کہ اجتماعی زندگی میں نہ آگے بڑھ سکے نہ پیچھے ہٹ سکے نہ دائیں لڑھک سکے نہ بائیں۔ انسان کی زندگی میں کبھی پیش قدمی ہے کبھی پسپائی، سرعت و تیز روی ہے اور توقف اور گراوٹ، عدالت و نیکی، ظلم و تجاوز انسانی زندگی کے پرتو ہیں۔ ایک منزل میں عقل و علم کا مظہر ہے۔ ایک مرحلے میں جہالت و ہوس پرستی ہے۔

زمانے میں جو تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی ہیں، ممکن ہے دوسری قسم ہی کی ہوتی ہوں۔

منجمد اور جاہل لوگ

بشری خاصیتوں میں افراط بھی ہے تفریط بھی، انسان اگر حد اعتدال میں رہے، پہلی قسم کی تبدیلیوں کو دوسری قسم کی تبدیلیوں سے الگ کرے، زمانے کو علم و ایجاد کی طاقت سے کوشش و عمل کے ذریعے آگے لے جائے، ترقی و پیش رفت کے مظاہر سے اپنے تئیں ہم آہنگ بنانے کی سعی کرے۔ زمانے کے انحرافات کا راستہ روکے اور ہم رنگ زمانہ ہونے سے دور رہے تو انسان کے لیے ممکن ہے۔

افسوس یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ آدمی کو اس موقع پر دو خطرناک بیماریاں للکارتی رہتی ہیں، جمود اور جہالت کے مرض، پہلی بیماری کا نتیجہ ٹھہراو، سکون اور توقف ہے، آدمی وسعتوں اور ترقیوں سے دور رہ جاتا ہے۔ اور دوسرے مرض کی وجہ سے سقوط و انحراف سے دوچار ہوتا ہے۔

جامد، ہر چیز سے نفرت کرتا ہے اور پرانے پن کے علاوہ کسی کو پسند نہیں کرتا۔ جاہل ہر نئی چیز کو تقاضائے وقت کا نام دیتا اور جدت پسندی و ترقی پسندی سمجھنے لگتا ہے

جامد، ہر نئی اور تازہ چیز کو فساد و انحراف کہتا ہے اور۔ جاہل، ہر بات کو تمدن اور توسیع علم و دانش کی مد میں شمار کرتا ہے۔

جامد آدمی، مغز اور چھلکے میں، وسیلے اور نصب العین میں فرق نہیں کرتا، اس کی نظر میں دین، آثار قدیمہ کی حفاظت کی ذمہ داری سونپتا ہے اس کی رائے میں نازل شدہ قرآن زمانے کی رفتار روکنے اور وضع کائنات کو اپنی حالت پر ساکن رکھنے کا فریضہ سپرد کرتا ہے۔ جامد شخص کے عقیدے میں پارۂ عمِّ تیسا پارہ لون پڑھنا، کلک سے لکھنا، صوف والی دوات کا استعمال، پرانے حمام میں نہانا، ہاتھ سے کھانا کھانا، مٹی کے تیل کی لالٹین جلانا، جاہل و بے سواد جتنا دینی آداب کی زندگی ہے، اس کی نگہداشت کرنا چاہیے، جاہل اس کے برخلاف، دونوں آنکھیں بند کیے دیکھتا رہتا ہے کہ یورپ میں کیا نیا شگوفہ کھلا، کیا نیا فیشن نکلا جس کی تقلید کرے اور جدت پسندی اور وقت کا جبر کہہ کر اسی راہ پر چل کھڑا ہو۔

جامد و جاہل، دونوں اس بات پر ہم خیال ہیں کہ جو وضع قطع پرانے زمانے کی تھی وہی دینی مسائل اور مذہبی شعائر ہیں۔ دونوں میں اختلاف یہ ہے کہ ایک رسم و رواج کی نگہداشت پر زور دیتا ہے اور جاہل کے خیال میں مذہب قدامت پرستی ہے اور اس کا تعلق سکون و قرار سے ہے۔

آخری صدیوں میں، یورپ علم اور دین کے تضاد سے دوچار تھا، ہر جگہ یہی بحث و گفتگو تھی۔ دین و علم میں تضاد کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ چرچ نے کچھ قدیم علمی و فلسفی مسائل کو دینی عقائد اور دینی پہلو مان لیا تھا، لیکن علوم نے ان مسلمات کے خلاف کچھ ترقیاتی حقائق ثابت کر دیے تھے۔ ادھر علوم نے زندگی کی وضع بدل دی زندگی کی شکل و صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

جامد، خشک نام نہاد دیندار حضرات ایک طرف تو چند فلسفی مسائل کو بلاوجہ مذہبی رنگ دیدیتے ہیں۔ دوسری طرف مادی زندگی کے ظاہری ڈھانچے کو بھی قلمرو مذہب کا حصہ بنانا چاہتے ہیں۔ ادھر جاہل و بے خبر عوام بھی سوچتے ہیں کہ واقعاً

مادی زندگی میں بھی آدمی کو خاص وضع قطع میں ہونا چاہیے۔ اور چونکہ علم کا فتویٰ یہ ہے کہ مادی صورت کو بدلنا چاہیے لہٰذا دین کا منسوخ ہونا ہی بہتر ہے اور یہ فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔

پہلے گروہ کے جمود اور دوسرے گروہ کی بے خبری نے علم و دین کے تضاد کو جنم دیا۔ اور بس۔

قرآنی تمثیل: اسلام ترقی یافتہ اور ترقی دینے والا دین ہے، قرآن کریم مسلمانوں کو ترقی اور پیش روی کی طرف بڑھنے کی دعوت دیتا ہے اس بنا پر وہ ایک مثل میں کہتا ہے:

"پیروان محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مثال دانے کی ہے، زمین میں بویا، اس کی نازک سی کونپل پھوٹی، پھر اس نے کچھ قوت حاصل کی، اس کے بعد وہ اپنے تنے پر ٹھہری اس کی یہ رفتار اتنی تیز تھی کہ کسان بھی حیرت میں پڑ گئے۔

یہ مثل قرآنی نصب العین کے مطابق ایک مثالی معاشرے کے لیے ہے۔ قرآن ایسے معاشرے کے بیج بونا چاہتا ہے جو ہمیشہ نشوونما پاتا، پھلتا، پھولتا اور پھیلتا رہے۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:

اسلام کی طرح کسی دین نے اپنے ماننے والوں کو قوت کی تعلیم نہیں دی ہے۔ اسلام کے پہلے دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام نے معاشرے کی تجدید و تعمیر میں کتنا کام کیا اور ترقی میں کس قدر طاقت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اسلام جمود کے خلاف ہے وہ جہالت کا بھی دشمن ہے۔ اسلام کو جو خطرہ ہے وہ اس رخ سے بھی ہے اور اس سمت سے بھی۔ جمود اور خشک مزاجیاں نیز ہر پرانے نعرے کو محبوب قرار دینا۔ حالانکہ دینِ مقدس اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جاہل لوگوں کو ایک بہانہ فراہم کرتا ہے کہ وہ اسلام کو جدیدیت کا حقیقی مخالف سمجھنے لگیں

دوسری طرف تقلید اور فیشن پرستی و مغرب زدگی کے زیر سایہ یہ عقیدہ کہ مشرقی ممالک کی خوش نصیبی اسی میں ہے کہ وہ جسمانی و روحانی، ظاہری و باطنی طور پر فرنگی بن جائیں، اہل مغرب کے تمام رسم و رواج قبول کرلیں۔ اپنے مدنی و معاشرتی قوانین کو آنکھیں بند کر کے یورپ کے قوانین سے ہم آہنگ بنالیں۔ یہ خیال جامد افراد کے لیے بہانہ بن گیا کہ وہ لوگ ہر نئی وضع کو بد بینی کی نظر سے دیکھیں اور اسے دین، آزادی اور قوم کی اجتماعی شخصیت و انفرادیت کے لیے خطرہ سمجھیں۔

ان دونوں رویوں کا نقصان اٹھانے والا، اسلام ہے۔ خشک لوگوں کا جمود جاہلوں کو میدان جنگ مہیا کرتا ہے۔ اور جاہلوں کی جہالت، خشک لوگوں کو ان کے عقائد و نظریات زیادہ متعصب اور خشک بنا رہی ہے۔

یہ متمدن نما جاہل سمجھتے ہیں زمانہ "معصوم" ہے۔ جیسے زمانے کی تبدیلیاں انسان کے علاوہ کسی اور ہاتھوں رونما ہوتی ہیں؟ کب سے اور کس تاریخ سے انسان نے غلطی سے دوری۔ عصمت۔ حاصل کی ہے، جو زمانے کے انقلابات خطا اور غلط فہمیوں سے ماورا۔ معصوم۔ مان لیے جائیں؟

آدم زاد جس طرح، علمی رجحانات، اخلاقی اور مذہبی رکھتا ہے اور بشریت کی صلاح و فلاح کے لیے ایجادیں کرتا ہے اسی طرح وہ خود پرستی، جاہ طلبی، ہوس رانی، دولتمندی اور استعماری خواہشات کے زیر اثر بھی رہتا ہے۔ بشر آخر بشر ہے، نئے نئے انکشافات کرتا ہے، بہتر سے بہتر وسائل دریافت کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اتفاقاً غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ خود فراموش آدمی ان باتوں کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کا تکیہ کلام ہے۔ آج کی دنیا ایسی ہے، آج کی دنیا ویسی ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات ہے کہ یہ لوگ زندگی کے اصول جوتے، ٹوپی اور اپنے لباس کے معیار پر جانچتے ہیں، جیسے جوتا، ٹوپی نئی پرانی ہوتی ہے اسی طرح ان کے

نزدیک جو زمانہ نیا نیا، کارخانے سے بننے کے بعد ابھی ان کے سامنے آیا ہے اس کی توقیمت ہے، اسے تو خریدنا اور پہننا چاہیے اور جیسے ہی وہ پرانا ہوا اسے دور پھینک دینا چاہیے۔ کائنات کے حقائق بھی ایسی ہی ہیں، ان جاہلوں کی نظر میں، اچھے اور برے کا مفہوم۔ نئے اور پرانے سے جدا نہیں۔ ان کے خیال میں "فیوڈلزم"۔ یعنی، ایک طاقت ور زبردستی اپنا نام "مالک" رکھ لے اور اپنی جگہ بیٹھا، سینکڑوں ہاتھوں اور بازوں سے کام لے، مقصد صرف منہ چلانا ہو۔ بہت برا ہے، کیوں؟ اس کی دلیل اس کا پرانا پن ہے۔ آج کی دنیا اس نظام کو پسند نہیں کرتی۔ اس کا دور گذر چکا، یہ فیشن پرانا ہو گیا۔ لیکن جس دن یہ طریقہ ایجاد ہوا تھا اور نیا نیا قالب سے اترا تھا، دنیا کی بازار میں رکھا گیا تھا اس دن اچھا تھا۔

ان لوگوں کی نظر میں عورت کا استثمار برا ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا اسے ناپسند کرتی اور اس کے سلیبے تلے نہیں چلتی۔ اس کے مقابلے میں، کل تک عورت کو ترکہ نہیں ملتا تھا، اس کی ملکیت تسلیم نہ تھی، اس کا عقیدہ و ارادہ باعزت نہ تھا، اس وقت یہ سب خوب تھا، کیونکہ نیا تھا اور نیا نیا بازار میں آیا تھا۔

ان حضرات کی رائے میں، چونکہ یہ زمانہ فضا کا زمانہ ہے، اور اب ہوائی جہاز چھوڑ کر خچر پر سواری ممکن نہیں، بجلی کو چھوڑ کر لالٹین نہیں جلائی جا سکتی، تانگے بنانے والے بڑے بڑے کارخانوں کو بند کر کے چرخے سے کام نہیں چلایا جا سکتا، دیو پیکر چھاپے کی مشینیں نظر انداز کر کے قلمی کتابیں نہیں شایع ہو سکتیں، یونہی محفل رقص، نیم عریاں پارٹی ہو یا "بوفے" آخر ان میں شرکت کیوں کر چھوڑ دی جائے۔ شراب نوشی و بدمستی جوا، نیم عریاں لباس، یعنی اس صدی کے نئے طور طریقوں کا چھوڑنا، گدھے کی سواری کا دور واپس لانے کے برابر ہے۔

"نئی روشنی" کی اصطلاح نے کس قدر شخصی اور کتنی خاندانی زندگیوں کو تباہ کیا ہے!

کہتے ہیں، علم کا دور ہے۔ ایٹم کا عہد ہے، مصنوعی سیاروں، فضائی راکٹوں کا زمانہ ہے۔ جی، بہت اچھا! ہم بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، ہم اس عہد و زمانے، اس دور اور صدی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری تمنا ہے، ہم اس دور کے علوم اور مصنوعات سے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر فیض یاب ہوں۔ لیکن ایک بات تو بتایئے کیا اس دور میں سرچشمۂ علم کے علاوہ سب چشموں اور دریاؤں کے دھانے خشک ہو گئے ہیں؟ اس صدی کی تمام ایجادیں اور روشنیاں علمی ترقی کا نتیجہ ہیں؟ کیا کبھی علم نے دعویٰ کیا ہے کہ دنیا کے وجود اور اس کی طبیعت کو سو فی صد رام و مطیع اور ہر چیز کو انسانی بنا رہا ہے؟

علم کے بارے میں دنیا کے ایک آدمی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا۔ ادھر سائنسی اداروں نے انتہائی خلوص نیت اور پاک ارادے سے تحقیق و انکشاف کیے، ماہرین نے محنت و تن دہی سے نئی دریافتیں کیں اور جاہ طلب ہوس پیشہ سرمایہ دار، دولت کے پجاری، علمی محنتوں کو اپنے نجس مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں، علم فریادی ہے کہ اس کا استعمال انسان کی سرکش طبیعت ہمیشہ غلط کرتی ہے یہی ہماری صدی کی مشکل اور بدقسمتی ہے۔

علم فزکس میں ترقی کرتا ہے، روشنی کے کلیات دریافت ہوتے ہیں، ایک منافع پرست گروہ آگے بڑھتا اور خانہ برانداز و تباہ کن فلمیں بنانے کا کام اسی تحقیق کے سہارے شروع کر دیتا ہے۔ کیمسٹری کا علم ترقی کرتا ہے مفردات کے خواص اور مرکبات کے نتائج دریافت کرتا ہے، کچھ لوگ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں وہ، بلائے جان نشہ "ہیروئن" ایجاد کرتے ہیں، علم، ایٹم کے اندر جھانک کر اس کی حیرت انگیز اور طاقت دیکھتا اور اس کو مہار دیتا ہے اور معمولی سا انسانی فائدہ اٹھانے سے پہلے، اقتدار کے بھوکے ایٹم بم بنا کر بے گناہوں کو تباہ کرتے ہیں۔

. بیسویں صدی کے ہیرو "آئن اسٹائن" کے اعزاز میں جشن ہو رہا تھا، وہ اٹھا اور تقریر کے دوران کہنے لگا:

"آپ اس شخص کے لیے جشن منا رہے ہیں، جس کا علم ایٹم بم بنانے کا سبب ہوا ہے۔"

آئن اسٹائن نے علمی صلاحیتیں اس لیے نہیں استعمال کی تھیں کہ یہ بم بنایا جائے، مگر ہوس پیشہ لوگوں نے اس کے علم سے یہی فائدہ اٹھایا۔

ہروئین، ایٹم بم، ایسی ویسی فلمیں، فقط اس بنا پر معقول نہیں قرار دی جاسکتی ہیں کہ وہ "صدی کی نئی ایجاد" ہیں۔ اعلیٰ درجے کے بم آخری ترقی یافتہ بمبار ہوائی جہاز کے ذریعہ بے گناہ آدمیوں کے سر پر برسانے سے، عمل کی وحشیانہ حیثیت میں ذرہ بھر کمی پیدا نہیں ہوتی۔

اسلام اور بدلتی زندگی

(۳)

عائلی اور گھریلو زندگی میں مغربی رویّوں کو قبول کرنے کے سلسلے میں جو حضرات حمایت کا دم بھرتے ہیں، ان کے پاس سب سے اچھی دلیل یہ ہے کہ ۔ دنیا بدل گئی ہے، بیسویں صدی کے تقاضے اسی سسٹم کا پابند کر رہے ہیں ۔ اگر اس رخ پر ہم روشنی نہ ڈالیں تو ہماری دوسری بحثیں ناقص رہ جائیں گی ۔

اچھی خاصی اور تفصیلی بحث و تحقیق کے لیے مقالات کافی نہیں ہیں، کیونکہ مقالات میں متعدد موضوعات و مسائل زیر بحث آنا ضروری ہیں فلسفی، فقہی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل ۔ "اسلام اور تقاضائے وقت" کے عنوان سے جو کتاب لکھنے کی نیت ہے، جس کے نوٹ تیار ہیں ۔ تو ان شاء اللہ بقیہ بحث وہاں کی جائے گی ۔

سرِ دست دو نکتوں کی وضاحت کافی ہے :

نمبر ۱ :-

زمانے کی تبدیلیوں سے ہم آہنگی اتنی آسان نہیں ہے، جتنی یہ مدعیانِ بے خبر سمجھے سمجھاتے ہیں ۔

قوانین اسلام کے جوڑ اور موڑ اور ان کے راز و اسرار

نمبر ۲ :-

دوسرا ضروری نکتہ جسے روشن و عیاں ہونا چاہیے وہ اسلامی مفکروں کا یہ عقیدہ کہ اسلام میں ایسے راز موجود ہیں جو دین کو اپنے دور کے ترقیات سے ہم آہنگ ہونے میں

مدد کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے۔ اسلام، زمانے کی ترقیوں اور ثقافتوں کی پیش رفت، دنیا کے پھیلاؤ اور زندگی کی جدیدیت کا ساتھ دیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا راز و رمز کیا ہے؟ دوسری لفظوں میں، اس مشینری کے اسپرنگ، بیرنگ، بریکیٹ اور نٹ بول لگے ہیں کہ جن سے حرکت میں فرق نہیں پڑتا، یعنی کسی قانون کے نظر انداز کرنے کے بجائے وقت کی تبدیلیوں، اور تعلیم و ثقافت میں توسیع میں کسی قسم کا تضاد و تصادم نہیں ہوتا، اس عقیدے کے توضیحات اس مقالے کا موضوع ہیں۔

بعض قاری اور ان سے زیادہ میں خود سمجھتا ہوں کہ یہ مسئلہ فنّی اور ماہرانہ ماحول چاہتا ہے۔ اور ماہرین ہی کے سامنے اس پر گفتگو ہونا چاہیے۔ مگر سوال کرنے والوں اور مسئلے سے دل چسپی رکھنے والوں کی اکثریت سے دوچار ہوں، ان میں غلط اندیش لوگوں کی تعداد زیادہ ہیں، اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسلام کی اس خصوصیت کو باور نہیں کرتے۔ میں جس حد تک غلط فہمیوں کو دور کر سکتا ہوں اس حد تک کوشش کروں گا اور دوسروں کو نمونہ دیدوں گا۔

محترم ناظرین! خیال رکھیں کہ اس قسم کی بحثوں سے ہمارے دور اندیش علماء بے خبر نہیں تھے، چنانچہ مرحوم آیت اللہ میرزا حسین نائینی[1] کی "تنبیہ الامت" اور استاذ علامہ محمد حسین طباطبائی[2] کا مقالہ "ولایت و زعامت" کتاب "مرجعیت و روحانیت" میں قابل ملاحظہ ہے۔ یہ کتابیں فارسی ہی میں ہیں اور چھپ چکی ہیں۔

---

[1] آیت اللہ العظمیٰ میرزا محمد حسین نائینی، نجف کے عالم جلیل، فقیہ اعظم اور اصولی، جنھوں نے علماء کے منصب پر ایک اہم کتاب "تنبیہ الامت" تحریر فرمائی اور مشروطہ میں استعمار سے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا۔ ان کی ولادت کا سنہ ۱۲۷۷ھ/۱۸۶۰ء اور سنہ وفات ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء ہے۔

[2] علامہ سید محمد حسین طباطبائی متوفی ۱۹۸۱ء، قم۔ تفسیر المیزان کے مصنف اور آخری دور کے مشہور فلسفی

دینِ مقدس اسلام اپنے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین کے باوجود تمدن و ثقافتِ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور انسان کی بدلتی زندگی میں قابل تطبیق ہے۔ چند چیزوں کی طرف توجہ مبذول فرمائیے۔

جسم و صورت کے اختلاف سے زیادہ روح و حقیقت پر توجہ ہے۔

۱۔ اسلام زندگی کی ظاہری شکل و صورت سے بحث نہیں کرتا جب کہ انسانی دانش و بینش تمام و کمال اسی سے وابستہ ہے اسلامی قوانین و سفارشات، روح و حقیقت سے متعلق ہیں۔ وہ زندگی کے نصب العین اور انسان کے لیے بہترین راستے کا رہنما ہے وہ راستہ جو اسے منزل مقصود تک پہنچا دے۔ علم۔ نہ روح و مقصدِ زندگی کو بدلتا ہے نہ، بہتر اور نزدیک تر و بے خطر راستہ بتاتا ہے جو مقصدِ حیات تک پہنچا سکے۔ علم، ہمیشہ بہتر وسائل اور کامل تر ذرائع مہیا کرتا ہے جس سے آدم زاد زندگی کے مقاصد حاصل کر سکے اور ان تک پہنچنے کے راستے اور ان پر چلنے کا انداز معلوم کر سکتا ہے۔

اسلام نے اپنی قلمرو، اپنے دائرہ کار میں مقاصد متعین کر دیے ہیں، شکل و صورت و وسائل علم و فن کے دائرہ کار میں چھوڑ دیے، تمدن و ثقافت کے پھیلاؤ میں تصادم اور ٹکر سے بچ گیا۔ اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے علم و عمل، توسیع تمدن و ثقافت تقوے، استواری ارادہ، ہمت پائدار اور استقامت پیدا کرنے اور بڑھانے میں اصلی عامل اور تمدن کی ترقی میں اساسی کردار اپنے ذمے لیا۔

اسلام نے شاہراہِ سفرِ بشر پر سنگ میل نصب کر دیے ہیں۔ وہ نشانِ راہ، رفتار کا رخ اور منزل کی سمت بتاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خطروں، موڑوں، گرنے کے مقامات تباہی کے ٹھکانوں سے بچنے کے سگنل بھی دکھا دیے۔ اسلام کے تمام ضابطے یا پہلی قسم کے نشانات ہیں یا دوسری قسم کے۔

زندگی کے اسباب و وسائل ہر دور میں انسانی معلومات اور علمی اطلاعات سے وابستہ ہوتے ہیں، معلومات جتنے بڑھتے جاتے ہیں آلات و وسائل اتنے ہی کامل و مکمل ہوتے اور ناقص وسائل کو "جبرِ زمانہ" کے ہاتھوں ہٹاتے جاتے ہیں۔

اسلام میں ایک وسیلہ یا ایک ظاہری و مادی وضع قطع ایسی نہیں مل سکتی جس پر تقدس کا لیبل چپکایا گیا ہو۔ اور کوئی مسلمان اس وضع قطع کی نگہداشت کا دائمی محافظ بننے کا مدعی ہو۔

اسلام نے یہ نہیں کہا، سلائی، بنائی، کاشتکاری، حمل و نقل، جنگ...... کے لیے آلات، اوزار اور ذرائع کے نام اور خصوصیات نہیں متعین کیے کہ فلاں کام بس فلاں اوزار ہی سے کیا جائے۔ جس کے بعد یہ کہا جا سکے کہ علمی ترقی کے ساتھ وہ اوزار بیکار قرار دے دیا جائے۔ اور اسلامی ضوابط اور علم میں تضاد و تصادم رونما ہو۔ اسلام نے جوتے، ٹوپی، اور زنانے مردانے الگ الگ اور نئے قسم کے کپڑے نہیں بنائے ہیں نہ ان کے لیے خاص سانچے، پیمانے اور مادے، نہ ساخت اور تولید و تقسیم کے لیے چند آلات اور اوزار معین کیے ہیں۔

ایک جہت تو یہ ہے، جس سے دین کو ترقیاتِ زمانہ سے ہم آہنگ بنانے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

مستقل ضرورتوں کے لیے پائدار قانون اور ادلتی بدلتی ضرورتوں کے لیے متبادل قانون

۲۔ دین اسلام کی دوسری خصوصیت جس سے اس کی بے اندازہ اہمیت بڑھ جاتی ہے وہ ہے اس کا یہ پہلو کہ انسان کی مستقل ضرورتوں کے لیے پائیدار قوانین اور تبدیل ہونے والی ضرورتوں کے لیے ایسے متبادل ضابطے جن میں وقتی ضرورتوں کی رعایت ہو۔ انفرادی، اجتماعی، شخصی اور عمومی دائروں میں کچھ قوانین ناقابل تبدیلی ہیں۔ یہ نوعیت ہر زمانے میں

یکساں ہے ۔ جو نظام، انسان اپنے غرائز کے سپرد کرتا ہے اور جو نظام اپنے اجتماع کو دیتا ہے اس کے اصول و کلیات ہر زمانے میں ایک ہی طرح رہتے ہیں ۔

نظریۂ " اضافیتِ اخلاق " اور " اضافیتِ عدالت " اور اس کے حامیوں سے باخبر ہوں ان کے عقیدے اور دلائل کے بارے میں اپنی رائے بھی لکھوں گا ۔

ضروریاتِ بشر میں کچھ ضرورتیں ادلتی بدلتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے ناپائدار اور تغیر پذیر قوانین کی ضرورت پیش آتی ہے ، اسلام نے ان کے لیے حالات کے لیے خاص ہیئت وضع کر دی ہے ، یعنی متغیر حالات کو غیر متغیر اصولوں سے وابستہ کر دیا ، یہ اصول ثابتہ ہر بدلی ہوئی صورت میں ضمنی قانون پیدا کر سکتے ہیں ۔

اس موقع پر اس سے زیادہ توضیح نہیں دینا چاہتا ، البتہ ، اپنے قاری کے ذہن کو روشن رکھنے کے لیے چند مثالیں دیتا ہوں :

اسلام کا ایک اجتماعی ضابطہ ہے :

" واعدّوا لھم ما استطعتم من قوۃ "

مسلمانو ! اپنی آخری حد امکان تک دشمن کے مقابلے میں قوت مہیا کرو ۔

سنت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے احکام کا ایک مربوط سلسلہ " بسق و رمایہ " کے نام سے فقہ میں مرتب ہوا ۔ حکم ہے کہ خود تم اور تمہارے بچے ، مہارتِ کامل کی حد تک گھوڑے سواری اور تیر اندازی سیکھیں ۔ گھوڑے سواری کا فن اور تیر اندازی کا ڈھنگ اس زمانے کی فوجی تربیت کا جزء تھا ، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد و اصل " بسق و رمایہ " ہے ۔ اس کی " اصل واعدّوا لھم ما استطعتم من قوۃ " ہے یعنی تیر و شمشیر ، نیزہ و کمان ، خنجر اور گھوڑا ، اسلام کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتا ، اصل ہے " طاقتور " ہونا ۔ اصل بات ہے ہر زمانے میں دشمن کے روبرو آخری حد امکان تک فوجی اور دفاعی حیثیت سے مضبوط ہونا طاقتور ہونا ۔ تیر اندازی اور گھوڑے سواری ایک لباس ہے جو طاقت کے جسم پر

پہنا جاتا تھا۔ دوسری لفظوں میں نفاذِ حکم کے لیے ایک صورت۔ دشمن کے مقابلے میں طاقت ور ہونا پائدار قانون ہے، جو پائدار ضرورت کو پورا کرتا اور اسی کے دوام سے دوام پاتا ہے۔

تیر اندازی و گھوڑے سواری میں مہارت کا ضروری ہونا وقت کی وقتی ضرورت تھی، زمانے کی مناسبت اور عہد کے بدلنے سے وہ بدلے گی اور تمدن و ثقافت کی ترقی کے ساتھ دوسرے جنگی آلات اور آج کے گرم اسلحہ اور آج کی مہارت درکار ہے اور آج کے وسائل کل کی تکنیک کی جگہ بدل جائے گی۔

دوسری مثال :

تبادلۂ دولت کے بارے میں قرآن مجید نے ایک "اصلِ اجتماعی" بیان کردی ہے، اور اسلام نے "شخصی ملکیت کی اصل" قبول کی ہے۔ ہاں، اسلام جس کو "ملکیت" کا نام دیتا اور مانتا ہے اس میں اور آج کی دنیا میں سرمایہ داری کی بنا پر جو کچھ ہو رہا اور جو فرق ہے اس کے تقابل کا یہ موقع نہیں۔ بہرحال مالکیتِ فرد کا لازمہ "تبادلہ" ہے۔

باہمی تبادلے کے لیے اسلام نے اصول مقرر کیے ہیں۔ من جملہ ان کے ایک اصل ہے :

"ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل"

سرمایے کو غلط طریقے پر آپس میں گردش نہ دو۔

یعنی جو روپیہ اور جو سرمایہ، دست بدست گردش کرتا ہے، کاریگر اور کارخانہ دار کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں آنے والی چیز جن جن ہاتھوں میں جس جس انداز سے جائے اور جو فائدہ ہو وہ مطابق شریعت ہو۔ سرمائے کے دست بدست آنے جانے میں جو فائدہ ہو رہا ہے اس سے انسانی قدر کے اندر ہونا چاہیے ورنہ اجازت نہ ہو گی۔ اسلام نے مالکیت کو مکمل خود مختاری کے برابر نہیں قرار دیا ہے۔

پھر، اسلامی ضوابط میں بعض چیزوں کی خرید و فروخت کو ممنوع قرار دیا گیا ہے

مثلاً خون اور انسان کا فضلہ ۔۔۔۔ کیوں ؟ بات یہ ہے کہ خونِ انسان یا خون گو ینمد کا استعمال مفید نہیں ہے ۔ لہٰذا اس کی قیمت ایسی نہیں ہو سکتی جو انسانی سرمایے کا حصہ بن سکے ۔ خون اور فضلات کی خرید و فروخت کی ممنوعیت کی اساس وہی قرآنی اصل ۔۔ "ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل" ۔ ہے ۔ خون و فضلہ کی ممنوعیت اسلام کی نظر میں "اصل" نہیں ، اصالت تو ہے ۔ ایسی دو چیزوں کا تبادلہ جو بشری حالت کے لیے مناسب ہو خون وغیرہ کی ممنوعیت ایک لباس ہے جو غلط سرمائے کی گردش کو پہنا دیا گیا ہے ۔ دوسری لفظوں میں یہ ممنوعیت" اصل ۔ لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل ۔" کی اجرائی صورت ہے ۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر "تبادلہ" ۔ "مبادلہ" کا ہاتھ درمیان میں نہ ہو اس وقت بھی کوئی سرمایہ کسی سے غلط طریقے پر لے کر ملکیت اور تصرف کا حق حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔

یہ اصلِ پائدار ہے اور پابند وقت نہیں ، اس کا ماخذ دسرچشمہ ، ناقابل تبدیل اجتماعی ضرورت ہے ۔ رہا خون اور فضلے کا سرمایہ نہ ماننا اور اسے قابل "مبادلہ" (لین دین) نہ جاننا اس کا تعلق عہد و زمان ، اور درجۂ تمدن سے بھی ہو سکتا ہے اور حالات کی تبدیلی علوم کی ترقی ، صنعت و امکانِ استفادۂ صحیح و مفید کے بعد ، دوسرا حکم بھی ہو سکتا ہے ۔

ایک اور مثال :

حضرت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے آخری زمانے میں موئے مبارک سفید ہو گئے تھے ، آپ خضاب نہیں لگاتے تھے ، داڑھی سفید دیکھ کر ایک شخص نے عرض کی کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ بالوں کی سفیدی کو رنگ سے چھپا لو" ؟ جواب میں حضرت نے فرمایا ؛ کیوں نہیں ۔ اس نے کہا ؛ پھر آپ خضاب کیوں نہیں لگاتے ؟ آپ نے فرمایا ، جب حضور نے یہ فرمایا تھا اس وقت مسلمان تعداد میں کم تھے ۔ پھر ان میں بوڑھوں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو لڑائیوں میں

شریک ہوتے تھے، دشمن جب مسلمان فوج کو دیکھتا اور بوڑھے سپاہیوں پر اس کی نظر پڑتی تھی تو اسے ایک نفسیاتی اطمینان واعتماد حاصل ہوتا تھا کہ مقابل میں تھوڑے سے بوڑھے ہیں۔ آنحضرتؐ نے فرمان جاری کر دیا کہ خضاب لگایا جائے کہ دشمن ان کے بڑھاپے کو دیکھ جوان ہمت نہ ہو سکے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا، حضورؐ کا حکم تقاضائے وقت کے مطابق تھا اس وقت مسلمانوں کی تعداد کم تھی، لہٰذا اس قسم کے وسائل کا اختیار کرنا ضروری تھا، آج اسلام پوری دنیا میں پھیل چکا ہے لہٰذا اس کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص آزاد ہے۔ خضاب لگائے یا نہ لگائے۔

حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں، پیغمبر اکرمؐ کا فرمان "خضاب لگاؤ" کلیہ۔ اصل نہیں۔ بلکہ کسی اور اصل کی شکلِ اجرائی ہے۔ قانونِ اصلی۔ دشمن کی نفسیاتی مدد نہ کرنا پر ایک لباس تھا۔

یہ مطلب ہے کہ اسلام، ظاہری شکل، پوست، چھلکے اور اوپری خول کو اہمیت دیتا ہے اور روح دباطن ومغز کو بھی۔ مگر ہمیشہ صورت کو روح، چھلکے کو مغز اور خول کو اندرونی حقیقت کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ:

ان دنوں ملک میں ایک مسئلہ زیر بحث ہے "رسمِ خط بدلا جائے"۔ یہ بات، زبان وادب کے لحاظ سے بھی قابل بحث ہے اور اصولِ اسلامی کے لحاظ سے بھی بحث طلب ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مسئلے کی دو جہتیں زیر بحث لائی جا سکتی ہیں: ایک یہ جہت کہ آیا، اسلام کی کوئی خاص الف بے ہے۔ اور دوسری الف بے سے جدا ہے؟ کیا اسلام ہماری الف بے کو جس کا نام عربی الف بے ہے، اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اور دوسری الف بے کو اجنبی جانتا ہے، جیسے لاتینی حروف؟

ہرگز نہیں۔۔! اسلام، کائناتی دین ہے اس کی نظر میں ہر الف بے برابر ہے۔

مسئلے پر بحث کرنے کی دوسری جہت ہے۔ خط اور الف بے کی تبدیلی کا مسلمانوں کے اجنبی لوگوں کے حلق میں اترنے اور ان کے پیٹ میں ہضم ہونے پر اثر بھی پڑتا ہے! اس تبدیلی کا اثر، قوم کے اپنے تمدن سے کٹ جانے پر کیا ہوگا، جس نے بہر حال اسلامی علوم اور اپنے علمی اثاثے کو چودہ سو برس تک اسی الف بے میں لکھا ہے؟ اور رسم الخط بدلنے کا منصوبہ ہے کن ہاتھوں میں اور اسے کون لوگ نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ان کی تحقیقات ہونا چاہیے۔

ھیٹ پہننا حرام نہیں دم چھلا بننا حرام ہے۔

مجھ جیسے لوگوں سے اکثر تمسخر آمیز لہجے میں پوچھا جاتا ہے؟ جناب! کھڑے ہو کر کھانا شرعاً کیسا ہے؟! چھری کانٹے سے کھانا جائز ہے؟ ہیٹ لگانا حرام ہے؟! کیا اجنبی زبان میں بات کرنا ناجائز ہے؟!

ان حضرات کے جواب میں کہتا ہوں: اس بارے میں اسلام نے کوئی خصوصی حکم نہیں دیا ہے! اسلام نے پابند نہیں کیا ہے کہ ہاتھ سے کھائیے یا چمچے سے، یہ ضرور حکم دیا ہے کہ صفائی کا خیال رکھیں۔ جوتا، ٹوپی اور لباس کا بھی کوئی ماڈل نہیں دیا۔ انگریزی جاپانی اور فارسی زبان اسلام کے نزدیک یکساں ہے۔

لیکن ......

لیکن اسلام نے ایک اور بات ضرور کہی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا بھلا دینا حرام ہے۔ دوسروں کے پیٹ میں ہضم ہو جانا، دوسروں میں مل کر مٹ جانا حرام ہے۔ دم چھلا بننا حرام ہے۔ اجنبی کے مقابلے افسوں کی نذر ہونا حرام ہے۔ جیسے سانپ کے سامنے خرگوش، دوسرے کے بدلے گدھے کو گھر سمجھنا حرام ہے۔ ان کے انحراف اور ان کی بدبختیوں کو "صدی کی ایجاد" کہہ کر جذب کر لینا حرام ہے۔ یہ عقیدہ کہ ایرانی کو جسم و روح، ظاہر و باطن میں فرنگی بن جانا چاہیے، حرام ہے۔ چار دن تک صبح سویرے "فرانسیسی کلچر سینٹر" پیرس جانا اور حرف "ر" کا مخرج "غ" میں

بدلنا اور "رفتم" کو "غفتم" کہنا حرام ہے۔

اہم اور اہم تر مسئلہ

۳۔ ایک اور جہت کہ اسلام کو تقاضائے وقت سے ہم آہنگ کرتا ہے، وہ اس کے قوانین کا عقلی پہلو ہے۔ اسلام نے اپنے پیروں کو علانیہ بتایا ہے کہ اس کے تمام ضوابط بلند ترین مصالح پر مبنی ہیں، اور خود اسلام میں مصالح کی اہمیت کے درجے بیان کیے گیے ہیں۔ اسلام کے معاملات کے ماہر ایسے مقامات پر طرح طرح کی مصلحتوں کو باہم متقابل دیکھ کر کام کی سمت و جہت آسانی سے معلوم کر لیتے ہیں۔ وہ اسلام کی اس اجازت سے مطلع ہیں کہ ایسے مقامات پر حقیقی ماہرینِ اسلام مصلحتوں کی اہمیتوں کا اندازہ لگائیں اور اسلام کی براہ راست رہنمائی کی روشنی میں اہم ترین مصلحتوں کا انتخاب کریں، فقہا اس کلیہ کو "اہم و مہم" کا نام دیتے ہیں۔ یہاں مثالیں بہت ہیں لیکن ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

"ویٹو" کا حق رکھنے والے قوانین

۴۔ ایک اور جہت جس نے اس دین کو حرکت و انطباق کی خصوصیت دی اور اسے زندہ و جاوداں بنا دیا ہے وہ، خود اس دین کے اندر ایسے قوانین اور قاعدے وضع ہوے ہیں جن کا کام دوسرے قوانین میں اعتدال اور ان پر کنٹرول قائم رکھنا ہے۔ فقیہوں کی زبان میں انھیں "قواعد حاکمہ" کہتے ہیں جیسے "قاعدۂ لاحَرَج" اور قاعدۂ "لاضرر" جو پوری فقہ پر حاکم ہے۔ حقیقت میں اسلام تمام قوانین و ضوابط کے مقابلے میں ان قواعد کو "ویٹو" کا درجہ دیتا ہے۔ اس کی بات بھی طویل ہے اور اس کا بیان کرنا مقصود نہیں۔

حاکم کے اختیارات

جن برکتوں، اسپرنگوں کا سلسلہ ہم نے بتایا، ان کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہیں جو دینِ مقدس اسلام کی تعمیر میں

ملحوظ رکھی گئی ہیں اور انھوں نے اس دین کو ابدیت و خاتمیت کی صفت خاص بخشی ہے۔ مرحوم آیت اللہ نائنی اور علامہ طباطبائیؒ نے اس سمت میں ان اختیارات کا تذکرہ کیا ہے جو اسلام نے "اسلام کی حکومتِ صالحہ" کو عطا کیے ہیں۔

اصل اجتہاد :

(علامہ) اقبال پاکستانی کہتے ہیں :

"اجتہاد اسلام کی قوت محرکہ ہے"

بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اہم خصوصیت ہے "اجتہاد پذیری" اسلام اجتہاد کو منظور کرتا ہے۔ اسلام کی جگہ کسی اور کو رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اجتہاد کس قدر مشکل ہے، بلکہ اجتہاد کا راستہ ہی بند ملے گا۔ اس دینِ آسمانی میں عجیب و عمدہ ترین بات وہ باریکیاں ہیں جو اس کی ساخت میں موجود ہیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے۔

بوعلی سینا نے کتاب "الشفا" میں بھی اسی بنیاد پر ضرورتِ اجتہاد کی بحث چھیڑی ہے وہ کہتا ہے : چونکہ زمانے کے حالات تغیر پذیر ہیں، اور ہمیشہ نئے مسائل پیش آتے ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے کلی اصول، قائم و ناقابل تبدیل ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانے میں نت نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ایسے افراد ہونا چاہییں جو نئے مسائل کا ادراک کر سکیں اور مسلمانوں کو جواب دہی کے بعد اطمینان دلائیں۔

"قانون اساسی" کے تتمے میں بھی اس کی پیش بندی کی گئی ہے۔ یعنی ہر زمانے میں مجتہدین کی ایک کمیٹی ہوگی جس کے ممبر کم از کم پانچ ہوں گے، یہ حضرات "تقاضائے وقت" سے باخبر بھی ہوں، یہ حضرات منظور شدہ قوانین کی نظارت کریں گے۔

قابل یاد دہانی بات یہ ہے کہ "اجتہاد" اپنے حقیقی مفہوم کے لحاظ سے۔ یعنی تخصص، مہارت، وکارشناسی اور اسلامی مسائل میں فنی کارشناسی، ۔ ایسی

چیز نہیں کہ مدرسے کا ہر بھگوڑا صرف اس بہانے مدعی ہو سکے کہ وہ چند دن کسی حوزۂ علمیہ میں رہ چکا ہے۔

اسلامی مسائل میں مہارت اور اظہار نظر کی صلاحیت کے لیے پوری عمر درکار ہے جو اگر کم نہیں تو زیادہ بھی نہیں ہے، اس پر ایک شرط زائد اس کا فطری ذوق اور قوتِ استعداد اور فن پر قابو اور توفیقات الٰہی کا ہونا ہے۔

مہارتِ خصوصی اور اجتہاد سے آگے، یہ لوگ ایسے ہوں جو "مرجع رائے و نظر" سمجھے جاتے ہوں۔ تقوے، معرفت الٰہی، خدا ترسی سے کما حقہٗ بہرہ مند ہوں۔ تاریخ اسلام ایسے افراد کی نشان دہی کرتی ہے جو تمام تر علمی و اخلاقی صلاحیتوں کے باوجود جب اظہار نظر کا وقت آتا تھا تو کانپنے اور تھرتھرانے لگتے تھے۔

محترم مطالعہ کرنے والوں سے معذرت چاہتا ہوں کہ گفتگو کا دامن اس بحث میں ان مطالب تک پھیل گیا۔

پانچواں حصّہ:

قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

- اسلام نے زن و مرد میں انسانی مساوات کی نگہداشت کی ہے۔
- اسلام زن و مرد کے مساوی حقوق کے خلاف نہیں وہ دونوں کے حقوق میں مشابہت کے خلاف ہے۔
- اسلام نے عورت کے بارے میں حقارت آمیز نظریوں اور رویوں کو کالعدم قرار دیا۔
- قرآن نے اپنے بیان کردہ واقعات میں توازن رکھا ہے۔ واقعات میں فقط مرد ہی بڑے کردار کے نہیں دکھائے۔ خواتین کے بلند کردار بھی نمایاں کیے ہیں۔
- خواتین اگر مردوں کے برابر حصہ لینا چاہیں تو مرد کے حقوق سے مشابہت کا خیال ختم کر دیں۔
- علماء اسلام کے کلیۂ "عدل" کی بنیاد پر فلسفۂ حقوق کی اساس رکھی ہے۔

- ___ اہلِ مشرق نے انسانیت کو درگذر اور نیکی میں اور اہلِ مغرب نے حقوق حاصل کرنے میں محدود کر دیا۔
- ___ منشورِ حقوقِ انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ ایسے فلسفیوں کی تائید درکار ہے عوام کی نہیں۔
- ___ منشورِ حقوقِ انسانی میں احترامِ آدمیت کی بات مدتوں سے مشرق اور اسلام میں تصدیق شدہ ہے۔
- ___ مغربی دنیا ایک طرف تا بہ حدِّ امکان انسانی مقام کو نیچے لا رہی ہے اور دوسری طرف حقوقِ انسانی کا لمبا تڑنگا منشور جاری کر رہی ہے۔
- ___ آج کے انسان کی مجبوری یہ ہے کہ اس نے "خود" کو بھلا دیا ہے۔
- ___ احترامِ انسان فلسفۂ مشرق سے ہم آہنگ ہے، فلسفۂ مغرب سے نہیں۔

خلاصۂ مطالب از مؤلف رح

قرآن کی نظر سے عورت کا انسانی درجہ

اسلام، عورت کو کس قسم کی مخلوق سمجھتا ہے؟ کیا شرافت، اور انسانی حیثیت سے اسے مرد کے برابر جانتا ہے یا ادنیٰ درجے کی جنس؟ یہ سوال ہیں جن کے ہم جواب دیں گے۔

عائلی حقوق کے بارے میں اسلام کا خاص فلسفہ

اسلام خاندانی مسئلہ میں عورت و مرد کے لیے خاص فلسفے کا قائل ہے۔ یہ فلسفہ گذشتہ چودہ سو برس اور آج کے فلسفے سے مختلف ہے۔ اسلام عورت مرد کے لیے ہر جگہ ایک طرح کے حقوق، ایک قسم کے فرائض، ایک نوع کی سزا کا قائل نہیں۔ کچھ حقوق اور ذمے داریاں اور سزائیں مرد کے لیے مناسب سمجھتا ہے، کچھ باتیں عورت کے واسطے کہیں وہ زن و مرد کو مشابہ وضع میں دیکھتا ہے، کہیں یہ مشابہت نہیں مانتا۔

کیوں؟ کس انداز و حساب کی بنیاد پر؟ یہ وجہ تو نہیں ہے کہ دوسرے دبستانوں کی طرح اسلام بھی عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویّہ رکھتا ہے اور عورت کو پست جنس مانتا ہے یا کوئی اور علّت و فلسفہ ہے؟

مغربی سسٹم کے پیروکار تقریروں اور تحریروں میں لکھتے اور کہتے اور ہم آپ سنتے رہتے ہیں کہ اسلامی قانون قاعدے، مہر و نان و نفقہ، طلاق و تعدادِ ازدواج، عورت کی جنس کو حقیر رکھنے کے لیے ہیں۔ ہر جگہ عورت کی توہین کی گئی ہے۔ یہ لوگ سمجھاتے ہیں کہ تمام احکام مرد ہی کی جنبہ داری کرتے ہیں۔

کہتے ہیں: بیسویں صدی سے پہلے رسم و رواج دنیا ہی یہ تھا کہ مرد کی جنس کو عورت کی جنس سے بہتر مانتے تھے۔ عورت فقط مرد کی لذت اندوزی اور بیگار کے لیے پیدا

کی گئی ہے۔ اسلامی قوانین بھی مرد کے فوائد کے گرد گھومتے ہیں۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کا دین ہے وہ عورت کو معیاری انسان نہیں مانتا اس کے لیے ایسے قوانین وضع نہیں کیے جو ایک انسان کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان جانتا تو کئی کئی بیویاں رکھنے کی اجازت نہ دیتا، طلاق کا حق مرد کو نہ دیتا، دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہ مانتا، گھر کی سرداری مرد کو نہ دیتا، بیوی کی میراث مرد کے حصۂ ترکہ میں نصف کی نسبت سے نہ رکھتا۔ مہر کے نام سے عورت کی قیمت مقرر نہ کرتا۔ عورت کو اقتصادی و معاشرتی خودمختاری دیتا، اسے وظیفہ خوار و نفقہ گیر مرد نہ بناتا۔ یہ باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اسلام عورت کے بارے میں حقارت آمیز رویہ رکھتا ہے، اسے مرد کے لیے ایک وسیلہ جانتا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام دراصل مساوات کا دین ہے، متعدد مقامات پر اس نے مساوات کا خیال رکھا ہے صرف مرد و زن کے بارے میں اس کا رویہ جدا ہے۔

کہتے ہیں: اسلام مردوں کے قوانین و حقوق میں امتیاز و ترجیحات کا قائل ہے، اگر مردوں کے لیے ترجیحات کا قائل نہ ہوتا تو مذکورہ بالا ضابطے نہ بناتا۔

ان حضرات کے استدلال کو اگر منطق ارسطو کے مطابق دھرائیں تو یہ شکل ہوگی:

(الف) اگر اسلام عورت کو مکمل معیاری انسان مانتا تو مرد کے مساوی و مشابہ حقوق اس کے لیے بھی بناتا۔

(ب) اسلام عورت کے لیے مرد کے برابر اور اس سے مشابہ حقوق و قوانین کا قائل نہیں۔

(ج) لہذا، عورت کو ایک حقیقی و واقعی انسان نہیں مانتا۔

برابری یا مشابہت

اس استدلال میں جو کلیہ استعمال ہوتا ہے وہ ہے کہ: "قانون میں یکسانیت و مشابہت (تشابہ)

کی بنیاد پر حیثیت و اعزاز انسانی جانچا جائے اور زن و مرد کو ایک سمجھا جائے۔ اچھا تو فلسفی زاویے سے بھی ایک گوشے پر اشارہ کیا جانا چاہیے۔ یعنی بتایئے کہ عورت و مرد میں انسانی حیثیت سے اشتراک کا لازمہ کیا ہے؟ لازمہ یہ ہے کہ دونوں قانونی مساوات رکھتے ہوں یعنی کسی قسم کی ترجیح اور کسی کام میں حقوقی امتیاز نہ ہو۔ یا لازمہ یہ ہونا چاہیے کہ زن و مرد کے حقوق میں برابری و مساوات کے علاوہ ایک دوسرے کے مشابہت اور یک رنگی بھی ہونا چاہیے۔ کسی قسم کی تقسیم کار، کسی قسم کی تقسیم فرائض نہ ہو۔ زن و مرد کے انسانی مرتبے میں برابری بلا شک و شبہ موجود ہے۔ انسانی حقوق میں مساوات بھی ہے مگر حقوق میں ایک دوسرے کے مشابہ حقوق کا مقصد کیا ہے۔

اگر فلسفۂ یورپ کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر ان کے افکار و نظریات کے زاویے سے سوچنے کا حق دیا جائے تو ہم سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ آیا تساوی حقوق کا لازمہ تشابہ حقوق بھی ہے یا نہیں؟ آخر تساوی اور تشابہ میں فرق ہے۔ تساوی کے معنی برابری اور تشابہ کہتے ہیں یکسانیت کو۔ ممکن ہے باپ اپنی دولت اپنی اولاد میں مساوی سے تقسیم کر دے مگر متشابہ تقسیم نہ کرے۔ مثلاً باپ متعدد قسموں کے سرمایے کا مالک ہو۔ ایک تجارتی مرکز، ایک زرعی جائداد، کچھ کرایے کے مکانات و املاک۔ لڑکوں میں صلاحیتوں کا جائزہ لینے کے بعد، اس نے اندازہ لگایا کہ ایک میں تجارت، دوسرے میں زراعت، تیسرے میں املاک کے کرایے کی وصول یابی کا تفوق دیکھا۔ اپنا سرمایہ تقسیم کرتے وقت اس نے فیصلہ کیا کہ جائداد و املاک تقسیم کرتے وقت ہر ایک کے حصے کو قیمت میں برابر رکھنے کا خیال رکھا اور کسی کو ترجیح و امتیاز نہیں دیا۔ سب کو حصہ دیتے وقت اس کے حصے کی قیمت کا اندازہ کر لیا۔

کمیت (مقدار) اور چیز ہے کیفیت اور چیز ہے، برابر اور ہے اور یکسانیت اور ہے۔ طے شدہ بات ہے کہ اسلام نے یکساں اور یک انداز حقوق زن و مرد کو

نہیں دیے ہیں۔ اس کے باوجود اسلام مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں امتیاز اور ترجیحی حقوق کا بھی قائل نہیں۔ اسلام زن و مرد میں انسانی مساوات کا خیال ضرور رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق میں مساوات کا مخالف نہیں، تشابہ حقوق کے مخالف ہے۔

تساوی و مساوات (برابری) کے لفظ میں چونکہ امتیاز نہ ہونے کا مفہوم بھی ہے لہذا لفظ نے "تقدس" کا پہلو اختیار کر لیا ہے، خصوصاً جب اسے "حقوق" سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

حقوق کی برابری (تساویِ حقوق)! کتنی مقدس، خوبصورت ترکیب کون شخص ایسا ہوگا جو پاک فطرت اور صحیح وجدان رکھتا ہو اور ان دو لفظوں کو سن کر سر نہ جھکائے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا، ہم ایک زمانے میں علم و فلسفہ و منطق کے علم بردار تھے، آج یہ حالت ہے۔ "تشابہِ حقوق زن و مرد" کو "حقوق کی برابری" کے نام سے ہم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔

اس کی مثال تو یہ ہے، جیسے کوئی اپنے لبو (ابلے چقندر) کو گلابی (ناشپاتی کی قسم کا ایک پھل) کہہ کر شور مچائے۔

سب مانتے ہیں، اسلام نے زن و مرد میں ہر جگہ متشابہ حقوق وضع نہیں کیے۔ نہ ہر جگہ اور ہر مقام پر ان کے لیے متشابہ فرائض اور سزا تجویز کی۔ ہاں، یہ سوال۔ کیا مجموعی طور پر جو حقوق عورت کو دیے ہیں وہ مردوں کو عطا کردہ حقوق سے کم قیمت ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اسے ہم ثابت کریں گے۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت مرد کے حقوق کو بعض مقامات پر غیر متشابہ کیوں رکھا، علت کیا ہے؟ دونوں کو ایک دوسرے کے متشابہ کیوں نہ رکھا؟ اگر عورت و مرد کے حقوق مساوی بھی ہوتے اور متشابہ بھی تو اچھا نہ ہوتا جو مساوی تو رکھے مگر متشابہ نہ بنائے؟ اس مدعا کو واضح کرنے کے لیے تین پہلوؤں پر بحث کرنا ہوگی۔

۱۔ تخلیق و پیدائش کے لحاظ سے عورت کی انسانی حیثیت پر اسلام کا نقطۂ نظر۔

۲۔ عورت و مرد کی تخلیق میں جو فرق ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ آیا یہ اختلاف دونوں کے طبیعی و فطری حقوق میں نامشابہت رکھنے کا سبب ہے یا نہیں؟

۳۔ اسلامی ضابطوں میں زن و مرد میں جو اختلافات ہیں وہ بعض حصوں میں نامشابہ حالات پیدا کرتے ہیں ان کا فلسفہ کیا ہے؟ کیا وہ فلسفے ابھی تک اپنے استحکام پر باقی ہیں؟

اسلام کی جہان بینی میں عورت کا مرتبہ

۱۔ قرآن فقط قوانین کا مجموعہ نہیں، اس کے مندرجات صرف خشک قواعد و ضوابط ہی نہیں بلکہ ان کی تشریح بھی ہے۔ قرآن میں قانون، تاریخ و تفسیر خلقت اور ہزاروں مطالب ہیں۔ قرآن کبھی قانون کے بیان میں دستور العمل معین کرتا ہے۔ کبھی وجود ہستی کی تشریح، کبھی خلقتِ زمین و آسمان، نباتات و حیوانات، انسان اور موت و زندگی، عزت و ذلت، عروج و زوال، غربت و امیری کے راز بتاتا ہے۔

قرآن کتابِ فلسفہ نہیں ہے، اس کے باوجود، کائنات، انسان، اور معاشرے فلسفے کے تینوں اہم موضوعات کے بارے میں اپنی حتمی رائے ضرور دیتا ہے۔ قرآن، اپنے پیروکاروں کو فقط قانون کی تعلیم نہیں دیتا، صرف وعظ و نصیحت نہیں کرتا، وہ تشریح تخلیق کائنات بھی کرتا ہے انداز فکر و کائنات شناسی کا خاص زاویہ بھی بتاتا ہے اسی ضمن میں معاشرے، جیسے مالکیت، حکومت، عائلی قوانین وغیرہ کی تشریح بھی کرتا ہے اور اسے تخلیق و موجودات ہی میں قرار دیتا ہے۔

جو مسائل قرآن مجید میں تشریح طلب سمجھے گئے ہیں، ان میں زن و مرد کی تخلیق بھی ہے۔ قرآن نے اس بارے میں خاموشی اختیار نہیں کی اور بے معنی خیال آرائی

کرنے والوں کو موقع نہیں دیا کہ وہ اپنی طرف سے عورت و مرد کے لیے کوئی فلسفہ گڑھیں اور ان کی اسلام سے نسبت دے کر اسلامی مسلّمات کا نام دیں۔ اسلام نے آگے بڑھ کر خود عورت کے بارے میں اپنا نقطہ بیان کیا ہے۔

قرآن مجید کا عورت کے بارے میں نقطہ نظر معلوم کرنے سے پہلے دوسری مذہبی کتابوں میں زن و مرد کی سرشت پر گفتگو بھی دیکھتے چلیے قرآن مجید بھی خاموش نہیں دیکھنا چاہیے کہ تخلیق زن و مرد کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر ہے کیا؟ دونوں ایک خمیر سے بنے ہیں یا الگ الگ؟ دونوں کی سرشت ایک ہے یا مرد کی طینت اور ہے عورت کی سرشت اور ہے۔ قرآن بڑی صفائی سے متعدد آیتوں میں کہتا ہے کہ عورت کو مرد کی جنس اور اسی جیسی سرشت سے پیدا کیا ہے۔ آدم اول کے بارے میں ارشاد ہے "تم سب کو ایک باپ سے اور اس کی شریک حیات کو خود اسی کی جنس سے قرار دیا (النساء ۱/۴) تمام آدم زاد کے لیے فرمایا: اللہ نے خود تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں (النساء، آل عمران، الروم)

کچھ مذاہب کی کتابوں میں جو لکھا ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں حقیر مادے سے پیدا کیا گیا، یا عورت کو بائیں یا زائد حصہ جسم قرار دیا گیا، اور یہ کہ آدم اول کی بیوی آدم کے بائیں پہلو کے کسی عضو سے پیدا کی گئیں۔ قرآن میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ بنابریں اسلام میں عورت کے لیے سرشت و طینت کی بنیاد پر کوئی حقارت آمیز نظریہ موجود نہیں۔

ایک اور نظریہ حقارت آمیز ماضی میں موجود تھا اور بین الاقوامی ادب میں اس کے ناپسندیدہ نشان ملتے ہیں۔ وہ تھا کہ عورت عنصر گناہ ہے۔ عورت چھوٹا شیطان ہے مرد جو گناہ و جرم کرتے ہیں اس میں عورت کا دخل ہوتا ہے۔ مرد بذاتہ گناہ سے پاک ہے عورت اسے گناہ کی طرف لے جاتی ہے شیطان براہ راست مرد تک نہیں پہنچ سکتا وہ عورت کے ذریعے مرد کو فریب

دیتا ہے۔ شیطان، عورت کو وسوسے میں ڈالتا اور وہ مرد کو۔ آدم اوّل نے جو شیطان کا فریب کھایا اور سعادت کی جنت سے نکلے وہ بھی عورت کے سبب ہوا۔ شیطان نے حوا کو ورغلایا اور انھوں نے . . . . .

قرآن نے جنتِ آدمؑ کی بات چھیڑی ہے مگر کہیں یہ نہیں کہا کہ شیطان یا سانپ نے حوا کو فریب دیا، اور حوا نے آدمؑ کو۔ قرآن حوا کو نہ ذمے دار قرار دیتا ہے نہ ان کو حساب سے خارج کرتا ہے۔ قرآن کے بقول: ہم نے آدم سے کہا، تم اور تمھاری زوجہ بہشت میں رہو اور اس کے میوے کھاؤ۔ شیطان کے وسوسوں کے تذکرے میں قرآن تثنیہ کی ضمیریں لاتا ہے[۱]:

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ — شیطان نے ان دونوں کے لیے وسوسے پیدا کیے[۲]

فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ — شیطان نے ان دونوں کو فریب کی راہ دکھائی[۳]۔

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ[۴] — یعنی شیطان نے دونوں کے بارے میں قسم کھائی کہ وہ ان کی بھلائی چاہتا ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے اس دور کے عام عقیدے بلکہ آج کی دنیا میں بھی کہیں کہیں پائے جانے والے عقیدے کے خلاف سختی سے قدم اٹھایا اور جنسِ زن کو اس اتہام سے بری قرار دیا کہ وہ عنصر گناہ یا گناہ ہے یا چھوٹا شیطان ہے۔

یہ حقارت آمیز نظریہ بھی عورت کے بارے میں موجود ہے کہ اس کی روحانی اور نفسیاتی صلاحیت کے پیشِ نظر وہ جنت میں نہیں جائے گی۔ عورت روحانی مدارج اور الٰہی معارف کو نہیں پا سکتی۔ جیسے مرد قربِ الٰہی حاصل کرتے ہیں عورت کو یہ

---

[۱] البقرہ/۳۵ (یا ادم اسکن انت و زوجک الجنۃ وکلا منہما رغداً)
[۲] الاعراف/۲۰ [۳] الاعراف/۲۲ [۴] الاعراف/۲۱

مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید نے متعدد آیات میں صاف صاف کہا ہے کہ آخرت کا بدلہ، اور قربِ الٰہی کا جنس سے کوئی تعلق نہیں، یہ مسئلہ ایمان و عمل کا ہے اس میں عورت ہو یا مرد، قرآن مجید، نیک اور مقدس مرد کے ساتھ نیک اور مقدس خاتون کا تذکرہ کرتا ہے۔ آدم و ابراھیم علیہما السلام کے ساتھ ان کی بیویاں، حضرت موسیٰ اور عیسیٰؑ کی محترم مائیں، بڑے اعزاز سے یاد کی گئی ہیں۔ نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا نااہل بیویوں کے ضمن میں بیان کیا مگر نہایت موزوں انداز سے۔ زوجۂ فرعون، ایک بڑی خاتون جو انتہائی گندے شوہر کے ساتھ رہیں۔ گویا قرآن نے اپنی تاریخی حکایتوں میں توازن کو برقرار رکھا۔ اور اپنی داستانوں کے ہیرو مرد ہی نہیں خواتین کو بھی یاد رکھا ہے۔

قرآن کریم، مادرِ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں کہتا ہے:

"ہم نے مادرِ موسیٰؑ کو "وحی" بھیجی کہ بچے کو دودھ پلائیں اور جب ان کی جان کے بارے میں وہ خوف زدہ ہوں تو سمندر میں ڈال دیں اور ڈریں نہیں کہ ہم اسے تمہارے واپس لوٹا دیں گے۔"[۵]

قرآن کریم مادرِ عیسیٰؑ حضرت مریمؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ ان کا مرتبہ یہاں تک پہنچا کہ ملائکہ محرابِ عبادت میں ان سے باتیں کرتے تھے۔ غیب سے ان کے لیے روزی آتی تھی، روحانی مرتبہ اتنا بلند ہوا کہ پیغمبرِ وقت حیران رہ گئے وہ نبی سے آگے بڑھ گئیں، زکریا، مریمؑ کے سامنے حیران ہو گئے۔

تاریخ اسلام میں مقدس و بلند مرتبہ عورتیں فراواں ہیں، حضرتِ خدیجہؑ کے پائے کے بہت کم مرد ملیں گے اور پیغمبرؐ و علیؑ کے سوا فاطمہؑ کا ہم پایہ کوئی نہ تھا۔

---

۵ القصص / ۷ " واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیہ ۔۔۔ "

حضرتِ زہرا سلام اللہ علیہا خاتم الانبیاؐ کے علاوہ تمام پیغمبروں اور اپنی اولاد (جو امام تھی) سب پر شرف رکھتی ہیں۔ اسلام نے۔ خلق سے حق کی طرف سفر۔ میں زن و مرد کا فرق نہیں کیا، ہاں۔ حق سے خلق۔ کے سفر میں اور پیغمبرانہ ذمہ داریوں میں مرد کو مناسب تر سمجھا ہے۔

عورت کے بارے میں ایک اور حقارت آمیز نظریہ تھا، وہ تجرد، جنسی ریاضت، شادی نہ کرنے اور مرد سے دور رہنے کا دستور تقدس ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ بعض آئینوں میں جنسی روابط بذاتہ نجس ہیں، اور ان قوانین کے ماننے والوں میں فقط وہی لوگ روحانی درجے حاصل کرسکتے ہیں جو ساری زندگی کنوارپن میں گذار دے، بین الاقوامی پیشوائے مذہبی کا جملہ ہے "بکارت کے تیشے سے شادی کے درخت کو جڑ سے کاٹ دو"۔ یہی پیشوا شادی کو فساد سے فاسد تر کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں چونکہ اکثریت کنوارپن پر صبر کرسکتے بے اختیار ہو کر فحشا و منکر میں گرفتار ہو جاتے ہیں، متعدد عورتوں سے پھنستے ہیں، ریاضت کی فکر اور مجرّد زندگی کی حمایت اور کنوارپن، جنسِ خواتین سے بدظنی ہے۔ یہ لوگ عورت سے محبت کو اخلاقی تباہ کاری شمار کرتے ہیں۔

اسلام نے اس بے معنی نظریے اور عمل سے مقابلہ کیا اس نے ازدواج کو مقدس قرار دیا، کنوارپن کو منحوس شمار کیا، اسلام نے عورتوں سے محبت کو انبیا کے اخلاق کا حصہ مانا، اور کہا: "من اخلاق الانبیاء حُبّ النّساء" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، مجھے تین چیزیں پسند ہیں۔ خوشبو، عورت اور نماز۔

برٹرینڈ رسل کہتے ہیں: تمام مذاہب میں جنسِ زن کے بارے میں بدظنی ہے، اسلام کے علاوہ، اسلام نے معاشرتی فلاح و بہبود کے زاویے سے حدود اور پابندیاں تو لگائی ہیں مگر اس رابطے یا عورت کو نجس قرار نہیں دیا۔

عورت کے بارے میں حقارت آمیز ایک رویّہ یہ بھی تھا کہ: عورت وجودِ

مرد کا پیش خیمہ ہے، وہ مرد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

اسلام نے کوئی ایسا بات نہیں کہی، اسلام نے انتہائی وضاحت سے علتِ غائی بیان کی اور اسلام صاف صاف کہتا ہے: زمین و آسمان، ابر و ہوا، نباتات اور حیوانات سب انسان کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی اس کے بجائے وہ ایک کو دوسرے کے لیے پیدا ہونے کا تذکرہ کرتا ہے:
"ھُنَّ لباسٌ لکم وانتم لباسٌ لھنّ"[1] عورتیں تمھارے لیے زینت و لباس ہیں تم عورتوں کے لیے لباس و زینت ہو۔ اگر اسلام عورت کو مرد کے لیے پیش خیمہ جانتا تو بہر حال اپنے قوانین میں اس زاویے کو ملحوظ رکھتا، لیکن چونکہ اسلام تشریح خلقت کے نقطۂ نظر کا حامی نہیں اور عورت کو طفیلی وجود مرد نہیں مانتا، اس بنا پر اس نے اپنے ضابطوں میں زن و مرد کے لیے یہ گوشہ پیش نظر نہ رکھا۔

حقارت آمیز رویّوں میں سے ایک رویہ یہ بھی ہے کہ عورت ایسا شر و بلا ہے جس سے مرد بچ نہیں سکتا، بہت سے مرد جنھوں نے عورت سے فائدہ اٹھایا ہے، وہ بھی اسے حقیر اور اپنی مصیبت و بدبختی کی بنیاد جانتے ہیں قرآن حکیم نے خصوصی طور پر اس بات کی یاد دلائی ہے کہ وجودِ زن مرد کے لیے خیر[2] و آرام دل و جان ہے۔

توہین خیز رویّوں میں یہ بات بھی ہے کہ عورت تولید میں ناچیز ہے۔ جاہلیت کے عرب اور متعدد قومیں ماں کو مرد کے مادۂ تخلیق کا برتن جانتی تھیں ان کے خیال میں مرد کا مادہ ہی اصل بیج ہے ماں فقط اسے محفوظ رکھتی اور نشو و نما دیتی ہے۔

---

[1] البقرہ/۱۸۷

[2] الروم/۲۱ — ومن آیٰتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودّۃ ورحمۃ ط انّ فی ذالک لاٰیٰتٍ لقوم یتفکرون۔

قرآن مجید نے متعدد آیات میں پھر تفاسیر نے اس سوچ کو ختم کیا، اور مرد و عورت کو مساوی بتایا ہے[1]۔

مذکورہ بالا گفتگو سے واضح ہو گیا کہ فلسفیانہ اور تخلیقی بیانات کے نقطۂ نظر سے اسلام کسی قسم کی حقارت آمیز رائے نہیں رکھتا، بلکہ ایسے خیالات کو بے ہودہ سمجھتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھنا ہے کہ مرد و زن کے حقوق میں تشابہ نہ ہونے کا فلسفہ کیا ہے؟

مساوات؟ ہاں۔
مشابہت؟ نہیں[2]۔

ہم نے کہا ہے، اسلام زن و مرد کے خانگی تعلقات و حقوق میں خاص فلسفہ کا مالک ہے۔ اسلام کا فلسفہ چودہ سو برس پہلے کے فلسفے سے مختلف اور عاصر فلسفے سے بھی متفق نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے کہ اسلام میں یہ مسئلہ زیر بحث نہیں کہ مرد و زن دو مساوی انسان ہیں یا انسانیت میں فرق ہے؟ کیا ان کے گھریلو حقوق قیمت کے لحاظ سے مساوی ہوں یا نہیں؟ اسلام کی نظر میں مرد و زن دونوں انسان ہیں اور انسانی حقوق میں برابر کے حصے دار ہیں۔

اسلام کے نزدیک بحث طلب بات ہے کہ زن و مرد فقط اس بنا پر کہ ایک عورت ہے، دوسرا مرد، بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، کائنات ان دونوں کے لیے یکساں نہیں ہے، خلقت اور طبیعت نے دونوں کو ایک جیسا تسلیم نہیں کیا، وہ یہی ثابت کرتے ہیں کہ بہت سے پہلو ایسے ہیں جہاں حقوق و فرائض، قانون سزائیں مشابہ وضع نہیں ہے۔ یورپ کوشاں ہے کہ عورت و مرد بلحاظ قوانین و ضوابط، حقوق و فرائض میں وضع کے طور پر ایک اور مشابہ ہیں۔ اور طبیعت اور نیچر کے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اسلام اور مغربی سسٹم میں یہیں سے اختلاف رونما ہوتا ہے۔ بنا بریں آجکل ہمارے ملک میں اسلامی قوانین کے طرفدار اور مغربی سسٹم کے حامی "یکائی اور تشابہ قوانین زن و مرد"

---

[1] الحجرات/۱۳۔ یا ایہا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی ....." [2] یہ بات پہلوی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا لیبل تو ہے مگر ہیں وہ قوانین کچھ اور۔

کے مسئلہ پر بحثیں کر رہے ہیں۔ تساوی حقوق پر نہیں "تساوی حقوق" "حقوق کی مساوات" لیبل ہے جو "تشابہ حقوق" پر مغرب کے اندھے مقلدوں نے فریب کے لیے چسپاں کر دیا ہے۔

میں نے ہمیشہ تحریروں، تقریروں اور کانفرنسوں میں اس جعلی لیبل کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ میں نے کبھی "تساوی حقوق" کا نام "تشابہ و تماثل حقوق" کو نہیں دیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا میں "برابری حقوق مرد و زن" کے کوئی معنی نہیں اور تمام گذشتہ موجودہ قوانین عورت و مرد کے حقوق کے بارے میں مساوی قیمت و اقدار پر مبنی قرار دیے گئے ہیں اور صرف متشابہت کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

نہیں، میرا یہ دعویٰ نہیں۔ بیسویں صدی سے پہلے کا یورپ بہترین گواہ ہے۔ بیسویں صدی سے پہلے وہاں کی عورت قانونی اور عملی طور پر انسانی حقوق سے محروم تھی۔ نہ اسے مرد کے برابر حقوق حاصل تھے نہ متشابہ حقوق۔ وہ ..... ایک جلد باز انقلاب میں (جو ایک صدی سے کم میں رونما ہوا) جس کا نعرہ عورت اور وہ برائے عورت تھا، یہ انقلاب یورپ میں اٹھا اور اس نے عورت کو کم و بیش مرد کے متشابہ حقوق دے دیے لیکن طبیعی اور جسمانی اور نفسیاتی ضروریات کے پیش نظر، عورت کبھی بھی مرد کے برابر حقوق پیدا نہ کر سکی۔ اگر عورت، مرد کے برابر حقوق حاصل کرنا چاہتی ہے اسے مرد کی خوش نصیبی جیسی خوش نصیبی کی آرزو ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے۔ اور وہ راستہ "حقوق کی متشابہت سے دست برداری" ہے۔ مرد کے حقوق مرد کے مناسب اور خود اس کے حقوق اس کے مناسب احوال کا خود اعتراف و مطالعہ کرے۔ صرف ایک راہ یہ ہے کہ عورت و مرد میں سچا خلوص اور اتحاد پیدا ہو تو عورت مرد کے برابر بلکہ اس سے بہتر خوش نصیبی سے شاد کام ہو سکتی ہے۔ مرد بھی سچے دل سے، کسی غفلت و سستی کے بغیر، فریب کاری سے بچ کر عورتوں کو اپنے

برابر بلکہ بہتر حقوق کا اعتراف کریں۔

میں اس کا مدعی نہیں ہوں کہ ہمارے موجودہ بظاہر اسلامی[1] معاشرے میں جو قوانین عملاً رائج ہیں وہ قدر و قیمت کے لحاظ سے عورت کو مرد برابر حقوق دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ آج کی عورت کے معاملات کی مکمل چھان بین کی جائے اور وہ بہت سے حقوق جو اسلام نے عورت کو دیے ہیں اور طویل مدت سے عملاً ان کو چھوڑ رکھا گیا ہے۔ وہ سب حقوق واپس کیے جائیں۔ مگر یورپ کی اندھی تقلید میں نہیں جو خود ان کے لیے مصیبت عظیم کا سبب بنے ہوئے ہیں ہم بھی غلط طریقے اور مفروضے کا خوبصورت نام رکھ لیں۔ اور مغربی قسم کی بدنصیبیوں پر مزید مشرقی قسم کی بدبختیاں بڑھا دیں میرا مدعا یہ ہے کہ عورت اور مرد کی طبیعت و خمیر میں جس حد تک مشابہت نہیں ہے۔ وہاں تک دونوں کو غیر مشابہتی حقوق دیے جائیں اور اس میں "عدل" و "حقوقِ فطری"، کی نگہداشت رہے۔ یوں عائلی زندگی بھی خوشگوار ہو سکے گی اور معاشرہ بھی بخوشی آگے بڑھ سکے گا۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے، کہ ہمارا دعویٰ ہے کہ انصاف و عدالت اور فطری و انسانی حقوق زن و مرد کا لازمہ یہ ہے کہ کچھ حقوق میں "تشابہ" نہیں ہے۔ لہٰذا ہماری بحث سو فی صد فلسفیانہ پہلو سے ہے۔ اس کا تعلق فلسفہ "قانون سے ہے۔ اس کا تعلق" اصلِ عدالت" اور کلیہ "انصاف" سے ہے "عدل" اصول دین میں بھی ہے اور فقہ اسلامی میں بھی رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔ "اصل عدل" وہ کلیہ ہے جو اسلام میں "عقل و شرع"

---

[1] یہ بات پہلوی دور کی ہے، انقلاب اسلامی کے بعد صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ لیکن ایران کے علاوہ متعدد مسلمان ملکوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اسلام کا لیبل تو ہے مگر ہیں وہ قوانین کچھ اور۔

کی تطبیق کا سبب ہے یعنی اسلامی فقہ — کم از کم شیعہ فقہ — میں اگر یہ ثابت ہو جائے کہ فلاں قانون فلاں بنیاد پر خلاف عدل ہے اور اگر اس کی صورت یہ ہو تو ظلم ہوگا اور اصلِ عدالت کے خلاف ہے، اگر یہ ثابت ہو جائے تو مجبوراً ماننا پڑے گا کہ شریعت کا حکم یہی ہے، کیونکہ شریعت نے خود ایک "اصل" کی تعلیم دی اور کہا ہے کہ عدالت و حقوق فطری و طبعی کے محور سے حکم کو دور نہ ہونا چاہیے۔

مقدر یہی تھا کہ وہ لوگ اپنا کام مکمل طور پر آگے نہ بڑھا سکے تقریباً آٹھ صدی بعد یورپ کے فلاسفہ اور دانشوروں نے پیچھا کیا اور یہ اعزاز اپنے لیے حاصل کر لیا کہ معاشرتی و سیاسی و اقتصادی فلسفے پیدا کیے اور دوسری طرف افراد، معاشروں اور قوموں کو زندگی کی قدروں اور ان کو ان کے انسانی حقوق سے آشنا کیا، تحریکات اور انقلابات برپا کیے دنیا کی صورت کچھ سے کچھ کر دی۔

میرے خیال میں تاریخی اسباب کے علاوہ ایک نفسیاتی و جغرافیائی سبب کا دخل بھی تھا، بایں معنی کہ اسلامی مشرقی بلاک میں عقلی حقوق کا مسئلہ تو موجود تھا مگر لوگوں نے اس کو مسلسل توجہ کے قابل نہ سمجھا، اس کی ایک وجہ مشرقی و مغربی لوگوں کے اخلاقی رجحانات ہیں، مشرق اخلاق کی طرف مائل ہے اور مغرب حقوق کی طرف، مشرق اخلاق کا دیوانہ، مغرب حقوق پر فریفتہ، مشرق اپنی فطرت و طبیعت کی بنا پر انسانیت کا مطلب یہ سمجھتا ہے کہ جذبات کام میں لائے درگذر کرے، اپنے ہم نوع افراد سے محبت کرے، جواں مردی اور فراخ حوصلگی دکھائے لیکن مغربی انسان کے نزدیک انسانیت کا مطلب ہے اپنے حقوق جاننا، اس کا دفاع کرنا، اور کسی کو یہ حق نہ دینا کہ اس کے حقوق کے دائرے میں قدم رکھے۔

بشریت کو اخلاق کی ضرورت بھی ہے اور حقوق کی بھی۔ انسانیت حقوق سے بھی تعلق رکھتی ہے اور اخلاق سے بھی، اخلاق و حقوق الگ الگ انسانیت کا

معیار نہیں ہیں۔

دین مقدس اسلام اس عظیم خصوصیت کا حامل تھا اور ہے۔ اس نے حقوق و اخلاق کو بیک وقت مرکز توجہ قرار دیا۔ اسلام کے نزدیک خلوص و نیکی، اخلاق معاملات ہیں اور "مقدس" کام۔ حقوق اور ان کا دفاع بھی "مقدس" اور انسانی کام شمار ہوتے ہیں۔ یہ تفصیل طلب داستان ہے جس کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔

خاص مشرقی روح نے اپنا عمل انجام دیا۔ شروع شروع میں تو حقوق و اخلاق دونوں اسلام سے لیے اور ان پر عمل کیا لیکن آہستہ آہستہ حقوق کو چھوڑ دیا اور اخلاق پر توجہ جمالی۔

مقصد یہ ہے کہ، اس وقت جس مسئلہ کا سامنا ہے۔ وہ مسئلہ قانونی ہے۔ وہ مسئلہ عقلی و فلسفی ہے، وہ مسئلہ استدلال و برہان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلق عدالت اور نیچر آف لا سے ہے۔ عدالت و انصاف و حقوق۔ قانون وضع ہونے سے پہلے موجود تھے اور قانون وضع کرنے سے عدالت و حقوق انسانی کی حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔

مان ٹیسکیو کہتا ہے:

"انسان کی قانون سازی سے پہلے، ایسے عادلانہ رویے موجود تھے جو مخلوقات پر حکومت کرتے تھے۔ انھیں رویوں کا وجود بعد میں قانون سازی کا سبب بنا۔ اب اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ سوائے ابتدائی قوانین کے کوئی شے عادل یا ظالم وجود نہیں رکھتی تو گویا ہم اس کے مدعی ہو رہے ہیں کہ دائرہ بننے سے پہلے اس دائرے کی تمام شعاعیں اور خط مساوی نہیں ہیں۔"

ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے:

"عدالت، احساسات کے علاوہ کسی اور چیز سے مخلوط ہے اسے افراد بشر کے طبیعی

حقوق کہتے ہیں۔ اور عدالت کے وجود خارجی سے پہلے حقوق اور طبیعی خصوصیات (و امتیازات) کا احترام کرنا چاہیے۔"

یورپ کے فلسفی یہی عقیدہ پہلے بھی رکھتے تھے اور اب بھی وہ بہت بڑی تعداد میں اسی کے حامی ہیں۔ حقوق انسانی کے اعلانات اور منشور اسی نظریے کے ماتحت مرتب ہوئے اور جو دفعات وضع کی گئی ہیں وہ حقوق طبیعی کے مفروضہ سے حاصل شدہ نتائج ہیں یعنی حقوق طبیعی و فطری کا مفروضہ ہے جس نے "اعلان حقوق انسانی" روپ دھارا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مان ٹیسکیو، اسپنسر وغیرہ عدالت کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں بعینہ وہی بات ماہرین علم کلام (علم عقائد) "حسن و قبح عقلی"[1] کے ضمن میں کہتے رہے ہیں۔ مسلمان علما میں کچھ لوگ ذاتی حقوق کے منکر اور عدالت کو معاہداتی چیز جانتے ہیں۔ یورپ والوں میں بھی یہ خیال موجود تھا، انگریز "ہوبز" عدالت کو ایک موجود حقیقت نہیں مانتا تھا۔

حقوق انسانی کا منشور فلسفہ ہے قانون نہیں ہے

مضحکہ خیز بات یہ کہتے ہیں کہ: حقوق انسانی کے منشور کو حکومت کے دونوں ایوانوں[2] نے منظور کیا ہے ۔ بات ہے عہد شاہی کی ۔ اور چونکہ حقوق زن و مرد اس منشور کی ایک دفعہ ہے لہٰذا قانون تائید ہر دو ایوان

---

[1] علم کلام و عقائد میں ایک بحث یہ ہے کہ اچھائی اور برائی عقلی بنیاد پر موجود ہے یا اسلام نے جسے اچھا کہا وہ اچھا ہے اور جسے برا کہا وہ برا ہے۔ یہی بحث "عدل" کے موضوع میں دبستان بناتی ہے۔ امامیہ واشاعرہ و معتزلہ۔

[2] دونوں ایوانوں سے مراد اس وقت کی مجلس ملی اور سنا ہے۔ مدعی کہتے تھے کہ عورت مرد کے مساوی حقوق کا مسئلہ قابل بحث یوں نہیں ہے کہ سینٹ اور اسمبلی نے منشور حقوق انسانی، اقوام متحدہ منظور کر لیا ہے اور اس میں مساوی حقوق موجود ہیں لہٰذا "سول لا" میں اگر غیر مساوی ہیں تو

کے مطابق عورت و مرد کو مساوی حقوق کا مالک ہونا چاہیے۔

شاید، منشورِ حقوقِ انسانی، قرار داد (مسودۂ قانون) ہے اور اس میں صلاحیت ہے، کہ دونوں ایوان اسے منظور یا نامنظور کر سکیں!؟

منشورِ حقوقِ انسانی کے مشتملات قرار داد قسم کے نہیں ہیں کہ مختلف ممالک کے قانون ساز ادارے اس کو منظور یا نامنظور کر سکیں۔

منشورِ حقوقِ انسانی، ذاتی حقوق ہیں وہ نہ چھینے جا سکتے ہیں نہ خود آدمی انھیں کسی کو دے سکتے ہیں نہ نظر انداز کر سکتے ہیں۔ ایسے حقوق ہیں جن پر اس میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس منشور میں ایسے حقوق پر گفتگو ہے جو منشور کے دعوے کے مطابق انسانی حیثیت کے لوازم ہیں اور تخلیق کے توانا ہاتھوں نے انسان کو عطا کیے ہیں (یہ حقوق منشور کے دعوے کے مطابق اس انسانوں کو عطا کیے گئے ہیں)

انسان اس منشور کے حقوق اپنے لیے وضع نہیں کر سکتے، نہ وہ اپنے اختیار سے سلب یا ساقط کر سکتے ہیں۔ دونوں ایوانوں کی منظوری یا قانون ساز اداروں کی تائید کا تو سوال ہی نہیں۔

منشورِ حقوقِ انسانی فلسفہ ہے قانون نہیں ہے۔ اس کی منظوری فلسفیوں کو کرنا چاہیے نہ کہ اسمبلی کے نمایندوں کو، دونوں ایوانوں کو یہ حق کہاں ہے کہ وہ اپنی اٹھک بیٹھکوں میں لوگوں کے لیے منطق و فلسفے وضع کریں۔ اور اگر ایسا ہے تو آئن اسٹائن کا فلسفۂ اضافیت بھی اسمبلی میں لائیں اور نمایندوں سے ووٹنگ کرائیں آسمانی کروں میں فلسفۂ حیات بھی منظور کرائیں۔ طبیعت کے قانون، قرار دادوں کی طرح منظور یا منظور نہیں ہو سکتے۔ جیسے ہم کہیں کہ دونوں ایوان نے اس قرار داد کے حق میں ووٹ دیا ہے کہ گلابی (زنشپاتی)

ے تو منسوخ مانے جائیں۔ شہید مطہری اس کا جواب دیتے ہیں کہ "منشور" میں تائید و مخالف ایوان کی ضرورت ہی نہیں وہ ایک فلسفیانہ اور مستقل دستاویز ہے۔

کا سیب سے پیوند لگایا جائے تو پیوند لگ جاتا ہے اور اگر شہوت کے درخت میں اس کا پیوند لگایا جائے تو نہ لگے گا۔

جب اس قسم کے اعلان کسی ایسے گروہ کی طرف سے شایع ہوں جو مفکر اور فلسفی ہوں تو اقوام کو چاہیے کہ اس علان کو فلاسفہ اور مجتہدین کے سامنے رکھیں اور اگر اس قوم کے مفکرین و فلاسفہ کی رائے اس کے حق میں آجائے تو اس قوم کے تمام افراد پابند ہیں کہ ان حقائق کو قانون سے بالاتر سمجھیں، قانون ساز ادارے بھی پابند ہیں کہ کوئی قانون اس کے خلاف وضع نہ کریں۔

دوسری قوموں کا معاملہ یہ ہوگا کہ جب تک خود ان کی رائے میں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ واقعاً طبیعت میں یہ حقوق اسی طرح سے موجود ہیں اس وقت تک وہ اس کی پابندی کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ پھر یہ مسائل تجربیاتی تو ہیں نہیں جن کے لیے وسائل اور لیبارٹری درکار ہو اور وہ آلات اور لیبارٹریاں صرف یورپ والوں کو میسر ہیں دوسروں کے پاس نہیں ہیں۔ ایٹم کو توڑنے اور اس کے دوسرے راز معلوم کرنے کی بات نہیں کہ یہ سب کچھ چند محدود افراد کے قبضے میں ہے۔ یہ فلسفہ و منطق کی بات ہے اور اس کے آلات ہیں مغز، عقل اور قوت استدلال۔

فرض کیجیے اگر دوسری قومیں مجبور ہوں اور فلسفہ و منطق میں وہ دوسروں کی تقلید کریں، اپنے اندر موزونیت اور فکر فلسفی کی کمی محسوس کریں تو ہم ایرانیوں کو تو یہ نہ کرنا چاہیے۔ ہم نے ماضی میں اپنی صلاحیتیں درجۂ کمال پر دکھائی ہیں اور منطق و فلسفے کی چھان بین میں کام کیے ہیں۔ ہم فلسفے کے مسائل میں دوسروں کی تقلید کیوں کریں؟

مسلمان دانشوروں پر حیرت ہے کہ جہاں "اصل عدالت" اور انسان کے نجی حقوق کا نام آتا ہے، وہ اس قدر اس کی اہمیت ماننے لگتے ہیں کہ چوں و چرا کے بغیر "عقل و شرع" کی مطابقت کا اصول برتنے لگتے ہیں اور فرماتے ہیں "یہی حکم شرعی

یعنی شرعی تائید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اب معاملہ یہاں تک آپہنچا ہے کہ ان مسائل کی تائید اسمبلی کے نمایندوں سے طلب کی جاتی اور اس کی تائید ہوتی ہے۔

فلسفہ "کوپن" سے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ ہم عورت کے حقوقِ انسانی کی تحقیق کے لیے لڑکوں اور لڑکیوں سے رجوع کریں، کوپن (سوالنامہ) چھاپ کر ان سے جواب لکھوائیں، اور اس کی روشنی میں نتیجہ نکالیں کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ کیا عورت و مرد کے انسانی حقوق ایک جیسے ہیں یا دو طرح کے ہیں؟

بہر حال، ہم عورت کے انسانی حقوق کا مسئلہ علمی و فلسفی اساس اور انسان کے ذاتی حقوق کی بنیاد پر دیکھیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ جن اصولوں کا یہ تقاضا ہے کہ تمام انسان کلّی طور پر خداداد اور طبیعی حقوق کے ایک سلسلے کے مالک ہیں، آیا وہی اصول یہ بھی لازم قرار دیتے ہیں کہ عورت و مرد بھی حقوق کے نقطۂ نظر سے متشابہ (وضع) حالت رکھتے ہیں یا نہیں؟ میں ملک کے صحیح دانشوروں، مفکروں اور قانون دان حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے دلائل کو تحقیق و تنقید کی نظر سے دیکھیں۔ کیونکہ ایسے حضرات ہی اس قسم کے مسائل میں اظہارِ رائے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انتہائی شکر گذاری کا باعث ہوگا اگر یہ حضرات اپنی رائے دلائل کے ساتھ بیان فرمائیں۔ تائید میں ہو یا تردید میں۔

اس مدعا کی تہہ تک پہنچنے کے لیے پہلے انسانی حقوق کی اساس و بنیاد سے بحث کرتے ہیں۔ پھر عورت و مرد کے حقوق کو موضوعِ مطالعہ بنائیں گے۔

مناسب ہوگا اصل مطلب سے پہلے نئی صدی میں حقوق سے متعلق تحریکوں جو زن و مرد کے حقوق میں برابری کے نظریے پر تمام ہوئے اشارہ کروں۔

یورپ میں حقوقِ نسواں کی تاریخ پر ایک نظر:

یورپ میں سترھویں صدی کے بعد انسانی حقوق کے نام سے نغمہ سنجی شروع ہوئی، سترھویں اٹھارویں صدی کے لکھنے والوں نے حیرت انگیز تسلسل سے اپنے افکار، انسان کے طبعی، فطری اور ناقابلِ سلب حقوق پر پھیلانا شروع کیے جان جیکیو روسو، والٹر اور مائیسکو اسی گروپ کے مفکر اور مصنف ہیں۔ انسانی حقوقِ طبعی کے بارے میں ان افکار کی اشاعت کا عملی اثر یہ ہوا کہ انگلستان کی حکومت اور عوام میں رسہ کشی کا آغاز ہو گیا اور ۱۶۸۸ء میں قوم نے کچھ اپنے اجتماعی اور سیاسی حقوق ایک منشور کی صورت میں پیش کیے اور انھیں حاصل کر لیا[1]

اس مہم کا دوسرا بڑا نتیجہ، انگلستان کے خلاف امریکہ کی جنگ آزادی میں برآمد ہوا، شمالی امریکہ کے تیرہ استعماری علاقے، جہاں کے عوام نے سخت دباؤ اور شدید حملے کر کے بغاوت اور خودمختاری کا پرچم بلند کیا اور آخر میں اپنی آزادی حاصل کر لی۔

۱۷۷۶ء میں فلاڈلفیا میں ایک کانفرنس ہوئی جہاں آزادی عام کے بارے میں ایک اعلان و منشور شایع کیا گیا، اس کے مقدمے میں لکھا تھا:

> "تمام افرادِ بشر خلقت میں یکساں ہیں، اور خالق نے سب کو مستقل اور ناقابلِ تبدیل حقوق عطا فرمائے ہیں، جیسے زندگی کا حق اور آزادی کا حق حکومتوں کی تشکیل کی علتِ غائی (اور اصل غرض) مذکورہ حقوق کی حفاظت ہے۔ اور اس کا اقتدار قوم کی پسند پر موقوف ہوگا۔۔۔[2]"

---

[1] ترجمہ تاریخ البرمالہ ج ۴ ص ۲۶۶ ۔ مصنف نے البرٹ مالٹ کی نوول ہسٹری یونیورسل

"ALBERT MALET'S NOVELLE HISTORE UNIVERCELLE"

[2] THE UNANIMOUS DECLARATION OF THE THIRTEEN UNITED STATES OF AMARICA"

جو جو ۴ جولائی ۱۷۷۶ء کو منظور ہوا۔

"منشور حقوق انسانی" کے نام سے دنیا میں شہرت پانے والا اعلامیہ فرانس کے عظیم انقلاب کے بعد "اعلان حقوق" کے عنوان سے شایع ہونے والا ہی منشور ہے۔ اس اعلامیہ میں ایسے اصول کلیات ہیں جو فرانس کے آئین کے مقدمے میں لکھے گئے ہیں اور فرانس کے آئین کا ناقابل جدائی حصہ شمار ہوتے ہیں۔ یہ اعلامیہ ایک مقدمے اور سترّہ دفعات پر مشتمل ہے۔

"پہلی دفعہ ہے:

افراد بشر آزاد پیدا ہوئے ہیں اور زندگی بھر آزاد رہیں گے اور حقوق میں ایک دوسرے کے برابر ہیں......"[1]

انیسویں صدی میں، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے بارے میں حقوق بشر کے مسئلہ پر نئے افکار ابھرے جن کے نتیجے میں سوشلزم، اور محنت کش طبقے کی نفع میں قطعی شرکت اور سرمایہ دار کے ہاتھ سے مزدور کو حکومت منتقل کرنے کی بات سامنے آئی۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں انسانی حقوق کے بارے میں جتنی بھی گفتگو ہوئی ہے اس کا پس منظر ـ حکومتوں کے مقابلے میں قومی حقوق یا مزدور و محنت کش عوام اور حکمران و مالک ہیں۔

بیسویں صدی میں پہلی مرتبہ مردوں کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا سوال

---

[1] "DECLARATION OF THE RIGHTS OF MAN AND OF CITIZENS"

یہ میثاق فرانسیسی قومی اسمبلی نے ۱۷۸۹ء میں آئین کے مقدمہ کے طور پر منظور کیا اور بعد میں تھامس پائن کے ذریعہ حقوق انسانی کے نام سے مشہور رہا۔

اٹھا، انگلستان ڈموکریسی میں قدیم ترین ملک تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ ملک بیسویں صدی کے اوائل میں "عورت و مرد کے مساوی حقوق" کا قائل ہوا ہے۔ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ باوجودیکہ اٹھارھویں صدی میں اعلان آزادی کے ساتھ "عام انسانی حقوق" کا اعتراف کر چکا تھا، مگر سیاسی حقوق میں مرد و زن کی مساوات کا مسودہ سنہ ۱۹۲۰ء میں منظور کرتا ہے۔ فرانس نے بھی بیسویں صدی ہی میں یہ اصول مانا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ، بیسویں صدی میں پوری دنیا میں متعدد گروپ "عورت و مرد" کے حقوق و فرائض کے بارے میں ایک بڑی اور گہری تبدیلی کے حق میں اٹھ کھڑے ہوئے ان لوگوں کا خیال ہے کہ قوموں کے تعلقات حکومتوں سے، محنت کشوں کے تعلقات مالکوں سے، مزدوروں کے تعلقات سرمایہ داروں سے اس وقت دگرگوں نہیں ہو سکتے جب تک مرد و زن کے حقوق و تعلقات میں اصلاحات رونما نہیں ہوتے، نہ اس کے بغیر معاشرتی انصاف قائم ہو سکتا ہے۔

اسی لیے انسانی حقوق کا منشور ۱۹۴۸ء، جنگ عظیم دوم کے بعد ادارۂ اقوام متحدہ نے شایع کیا۔ اس کے مقدمے میں درج ہے:

"چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی حقوق، اور فرد انسانی کی قدر و قیمت اور حقوق مرد و عورت کی برابری کا ایک بار پھر اعلان کیا ہے...[۱]"

انیسویں اور بیسویں صدی کا مشینی (صنعتی) انقلاب، کاری گروں اور مزدوروں، خاص کر عورتوں کی غربت سب سے بڑا سبب بنی کہ موضوع حقوقِ خواتین پر توجہ دی جائے۔ تاریخ البرٹ مالٹ میں ہے:

ایک مدت تک حکومت نے مزدوروں کے حالات اور کارکنوں کے مسائل

[۱] بین الاقوامی منشور حقوق انسانی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰، دسمبر ۱۹۴۸ کو منظور کیا۔

پر دھیاں نہیں دیا سرمایہ دار جو چاہتے تھے وہ کرتے رہے ..... کارخانہ دار عورتوں اور کم سن بچّوں کو بڑی تھوڑی مزدوریوں پر رکھ لیتے تھے، کام کا وقت زیادہ ہونے سے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے اور جوانی میں مر جاتے تھے ......[۱]"

یورپ میں، انسانی حقوق کی تحریک کا یہ مختصر سا تاریخی جائزہ تھا، انسانی حقوق کے تمام منشوروں میں جو مطالب ہیں وہ اہل یورپ کے لیے نئے ہیں لیکن ہمیں علم ہے کہ اسلام میں چودہ صدی پہلے یہ بتایا جا چکا تھا، اور کچھ عرب اور ایرانی دانش وران اعلامیوں کے تقابلی مطالعے میں یہ بات کر چکے ہیں اور کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ ہاں، اعلامیے اور اسلام کے ضوابط میں کہیں کہیں اختلاف ہیں، اور یہ بحث بڑی خوش گوار و دل کش ہے۔ ان مسائل میں ایک مسئلہ "حقوقِ زن و مرد" کا مسئلہ ہے۔ اسلام مساوات کا قائل ہے اور مشابہت و یکسانیت اور اکائی کو "حقوق زن و مرد" میں تسلیم نہیں کرتا۔

انسان کی حیثیت اور حقوق:

"چونکہ افراد خاندان بشری کے تمام افراد کی ذاتی حیثیت کی پہچان اور ان کے ناقابل تبدیل (و انتقالی) و یکساں حقوق، آزادی و عدالت اور صلح کی بنیاد مہیا کرتی ہے۔

چونکہ پہچان نہ ہونے اور حقوق بشری کے حقوق کی تحقیر وحشیانہ عمل پر تمام ہوتی ہے، جو روح بشریت کو سرکشی پر ابھارتی ہے۔ اور ایسی دنیا کا وجود، جسمیں تمام افرادِ بشر اپنے عقیدے کے اظہار میں آزاد ہوں، خوف اور غربت سے مطمئن ہوں انسان کی آرزو کی بلند ترین دنیا کا اعلان کیا جاتا ہے۔

چونکہ، اساسی طور پر حقوق انسانی کو، نفاذِ قانون کے ذریعے حمایت کی جانی ہے۔

---

[۱] نیول ہسٹری یونیورسل ج ۴ ص ۵۸۷۔

تاکہ انسان ظلم اور دباؤ کے خلاف آخری علاج کے لیے اٹھنے پر مجبور نہ ہو۔

چونکہ اساسی طور لازم ہے قوموں میں باہمی دوستانہ تعلقات کو پھیلایا جائے (لہذا) اس بات کی ہمت افزائی کی جاتی ہے۔

چونکہ اقوام متحدہ کے عوام نے انسانی بنیادی حقوق اور فردِ انسان کی قدر و منزلت اور عورت و مرد کے حقوق کی برابری کا پھر سے اعلان کیا ہے اور پختہ ارادہ کیا ہے کہ اجتماعی ترقی میں مدد کریں گے اور اچھے ماحول میں زندگی کی شکل صورت بہتر بنائیں گے۔

چونکہ ......

عام اجلاس اس اعلامیہ جہان حقوق بشر کو تمام عوام اور تمام اقوام کی مشترک تمنا کے طور پر اعلان کرتا ہے تاکہ تمام افراد اور معاشرے کے تمام ارکان اس اعلامیے کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھیں اور پوری کوشش کریں کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے ان حقوق اور آزادیوں کے احترام کا دائرہ وسیع ہو اور قومی، نیز بین الاقوامی تدریجی کوششوں سے ان اقدار کی پہچان اور ان کا واقعی اور زندہ نفاذ، خود ممبر قوموں اور ان کے ممالک میں رہنے والے عوام میں۔ وجود پذیر ہو۔"

مندرجہ بالا سنہری فقرے انسانی حقوق کے بین الاقوامی (پوری دنیا کے لیے) اعلامیے کے مقدمے میں درج ہیں، یہ وہی اعلامیہ ہے جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

"سب سے بڑی کامیابی ہے جو آج کی تاریخ تک انسانی حقوق کی تائید میں عالم بشریت کو نصیب ہوئی ہے۔"

اس کا ہر جملہ سوچا سمجھا ہے۔ جیسا کہ سابقہ مقالے میں لکھ چکا ہوں کہ یہ جملے صدیوں کے فلاسفہ اور آزادی طلب اور قانون دانانِ عالم کے افکار کی نمائندگی کرتے ہیں۔

منشورِ حقوقِ انسانی کے اہم نکات:

منشور، تیس دفعات میں مرتب ہے۔ اس سے قطع نظر کہ بعض دفعات میں

کچھ مطالب مکرر یا کم از کم بعض دفعات میں بیان شدہ مطالب دوسری جگہ کے بیان کردہ مطالب سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔ یا کچھ مطالب ایسے بھی ہیں جن کو الگ پیرا گراف میں ہونا چاہئے تھا۔

اس مقدمے کے چند اہم نکات ایسے ہیں جن پر توجہ کرنا ضروری ہے:

(۱) حیثیت، احترام اور ناقابل انتقال ذاتی حقوق میں انسان ایک ہی نوع سے بہرہ مند ہے۔

(۲) انسان کی حیثیت، احترام اور ذاتی حقوق، کلی اور عمومی ہیں جو تمام انسانی افراد کو آغوش میں لیتے ہیں۔ ان میں تفریق نہیں ہے۔ سفید و سیاہ، بلند اور پستہ قد، زن و مرد سب ان میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ جیسے خاندان کے تمام ممبروں میں سے کسی ایک کو اپنے نسب میں دوسروں پر فوقیت اور اعزاز و نجابت جتانے کا حق نہیں، اسی طرح تمام افراد بشر ایک بڑے خاندان کے ممبر اور ایک جسم کے اجزا ہیں، شرافت و اعزاز میں برابر ہیں۔ کوئی شخص اپنے تئیں دوسرے فرد سے زیادہ معزز سمجھنے کا حق نہیں رکھتا۔

(۳)۔ آزادی و صلح و عدالت کی اساس یہ ہے کہ تمام افراد دل کی گہرائیوں سے تمام انسانوں کی حیثیت اور ذاتی احترام کی واقعیت پر ایمان رکھیں اور اعتراف کریں۔

یہ اعلامیہ کہنا چاہتا ہے:

تمام افراد بشر جو ایک دوسرے کے خلاف بے چینیاں پھیلاتے ہیں۔ ان کا سرچشمہ دریافت کر لیا گیا ہے، لڑائیوں کا پھیلنا، ظلم اور دست درازیوں کا ہونا، اور ایک دوسرے کے خلاف وحشیانہ کارگزاریوں کا مرکزی نقطہ انسان کے ذاتی احترام اور اس کی حیثیت سے ناآشنائی ہے۔ چند افراد کی یہ ناآشنائی (ناواقفیت) اپنے حریف کو سرکشی اور نافرمانی پر ابھارتی ہے اسی سبب سے صلح و امن کی راہ خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

(۴) ۔ سب کو مل کر جس بلند ترین آرزو کے حصول کی جد و جہد کرنا چاہیے ، وہ ایک ایسی دنیا کی تخلیق ہے ، جس میں عقیدہ و امن اور مادی خوش حالی مکمل طور پر موجود ہو گھٹن ، خوف اور افلاس کی جڑیں اکھڑی ہوئی ہوں ، اس تمنا کو رو براہ لانے کے لیے اعلامئے کے تیس دفعات مرتب کیے گئے ہیں ۔

(۵) انسان کی ذاتی حیثیت پر یقین اور ناقابلِ سلب و انتقال حقوق کا احترام تعلیم و تربیت کے ذریعے تمام انسانوں میں پیدا کیا جائے ۔

مقام و احترام انسان :

حقوق انسانی کا منشور ، چونکہ احترام انسانیت و آزادی و مساوات کی بنیاد پر مرتب اور انسانی حقوق کا احیا کی خاطر وجود پذیر ہوا ہے ، اس لیے ہر صاحب وجدان (و احساس) انسان کے لیے احترام و عزت کے لائق ہے ۔ ہم مشرق کے باشندے مدتوں سے انسان کی قدر و احترام کا دم بھر رہے ہیں ۔ جیسا کہ سابقہ مقالے میں کہہ چکا ہوں ، دینِ مقدسِ اسلام میں انسان ، حقوق انسان ، آزادی اور باہمی برابری کی بڑی قیمت اور احترام ہے ۔ اس منشور کے لکھنے والے اور وہ فلسفی حضرات جو حقیقی طور پر اس فکر کے خالق اور لکھنے والوں کو اشارے دینے والے ہیں ۔ ہمارے احترام و تعظیم کے لائق ہیں ۔ لیکن چونکہ یہ متن ایک فلسفیانہ اعلان ہے ، فرشتے نہیں ، انسانوں کے ہاتھوں سے لکھا گیا ہے ۔ انسانی افراد نے استنباط و حاصلِ فکر پیش ، کیا ہے ، لہٰذا ہر فلسفی کو حق ہے وہ اس کا تجزیہ و تحلیل کرے اور اگر اتفاقاً کہیں کمزوری نظر آئے تو اس کی یاد دہانی کرائے ۔

یہ اعلامیہ / منشور کمزور مقامات سے خالی نہیں ، مگر ہم اس مقالے میں کمزور نکات کے بجائے نقطۂ قوت پر انگلی رکھیں گے ۔

اس منشور کا سارا زور " انسان کے ذاتی مقام " پر ہے ، شرافت اور انسان کی

ذاتی حیثیت اس اعلامیہ کے نقطۂ نظر سے انسان ایک نوع ہونے کے ناتے، خصوصی کرامت وشرافت اور حقوق اور آزادیوں کے ایک سلسلے کا براہ راست مالک ہے۔ جبکہ دوسرے جاندار اس ذاتی حیثیت وشرافت وکرامت نہ رکھنے کی وجہ سے ان حقوق اور آزادیوں سے بہرہ ور نہیں ہیں۔ اس اعلامیہ کا نقطۂ قوت یہی ہے۔

مغربی فلسفوں میں انسان کا تنزل اور گراوٹ:

اب یہاں پھر ایک مرحلہ آگیا ہے کہ ہم دوبارہ اسی پرانے فلسفی مسئلے پر توجہ مبذول کریں:

انسانی قدر وقیمت کی دریافت، پوری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کی شرافت ومقام، انسان کی قابلِ احترام شخصیت، آئیے پوچھیں:

انسان کی وہ ذاتی حیثیت کیا ہے جس کی بنیاد پر وہ ان حقوق کا مالک بن گیا اور گھوڑے، گائے اور بکری اور کبوتر سے ممتاز ہوگیا؟

یہاں، منشورِ حقوقِ انسانی اور مغربی فلسفے میں انسانی قیمت کی دریافت کے درمیان اساسی تناقض (ایک دوسرے کی مخالفت) کھل کر سامنے آتی ہے۔

مغربی فلسفے میں برسوں سے انسان اپنی قیمت واعتبار کھو چکا ہے۔ گذشتہ باتوں میں انسان، اور اس کے مرتبۂ بلند کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کی جڑیں سرزمین مشرق میں تھیں۔ آج یہ باتیں مغرب کے اکثر فلسفہ نظاموں میں مذاق اور توہین کی نظر سے دیکھی جارہی ہیں۔

ایک یورپین کی نظر میں انسان، مشین کی حد تک پستی میں آگیا ہے، اس کی روح اور اصالت مقامِ انکار میں واقع ہو چکی ہے۔ کسی علتِ غائی، مقصدِ تخلیق اور طبیعت کے معین مقصود کا عقیدہ رجعت پسندی سمجھا جاتا ہے۔

مغرب میں انسان کے اشرف المخلوقات کے نام کا دم نہیں بھر سکتے کیونکہ یورپ

کے عقیدے میں، انسان کا اشرفِ مخلوقات ہونا، تمام مخلوقات کا انسان کا طفیلی ہونا، ساری دنیا کا مسخرِ انسان ہونا، بطلیموس کے اس پرانے فلسفے کی بات ہے جو غلط ہو چکا، زمین و آسمان کی ہیئت، آسمان کی مرکزیت اور آسمانی کروں کا زمین کے گرد گھومنا سب باطل ہو چکا تو اب انسان کے اشرفِ مخلوقات ہونے کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے۔ یورپ کی نظر میں یہ انسان کی خود پسندی تھی جو اس دور میں انسان کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی۔ آج کا انسان عاجزی اور انکساری اختیار کر چکا ہے، دوسرے موجودات کی طرح وہ اپنے وجود کو ایک مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہیں جانتا۔ خاک سے نکلا، خاک میں مل کر ختم ہو جائے گا۔

یورپ کا انسان "عاجزانہ" طور پر، روح کو وجودِ انسانی کا مستقل پہلو نہیں مانتا وہ اپنے وجود اور گھاس پھوس اور حیوان میں اس جہت سے فرق کا قائل نہیں ہے۔ یورپ کا انسان، فکر و عمل روح اور پتھر کے کوئلے کی گرمی میں ماہیت و جوہر کے اعتبار سے فرق نہیں کرتا، وہ سب کچھ مادّے اور انرجی کا کرشمہ جانتا ہے۔ یورپ کے انسان کی رائے میں، زندگی کا میدان تمام جاندار مخلوق کے لیے۔ جن میں وہ خود بھی ہے۔ خونی میدان ہے، جسے زندگی نے ختم نہ ہونے والی جنگ سے وجود بخشا ہے۔ تمام، جان رکھنے والی مخلوق پر ایک اصل دکلیہ، حکمراں ہے اور وہ اصل تنازع للبقا ہے۔ انسان مسلسل کوشش کر رہا ہے کہ اس جنگ سے خود کو بچالے، عدالت، نیکی، تعاون، اور خیر خواہی جیسے بہت کے اخلاقی اور انسانی مفہوم اسی "بنیادی اصل" تنازع للبقا کے پیدا کردہ ہیں۔ انسان نے ان مفاہیم کو اپنی جگہ بچانے کے لیے خود وضع کیا ہے۔

کچھ طاقت ور مغربی فلسفیوں کی رائے میں انسان مشینی ہے جسے صرف اقتصادی منافع چلاتے ہیں، دین و اخلاق، فلسفہ و علم و ادبیات و ہنر سب کچھ اوپر کی لیپا پوتی ہے۔ اس کے نیچے پیداوار، تقسیم، دولت کا ہیر پھیر ہے۔ یہ تمام جلوے اور

زندگی کے مظاہر ہے، انسانی زندگی کے اقتصادی پہلو ہیں۔

نہیں جناب، انسان کے لیے یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ اصل محرک اور تمام حرکات اور عمل کی گردش کا بنیادی عامل تو جنسی خواہش ہے۔ اخلاق و فلسفہ، علم و دین و ہنر سب لطیف تجلیاں اور مظاہر ہیں، انسان کے وجود کا عامل تو جنسی احساس ہے۔[۱]

سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر طے ہے کہ مخلوقات کو بے مقصد مانیں، اور طبیعت اندھوں کی طرح عمل کر رہی ہے۔ یہی عقیدہ بنالیں۔

اگر انواع جاندار مخلوقات کی زندگی کی ضمانت کا قانون صرف "تنازع للبقا" ہے، بہتر سے بہتر کا انتخاب ہے۔ باقی سب تبدیلیاں مکمل طور پر اتفاقی ہیں، انسان کی بقا اور موجودیت اتفاقی و بے مقصد تبدیلیوں کے سبب ہے، کئی ملین برسوں سے اس کے اجداد نے دوسری انواع مخلوق پر جرموں کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے اور اب تک وہ سلسلہ موجودہ صورت میں چل رہا ہے۔ یہی فلسفہ صحیح ہے؟!

اگر یہ ماننا ضروری ہے ــــ کہ انسان ان مشینوں کا نمونہ ہے جو اب وہ خود اپنے ہاتھوں بنا رہا ہے۔

اگر یہی مان لیا گیا ہے کہ روح کا یقین، اصالت اور اس کی بقاء کا عقیدہ خود ہی خود خواہی و خود پسندی اور اپنے بارے میں غیر معمولی مبالغہ ہے۔

---

[۱] فرائڈ کے فلسفہ جنسیت کی طرف اشارہ ہے، فرائڈ آرٹ کی سب قسمیں حتی بچے کے دودھ پینے کے عمل سے بڑھاپے تک وہ ہر مرحلے میں جنسیت ہی محسوس کرتا ہے اور اس کے بعد دوسرے فلسفی کلیات و نتائج جدید مفکروں کے مسلمات اور یورپ کی فکری نظام کی موجودہ حد بندی کرنے والے ہیں۔

اگر ثابت ہو چکا ہے کہ۔ انسان میں اصلی محرک اقتصادی یا جنسی یا بالادستی کا جذبہ ہے۔

اگر بنیادی بات یہی ہے کہ نیک و بد، اچھائی اور برائی مجموعی طور پر اضافی ہیں اور فطرت و وجدان کی آواز مہمل خیال ہے۔

اگر انسان جنس کے لحاظ سے شہوت اور خواہشاتِ نفسانی کا غلام ہے اور قوت کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا۔

اگر....

اس کے بعد، انسان کی حیثیت اور شرافت اور ناقابلِ سلب حقوق۔ اور انسان کی قابلِ احترام شخصیت کا دم بھرنا اور اس کو تمام اقدامات کا نصب العین و مقصد بنانا کیسے ممکن ہے!

مغرب انسان کے بارے میں تضاد و تناقض سے دوچار ہے۔

مغربی فلسفے سے جہاں تک ہو سکتا تھا اس نے انسان کی ذاتی حیثیت کو نقصان پہنچایا اور انسانیت کا مقام تحت الثریٰ تک پست کیا۔ ایک طرف کو تو مغرب کا فلسفہ، تخلیقِ انسان اور اس کے وجود کی علت و غرض کے زاویے سے۔ اس کی تخلیق میں کارخانۂ تخلیق کے عمل کے زاویے سے۔ اس کے ڈھانچے اور اس کے وجود کے تانے بانے اور ہستی کے زاویے سے۔ اس کے محرکاتِ عمل کے نقطۂ نظر سے۔ اس کے وجدان و ضمیر کے لحاظ اس حد تک نیچے گرایا جس کا کچھ تذکرہ ہم نے کیا۔

اس کے بعد ایک قد آور اعلان شائع کیا جس میں انسان کی قیمت، اس کا مقام حیثیت اور کرامت و ذاتی شرافت اور مقدس حقوق، ناقابلِ تبدیلی اور ناقابلِ سلب اختیارات کا ڈھول بجایا گیا۔ اس فرمان میں تمام افرادِ بشر کو دعوت دی گئی کہ اس منشور پر ایمان

لائیں۔

مغرب پر فرض تھا، پہلے وہ انسان کی جو تشریح کر چکا ہے اس پر نظرِ ثانی کرے اس کے بعد بلند بالا اعلامیۂ حقوق مقدس فطریِ انسان صادر کرے۔

میں یہ مانتا ہوں، سب مغربی فلسفی انسان کی وہی تشریح نہیں کرتے جس کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔ بہت سے حضرات، کم و بیش انسان کی وہ تعبیر بھی کرتے ہیں جو مشرق والے کرتے ہیں۔ مگر میری نظر اس انداز فکر پر ہے جس نے مغرب کی اکثریت کو متاثر کیا ہے اور جس سے دنیا بھر کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔

انسانی حقوق کا منشور اسے صادر کرنا چاہیے۔ جو انسان کو ایک مادی مرکبات سے تیار شدہ مشین سے بلند تر درجے پر فائز جانتا ہو۔ جو انسان کے محرکات اور ارادوں کو حیوانی اور شخصی رجحانات کا مجموعہ نہ مانتا ہو۔ جو انسان کے لیے انسانی وجدان کا قائل ہو۔ اعلامیۂ بشر، مشرق کو صادر کرنا چاہیے جو قانونِ ۔ اِنّی جَاعِلٌ فِی الارضِ خلیفَۃً[۱] میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ پر ایمان رکھتا ہو۔ اور انسان میں خدا کی جلوے ڈھونڈھتا ہو۔

حقوقِ انسانی کا نعرہ اسے لگانا چاہیے جو انسان کے سیر و سفر کے لیے ایک منزل کا قائل ہو اور یہ مانتا ہو کہ انسان اس منزل کے لیے راستے کی مشقتیں جھیلتا ہے:

یا ایھاالانسان انک کادح الی ربک کدحا فملاقیہ[۲]

اے انسان! تو اپنے رب کی حضوری کے لیے کوشش کر رہا ہے تو ایک نہ ایک دن اس کے سامنے حاضر ہو گا۔

انسانی حقوق کا منشور شایع کرنے کا حق اس نظام فلسفہ کو حاصل ہے، جو قانونِ "و نفس وما سواھا فالھمہا فجورھا و تقواھا[۳]" کا قائل ہو۔ اور قسم ہے جان کی اور جس نے

---

۱ البقرہ/۳۰ ۲ الانشقاق/۶ ۳ الشمس/۷-۸

اسے ہموار بنایا، پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری اسے سمجھائی۔ (قرآن) جو انسان میں بھلائی کے رجحانات مانتا ہو۔

انسانی حقوق کا منشور جاری کرنے کا اسے حق ہے، جو انسانی سرشت کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہو، اور اس کی سرشت کو معتدل ترین و کامل ترین سمجھتا ہو کہ۔ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم"[1] یہی مطالبہ کرتا ہے ۔ یعنی ۔ ہم نے انسان کو بہترین اندازے پر بنایا ہے۔

مغربی طرزِ فکر کے شایانِ شان بات منشور حقوق انسانی نہیں ہے کہ وہ انسان کی یہ تشریح کرتے ہی نہیں۔ ان کو تو وہی طریقے جاری کرنا چاہیے جسے مغرب عملی طور پر انسان کے لیے جائز سمجھتا ہے۔ یعنی انسانی احساسات کا قتلِ عام، سرمایہ داری کی بے پناہ قوت، انسان پر دولت کی برتری، مشین کو معبود سمجھنا، ثروت کی خدائی، انسانوں سے بیگار۔ حالت یہ ہے کہ اگر اتفاقاً ایک ملیونر اپنی کروڑوں کی جائداد اپنے بعد اپنے کتے کے نام لکھ جائے تو اس کتے کا اعزاز آدمی زادے بڑھ جاتا ہے، دولت مند کتے کے لیے نہ معلوم کتنے آدمی پیشکار و نوکر کی طرح حاضر رہتے ہیں۔ منشی، اسسٹنٹ نوکر رکھے جاتے ہیں اور دست بستہ لوگ اس کے سامنے حاضر رہتے اور تعظیم کرتے ہیں۔

مغرب نے خود کو بھی بھلا دیا اور خدا کو بھی

انسانی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان نے بہ تعبیر قرآن "خود" کو بھی بھلا دیا ہے اور خدا کو بھی، بڑی بات یہ ہے کہ "خود" کی توہین کی ہے "درون بینی" اور "ضمیر و باطن" سے توجہ ہٹالی، حسی اور مادی دنیا میں اپنی نظر کو محدود

---

[1] التین / ۴

کردیا، مادیات کا مزہ چکھنے کے علاوہ کوئی مقصد نہ دیکھتا ہے نہ سوچتا ہے، خلقت کو بے مقصد سمجھتا ہے، خود اپنا انکار کرتا ہے، اپنی روح ہاتھ سے دے بیٹھا ہے۔ آج کے انسان کی اکثر بدنصیبیوں کا سرچشمہ یہی انداز فکر ہے۔ افسوس، کہ یہ سوچ دنیا پر چھائی جا رہی ہے۔ انسان کے بارے میں اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمدن جس قدر پھیلتا اور عظیم تر ہوتا جاتا ہے متمدن اسی قدر حقارت میں گرتا جا رہا ہے۔ انسان کے بارے میں یہ طرز تفکر کا موجب ہوا کہ واقعی انسان ہمیشہ ماضی میں تلاش کیا جائے اور آج کے تمدن کے بڑے کارخانے کی دست رس میں ہے کہ ہر اعلیٰ درجے کی چیز تیار کر دے، بس، انسان نہیں بنا سکتی۔

گاندھی کہتے ہیں:

"یورپ والے زمین کی خدائی کا لقب حاصل کرنے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے زمین کی تمام نعمتیں اور ان کے امکانات قبضے میں کر لیے اور ان کے مالک بن بیٹھے، دوسری قومیں اسے خدا کی قدرت سمجھ بیٹھیں، لیکن اہل یورپ ایک چیز سے عاجز رہے، اور وہ اپنے اندر تامل کرنا ہے، چھوٹے نئے تمدن کی جھلک چمک کو مہمل سمجھنے کے لیے اتنی ہی دلیل کافی ہے۔

اگر مغربی تمدن نے اہل مغرب کو شراب نوشی اور جنسی عمل پر اکسایا ہے تو اس کا سبب "خود تلاشی" کو بھلانا اور ضایع کرنا ہے۔

...... اس کی عملی قوت نے اسے انکشاف، ایجاد اور وسائل جنگی تیار کرنے پر اس لیے ابھارا کہ وہ "اپنے آپ" سے فراری ہے، اسے غیر معمولی قدرت اور تسلط اپنے اوپر باقی نہیں رہا...... تنہائی اور خاموشی سے خوف، اور دولت سے وابستگی نے مغربی انسان کو اندر کی صدا سننے سے معذور بنا دیا، اس کی مسلسل عمل و کارکردگی کا ایک محرک یہی ہے۔

دنیا فتح کرنے کی ہوس کا باعث ہے "اپنے اوپر حکومت" نہ کر سکنے کی ناتوانائی ہے۔ اسی بنا پر مغرب کا انسان پوری دنیا میں بحران و فساد پھیلا رہا ہے ..... آدمی جب اپنی روح کھو دے تو عالم کی فتح اس کے کس مرض کی دوا ہوگی ..... جن لوگوں کو انجیل نے یہ تعلیم دی کہ وہ حقیقت، محبت اور صلح کے مبشر ہیں وہ لوگ سونے اور غلاموں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ خداوند کی بادشاہی میں انجیل کی تعلیم کے مطابق بخشش و دولت عدالت کی جستجو کرنے کے بجائے اپنے گناہوں اور اپنی برائیوں سے صفائی کے لیے مذہب کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ کلام الٰہی شایع کرنے کے بجائے قوموں کے سروں پر بم برساتے ہیں ...."

اسی سبب سے انسانی حقوق کا منشور دوسروں سے زیادہ بڑھ چڑھ کر خود اہل یورپ نے ٹھکرایا، جو فلسفہ اہل مغرب نے عملی زندگی میں اپنا رکھا ہے اس کے بعد خود اہل مغرب کے لیے سوائے منشور حقوق انسانی، غلط قرار دینے کے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہا۔

چھٹا حصّہ

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں

- ــــــ کتاب خلقت، انسان کے اصلی حقوق پہچنوانے کی تنہا سندی کتاب حوالہ ہے؟
- ــــــ "مدنی" معاشرے میں باہمی قرارداد کا پہلو اور عائلی معاشرے میں فطری پہلو کا غلبہ ہوتا ہے۔
- ــــــ عائلی حقوق میں چار زمانوں کا مفروضہ، سوشلزم کے مفروضۂ مالکیت کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔
- ــــــ کیا میاں بیوی دو حقوقی فطرتیں رکھتے ہیں؟

(خلاصۂ مطالب از مؤلف)

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں

(۱)

انسانی حقوق کا منشور اس بنیاد اور روح پر قائم ہے کہ انسان ایک نوع کی حیثیت اور ذاتی شخصیت کی بنا پر قابل احترام ہے، اور عین خلقت و آفرینش میں، حقوق اور آزادیوں کا ایک سلسلہ اسے عطا کیا گیا ہے جنھیں اس سے نہ چھینا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔ ہم اس پر گفتگو کر چکے۔

یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس روح و اساس کو اسلام کی تائید حاصل ہے، اور مشرقی فلسفے بھی اس کے حق میں ہیں۔ اس منشور کی روح و اساس سے جو بات جوڑ نہیں کھاتی اور اسے بے بنیاد ظاہر کرتی ہے، وہ مغربی فلسفوں کی وہ بہت سی تشریحیں ہیں جو انسان اور اس کی ہستی کے تانے بانے کے بارے میں کی جاتی ہیں۔

یہ بات دلیل کی محتاج نہیں کہ انسانی حقوق پہچاننے کے لیے فقط ایک کتاب ایسی ہے جو حوالہ بننے کی پوری گنجائش رکھتی ہے، اور وہ ہے آفرینش کی بیش بہا کتاب، اس عظیم کتاب کے صفحے صفحے اور سطر سطر میں انسانوں کے اصلی حقوق مشترک اور زن و مرد کے ایک دوسرے کے مقابلے میں حقوق کے خدوخال پہچانے جا سکتے ہیں۔

تعجب ہے۔ بعض سادہ دل، کسی طرح تیار نہیں کہ اس عظیم کتاب حوالہ کو سندی درجہ دیں۔ ان لوگوں کے نزدیک حوالے کی تنہا صلاحیت و سندیت ان لوگوں کو حاصل ہے جنھوں نے "منشور" کی تیاری میں حصہ لیا اور آج سارے جہان

کی قیادت وحکومت کے مدعی ہیں۔ چاہے، وہ خود اس اعلامیے کے دفعات کی پابندی نہ کریں۔ دوسروں کو بہرحال یہ حق نہیں ہے کہ ان کی بات میں چون وچرا کریں۔ لیکن ہم انھیں "حقوق انسانی" کے حوالے سے "چون وچرا" کا حق رکھتے ہیں اور تخلیق کے عظیم کارخانے کو اللہ کی بولتی کتاب جانتے اور اسی کو اکیلا سندی حوالہ ملنتے ہیں۔

محترم قارئین!

معذرت خواہ ہوں، مقالات کے سلسلے میں کچھ مسائل ایسے آگئے جن میں فلسفے کا رنگ اور ذرا خشکی محسوس ہوتی ہو گی، ممکن ہے بعض حضرات اس سے تھکن بھی محسوس کرتے ہوں، میں حتی الامکان ایسے مسائل سے پہلو بچاتا ہوں لیکن مسائل حقوقِ خواتین کے ذیل میں کچھ خشک فلسفیانہ بحثوں کا آنا ضروری اور ان سے بچنا ممکن نہیں تھا۔

طبیعی حقوق اور طبیعت کی مقصدیت میں ربط

ہمارے نزدیک۔ طبیعی وفطری حقوق وہاں سے پیدا ہوتے ہیں، جہاں، قوتِ تخلیق نے اپنی روشن نگاہی اور مقصدیت کے پیش نظر، موجودات کو ان کمالات کی طرف رواں کیا ہے جن کی صلاحیت ان کے وجود میں ودیعت فرمائی ہے۔

ہر فطری صلاحیت ایک "طبیعی حق" کی بنیاد ہے اور اسے ایک "طبیعی سند" حاصل ہے۔ مثلاً انسان کا بچہ، پڑھنے اور اسکول جانے کا حق رکھتا ہے، بکری کے بچے کو یہ حق حاصل نہیں، کیوں؟

کیونکہ، انسان کے فرزند میں سبق پڑھنے اور دانشور بننے کی صلاحیت ہے اور وہ انسان کا فرزند ہے۔ لیکن بکری کے بچے میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔

قوت تخلیق نے وجود انساں میں اس مطالبے کی دستاویز رکھی ہے اور وجود گوسفند میں یہ دستاویز نہیں رکھی۔

سوچنے، ووٹ دینے، آزاد ارادہ رکھنے کا حق بھی اسی طرح ہے۔

کچھ لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ "فطری حقوق"، کا مفروضہ اور یہ کہ خلقت و پیدائش نے انسان کو ایک قسم کے حقوق سے خصوصیت دی ہے۔ گھٹیا دعوی اور خود پسندی کی بات ہے۔ اس مفروضہ کو دور کر دینا چاہیے۔ انسان و غیر انسان میں حقوق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

نہیں، بات یوں ہی نہیں۔ فطری صلاحیتوں میں اختلاف ہے۔ قوۃ خلاقہ (خالق اکبر) نے انواع موجودات میں ہر قسم کو ایک دائرۂ حرکت دیا ہے اس کو اسی قسم کی سعادت عطا کی ہے وہ موجود اپنے مدار میں حرکت کرتا ہے۔ قوت تخلیق نے بھی ایک غرض معیّن کی ہے۔ یہ دستاویزیں اتفاق اور بے خبری کے عالم میں ان موجودات کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں۔

معاشرتی حقوق:

تمام افراد انسانی خاندانی (عائلی) حقوق کے علاوہ اجتماعی (معاشرتی) حقوق کے مالک ہیں انسان خاندان کے دائرے سے نکل کر ایک بڑے معاشرے میں، ایک دوسرے کے مقابلے میں کچھ حقوق پیدا کرتے ہیں۔ یہ حقوق مساوات کی بنیاد اور مشابہ صورتِ حال کی وجہ سے مساوی حقوق بھی رکھتے ہیں اور مشابہ حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یعنی ان کے ابتدائی فطری حقوق ایک دوسرے کے برابر اور ایک دوسرے کے مانند ہیں۔ سب کو ایک جیسا حق ہے کہ کائنات کے انعامات سے فائدہ اٹھائیں۔ سب کو مماثل حق حاصل ہے، کام کریں۔ سب کو مماثل حق ہے زندگی کے میدان میں ہونے والی دوڑ میں شرکت کریں اور آگے بڑھیں سب کو برابر کا حق ہے کہ سماجی منصبوں میں سے جس منصب کے لیے چاہیں اپنا نام پیش کریں، پھر اسے حاصل کرنے کے واسطے جائز طریقے استعمال کریں۔ سب کو برابر کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی علمی و عملی صلاحیتوں کو ظاہر کریں۔

ہاں، یہی ابتدائی فطری حقوق کی مساوات آہستہ آہستہ اکتسابی اور عملی حقوق میں غیر مساوی حقوق کی صورت پیدا ہونے لگتی ہے۔ یعنی سب کو برابر کا حق ہے، کام کریں زندگی کی دوڑ میں مقابلہ کریں، مگر جیسے ہی اس مقابلے میں ذمے داری ادا کرنے اور مقابلے میں حصہ لینے کا مرحلہ آتا ہے، پھر مقابلے میں سب دریلے سے ایک طرح نہیں نکلتے کچھ لوگوں کی صلاحیتیں زیادہ ہیں کچھ کی کم ہیں۔ بعض زیادہ کام کرنے والے ہیں، کچھ کم بعض زیادہ علم رکھنے والے ہیں، زیادہ باکمال ہیں، بڑے ہنرمند ہیں، زیادہ کارآمد ہیں زیادہ لائق ہیں۔ قہری نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے حاصل کردہ حقوق غیر مساوی ہوں گے اور اگر ہم ان کے حاصل کردہ حقوق کو ابتدائی فطری حقوق کی طرح مساوی حقوق کی صف میں کھڑا کر دیں تو ہمارا یہ عمل ظلم وستم کے علاوہ کچھ نہ ہوگا!

کیا معاشرتی اور ابتدائی فطری حقوق کے لحاظ سے تمام افراد کی حیثیت مساوی اور مشابہ ہے؟

انسانی حالات کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ افرادِ بشر میں کوئی بھی حاکم یا محکوم، افسر یا ماتحت، سپاہی یا وزیر نہیں پیدا ہوا، یہ خصوصیات اکتسابی حقوق ہیں اور افراد کو قابلیت وصلاحیت وکارکردگی کے ذریعے معاشرے سے اپنا یہ حق لینا چاہیے — معاشرہ بھی ایک طے شدہ قرارداد کے ذریعے یہ حق دیتا ہے۔

انسان اور حیوان کی معاشرتی زندگی میں یہی فرق ہے جیسے شہد کی مکھی، اس طرح کے حیوانات کی زندگی کا ڈھانچہ فی صد فطری ہے ان کے منصب اور ان کے کام فطرت نے تقسیم کر دیے ہیں خود انھیں کوئی اختیار نہیں۔ فطری طور پر ان میں کوئی حاکم ہے کوئی محکوم، کوئی کاری گر ہے کوئی انجنیئر، کوئی پہرے دار پیدا ہوا ہے۔ انسانی معاشرہ اس طرح کا نہیں ہے۔

اسی وجہ سے بعض دانشوروں نے، قدیم فلاسفہ کے نظریے کو رد کر دیا ہے کہ

"انسان فطرتاً معاشرتی مخلوق ہے"۔ یہ دانش ور کہتے ہیں کہ نہیں، انسانی معاشرہ سو فی صد طے شدہ اصولوں کا پابند ہے۔

عائلی حقوق: یہ غیر خانوادگی و عائلی (گھریلو) معاشرے کی بات تھی۔ گھریلو معاشرہ کیا ہے؟ کیا افراد، گھریلو معاشرے میں ابتدائی فطری حقوق میں مشابہت و یکسانیت رکھتے ہیں اور اکتسابی حقوق میں فرق ہے؟ یا، گھریلو معاشرہ یعنی وہ معاشرہ جس میں میاں بیوی، ماں باپ، اولاد اور بہن بھائی ہوں۔ غیر خاندانی معاشرے سے ابتدائی حقوق میں فرق رکھتا ہے اور فطرت کے قانون نے خاندانی حقوق کو خاص شکل و صورت میں وضع کیا ہے۔

یہاں دو مفروضے موجود ہیں:

پہلا مفروضہ: میاں بیوی، باپ بیٹا، ماں اور اولاد ہونا دوسرے معاشرتی اور امداد باہمی جیسے تعلقات کی طرح قومی یا سرکاری اداروں میں اس کا سبب نہیں کہ چند افراد فطری طور پر خاص صورت و حالت حاصل کریں مثلاً ایک افسر بن جائے دوسرا ماتحت، ایک حکمران ہو دوسرا محکوم، ایک زیادہ تنخواہ لے دوسرا کم۔ بیوی یا شوہر، باپ یا ماں اور اولاد ہونا بھی اس کا سبب نہیں کہ اس بنیاد پر وہ خاص پوزیشن حاصل کرے۔ فقط کارکردگی کی بنیاد ہی پر ایک شخص کا منصب معین ہو سکتا ہے۔

"عائلی حقوق میں عورت مرد کے حقوق کی مشابہت" کا مفروضہ۔ جسے غلطی سے "مساوی حقوق" کا نام دیا جاتا ہے۔ اسی فرض کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس مفروضہ کا مطلب یہ ہے کہ زن و مرد (میاں بیوی) کی صلاحیتیں اور ضرورتیں مشابہ ہیں اور مشابہ حقوق کی دستاویزیں فطرت کی طرف سے انھیں مل چکی ہیں اور یوں، خاندانی زندگی میں وہ شریک ہیں لہٰذا عائلی حقوق، یکسانیت، مماثلت اور مشابہت کی بنیاد پر مرتب ہوں۔

دوسرا مفروضہ: نہیں، ان کے ابتدائی طبعی فطری حقوق بھی الگ الگ ہیں۔ شوہر ہونا، شوہر ہونے کی بنا پر خاص فرائض و حقوق ثابت کرتا ہے اور بیوی ہونا، بیوی ہونے کی وجہ سے خاص ذمہ داریوں اور حق ثابت کرتی ہے۔ اسی طرح باپ یا ماں اور اولاد ہونے کی بات ہے۔ بہرحال خاندانی معاشرہ دوسری کمپنیوں اور امداد باہمی کے اداروں سے جدا ہے "عورت و مرد کے عائلی حقوق میں متشابہت نہیں" کا مفروضہ۔ جسے اسلام نے منظور کیا ہے۔ اسی کلیہ پر مبنی ہے۔

ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور اس کے صحیح ہونے کی صورت کیا ہے۔ اس کو سمجھنا ہے۔

عائلی حقوق کی فطری بنیادیں

(۲)

محترم مطالعہ کرنے والے اچھی طرح نتائج دریافت کر سکیں، اس لیے گذشتہ پیراگراف میں جو حقائق عرض کیے ہیں ان کا خلاصہ دیکھتے چلیں:

۱- فطری حقوق، اس لیے پیدا ہوئے کہ فطرت کا ایک مقصد ہے، اس مقصد کی خاطر، موجودات کے اندر صلاحیتیں اور استحقاق ودیعت ہوئے۔

۲- انسان، انسان ہونے کے زاویے سے خاص حقوق اور ان کے سلسلے کا مالک ہے جسے "انسانی حقوق" کا نام دیا گیا ہے۔ حیوانات اس قسم کے حقوق سے بہرہ ور نہیں ہیں۔

۳- فطری حقوق کا تعین اور ان کی پہچان اور کیفیت سمجھنے کے خلقت و تخلیق و پیدائش کا مطالعہ کرنا چاہیے، ہر فطری صلاحیت ایک فطری حق کے لیے ایک فطری دستاویز ہے۔

۴- انسانی افراد تمدنی اور بڑے معاشرے میں فطری حقوق میں مساوی و مشابہ حقوق رکھتے ہیں، البتہ کارکردگی کی بنیاد پر ان میں فرق ہوتا ہے۔ اس کا تعلق کام اور ذمہ داری انجام دینے سے ہے۔ نیز فرائض کی انجام دہی میں مقابلہ دیکھا جاتا ہے۔

۵- چونکہ تمام انسان انفرادی طور پر شہری سماج میں، مساوی اور مشابہ فطری حقوق کے مالک ہیں۔ انسانی فطرت کے مطالعے سے ثابت ہو چکا ہے کہ افراد

انسان دوسرے معاشرت پسند جانداروں کے ۔ جیسے شہد کی مکھی ۔ برخلاف، فطرت کی طرف سے حاکم و محکوم، فرماں روا اور فرماں بردار، مزدور یا کارخانہ دار، جرنیل یا سپاہی بن کر دنیا میں نہیں آیا۔ کام اور منصب اور ذمہ داریاں فطرت نے تقسیم نہیں کی ہیں۔

۶ ۔ خاندانی حقوق میں عورت و مرد کے حقوق کی مشابہت کا مفروضہ اس بات پر قائم ہے کہ خاندانی و عائلی معاشرے کا معاملہ، شہری معاشرے کے معاملے سے جدا ہے۔ زن و مرد، اپنی صلاحیتوں اور ملتی جلتی ضرورتوں کے ساتھ خاندانی زندگی میں شرکت نہیں کرتے، دونوں کے پاس فطرت کی طرف سے عطاکردہ ملتی جلتی دستاویزیں نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے انھیں ملتی جلتی شکل صورت میں نہیں قرار دیا، اس نے ہر ایک کے لیے الگ الگ دائرہ کار اور معین وضع پیش نظر رکھی ہے۔

اب دیکھتے ہیں دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ صحیح ہے اور کس انداز سے ان دونوں مفروضوں کو سمجھا جائے۔؟

اس معیار کی بنا پر جو پہلے مل چکا ہے، دونوں مفروضوں میں سے کون سا مفروضہ صحیح ہے؟ دریافت کرنا زیادہ مشکل بات نہیں۔ عورت و مرد کی فطری صلاحیتوں اور ضرورتوں کا مطالعہ کرلیں۔ بالفاظ دیگر، قانون خلقت نے جو فطری دستاویز ہر ایک کو الگ الگ دی اسے دیکھیں، بات واضح ہو جائے گی۔

خاندانی زندگی فطری ہے یا ۔ باہمی مفاہمتی زندگی؟

ہم، گزشتہ مقالے میں بیان کر چکے ہیں کہ انسان کی "معاشرتی زندگی" کے بارے میں دو نظریے ہیں:

الف ۔ انسان کی معاشرتی زندگی طبعی و فطری ہے۔ اصطلاح میں انسان کو "مدنی بالطبع" کہتے ہیں۔

ب ۔ معاشرتی زندگی ایک مفاہمتی عمل ہے، جسے انسان خود

منتخب کرتا ہے اور اس انتخاب کا سبب اندرونی نہیں بیرونی عوامل کے دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

یہ تو بات ہوئی اجتماعی زندگی کی، خاندانی زندگی کیا ہے؟ یہاں بھی دو نظریے ہیں؟ نہیں!۔ اس مسئلہ میں ایک نظریے کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں ہے۔ خاندانی زندگی سو فی صد طبیعی اور فطری ہے۔ انسان فطرتاً "گھریلو" پیدا ہوا ہے۔ بالفرض، شہری زندگی کے بارے میں فطری ہونے نہ ہونے کی بات ہو بھی، اس وقت بھی انسان کی فطرت میں "گھریلو زندگی" کا انکار نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بہت سے جانور جو فطرتاً اجتماعی زندگی تو نہیں رکھتے اس کے باوجود ایک قسم کی "عائلی زندگی"۔ جوڑا بن کر رہنے کی زندگی۔ بسر کرتے ہیں، جیسے کبوتر اور بعض حشرات جو فطرتاً "جفت" رہتے ہیں۔

خاندانی زندگی کا معاملہ اجتماعی زندگی کے معاملے سے مختلف ہے۔ فطرت میں کچھ ایسا نازک عمل ہوا ہے کہ انسان اور بعض جانور گھریلو زندگی اور خاندانی مرکزیت حاصل کرتے ہیں، انھیں صاحب اولاد ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔

تاریخی قرینے کسی ایسے عہد کی نشان دہی نہیں کرتے جب انسان گھریلو زندگی نہ رکھتا ہو۔ یعنی میاں بیوی الگ الگ زندگی بسر کرتے ہوں۔ یا جنسی تعلقات مشترک اور عمومی رہے ہوں۔ آج، دنیا میں وحشی قبیلے موجود ہیں وہ بھی ایسے نہیں ہیں، انھیں سے ہمیں ماضی کے وحشی قبیلوں کا سماج سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ماضی میں انسانی زندگی ــ ماں کی بادشاہی ــ یا ــ باپ کی بادشاہی کی صورت ہی میں پائی جاتی ہے۔

چار عہدوں کا مفروضہ: ملکیت کے مسئلے میں یہ مسلّم ہے کہ شروع میں مالکیت مشترک تھی، اور نجی و خصوصی ملکیت بعد میں وجود پذیر ہوئی۔ لیکن "جنسیت" کے بارے میں یہ بات نہیں ہے۔

ملکیت ابتداءِ زندگانی انسان میں اس وجہ سے مشترک تھی کہ انسان ایک قبیلہ تھا اور خاندانی صورت رکھتا تھا۔ یعنی قبیلے کے افراد ایک ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ خاندانی احساسات سے بہرہ ور تھے۔ لہٰذا ملکیت بھی مشترک تھی۔

شروع کے ادوار میں فرض کریں کہ قوانین و رسم و رواج نہ تھے، جس کی بنیاد پر عورت مرد دونوں ایک دوسرے کو ذمہ دار اور جواب دہ قرار دیتے۔ اس دور میں خود ان کی فطرت اور طبیعی احساسات ان کو فرائض و حقوق کا پابند کرتے تھے۔ ہرگز ان کی جنسی زندگی بلاشرط و بے پابندی کے نہیں تھی۔ یونہی وہ جانور جو "جفت" زندگی گذارتے ہیں ان کے پاس کوئی اجتماعی یا قرار دادی قانون نہیں رکھتے، اس کے باوجود فطری قانون کے مطابق حقوق و فرائض کی نگہداشت کرتے ہیں اور ان کی زندگی بے شرط و قید و پابندی نہیں ہے۔

بیگم مہرانگیز منوچہریاں نے اپنی کتاب "انتقاد بر قوانین اساسی و مدنی ایران" کے مقدمے میں لکھا ہے:

> "معاشرتی جائزہ رکھنے والے زاویۂ نظر سے زن و مرد کی زندگی زمین کے مختلف خطوں میں چار میں سے ایک راستے سے گذرتی ہے:
>
> ۱۔ فطری مرحلہ۔
>
> ۲۔ مرد کے غلبہ کا دور۔
>
> ۳۔ عورت کے احتجاج کا زمانہ۔
>
> ۴۔ زن و مرد کے مساوی حقوق کی منزل۔
>
> پہلے مرحلے میں زن و مرد، بغیر کسی قید و شرط کے باہم جنسی میل ملاپ رکھتے تھے . . . ."

معاشرہ شناسی کو یہ دعویٰ منظور نہیں۔ جامعہ شناسی و معاشرہ آگاہی زیادہ

سے زیادہ یہ بات مان سکتی ہے کہ کہیں اور اتفاقاً کچھ وحشی قبائل میں چند بھائیوں نے چند بہنوں سے مشترکہ طور شادیاں کی ہوں۔ اور وہ سب بھائی، ان سب بہنوں سے جنسی عمل کرتے ہوں، بچے بھی سب کے مشترک ہوں یا لڑکے لڑکیاں، شادی سے پہلے محدود و مخصوص نہ ہوں لیکن شادی انھیں محدود و مخصوص کر دیتی ہو۔ اور اگر اتفاق در اتفاق بعض وحشی قبائل میں جنسی عمل اس سے بھی زیادہ عام تھا یہاں اصطلاح میں کہہ سکتے ہیں کہ عورت "قومی" ہوتی ہوگی۔ یہ صورت استثنائی ہے، عام دستور اور وضع فطرت سے انحراف۔

ول ڈیورانٹ نے "تاریخ تمدن" جلد اول صفحہ ۵۷ ستاون پر لکھا ہے:

"ازدواج ہمارے حیوانی اجداد کی ایجاد ہے۔ کچھ پرندوں میں دیکھا گیا ہے کہ دراصل ہر پرندہ ایک جفت پر اکتفا کرتا ہے۔ گوریلے اور ننگوٹان، نر و مادہ کا سلسلہ بچے کی پرورش تک باقی رکھتے ہیں، اور یہ تعلق بڑی حد تک عورت مرد کے تعلق جیسا ہوتا ہے، اور جب مادہ کسی دوسرے نر سے نزدیکی کرتی ہے تو اسے اپنے "نر" کی بڑی سختی سہنا پڑتی ہے۔

ڈی کریس پکنی نے بورنیو کے ارنگوٹن کے بارے میں لکھا ہے کہ۔ وہ ایسے خاندانوں میں زندگی گذارتے ہیں جو نر و مادہ اور ان کے بچوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ساواژ (Dr. SAVAGE) نے گوریلوں کے سلسلے میں کہا ہے:۔ ان کی عادت ہے کہ ماں باپ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل اور میوے کھاتے اور آپس میں کھیلتے ہیں۔ ان کے بچے درختوں پر ماں باپ کے گرد ایک شاخ سے دوسری شاخ پر آتے جاتے ہیں۔

شادی تو ظہور انسان سے پہلے تاریخ میں موجود ہے، ایسے سماج جن میں شادی نہ ہو بہت کم ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی تحقیق کرے تو کچھ سماج ڈھونڈھ سکتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ خاندانی (گھریلو) احساس، انسان کا ایک فطری احساس ہے، تمدن یا عادت کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ جیسے، بہت حیوانات فطری اور سرشت کے طور پر خاندانی رجحانات رکھتے ہیں۔

لہٰذا، انسان پر کوئی دور ایسا نہیں گذرا کہ جنس زن اور جنس مرد کلی طور پر، بلا قید و شرط و معاہدہ۔ خواہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہو۔ زندگی بسر کرتے ہوں۔ اس طرح کے دور کا مفروضہ جنسی اشتراکی دعویٰ ہے اور یہ دعویٰ خود اشتراکی طرفداروں نے بھی دولت کی اشتراکیت کے آغاز میں نہیں کیا تھا۔

زن و مرد کے جنسی تعلقات میں چار ادوار کا مفروضہ، ایک تقلیدی مفروضہ ہے جو مالکیت کے بارے میں سوشلسٹوں کے چار دوروں سے حاصل کیا ہے۔ سوشلسٹ کہتے ہیں کہ، انسان نے مالکیت کے چار دور گذارے ہیں:

پہلا دور ۔ ابتدائی مشترک ملکیت۔

دوسرا دور۔ فیوڈل ازم (جاگیرداری)

تیسرا دور ۔ کیپٹلزم (سرمایہ داری)

چوتھا دور ۔ سوشلزم اور کمیونزم۔

جو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت ہے مگر ذرا اونچی سطح پر۔

خوشی کی بات ہے کہ بیگم منوچہریان نے چوتھے دور کا نام "حقوق زن و مرد کی برابری" رکھا ہے اور اس پہلو سے انہوں نے سوشلسٹوں کی تقلید نہیں کی، اور آخری دور کو ابتدائی اشتراکیت کی طرف بازگشت کا نام نہ دیا۔

اگرچہ محترمہ کے خیال میں بقول ان کے چوتھے دور اور پہلے دور میں "زیادہ مشابہت" ہے انہوں نے تشریح کی ہے:

چوتھا مرحلہ، پہلے مرحلے زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ عورت و مرد، کسی بالادستی

اور برتری کے بغیر مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے۔"

"تشابہت زیاد" زیادہ مشابہت۔ کا مطلب میں ابھی نہیں سمجھ سکا۔

اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ بالادستی و برتری مرد کو حاصل نہ ہو، اور ایک دوسرے کے درمیان برابر کے معاہدے اور شرائط ہوں، تو یہ بات تو دلیل بننے کے قابل نہیں ہے، کہ یہ دور، ان دوروں سے مشابہت رکھتا جو محترمہ کے نزدیک، شرط و قید و پابندی کے ہر بندھن سے آزاد تھے۔ جب مرد و زن گھریلو زندگی ہی نہ رکھتے تھے۔

اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ۔ چوتھے مرحلے میں آہستہ آہستہ تمام بندھن ٹوٹ جائیں گے اور گھریلو زندگی منسوخ ہو جائے گی اور افرادِ بشر میں ایک قسم کا جنسی اشتراک حکمرانی کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ "حقوق کی برابری" سے ان کا مطلب اس مطلب و مدعا کے علاوہ ہے جو برابریِ حقوق کے حامیوں کے نزدیک صحیح ہے۔ کیونکہ محترمہ مذکورہ بالا مفہوم و مدعا کی بڑی سخت حامی ہیں اور یہ بات ان کے لئے اتفاق سے بڑی وحشت ناک ہو گی۔

○

اب ہمیں زن و مرد کے گھریلو حقوق کی فطرت کی طرف توجہ کرنا چاہیئے اس بارے میں دو چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہو گا۔

ایک سوال یہ کہ ـــ زن و مرد طبیعت و فطرت کے لحاظ سے فرق رکھتے ہیں یا نہیں ؟ بالفاظ دیگر عورت و مرد میں فقط تولید و تناسل کے اعضا کا فرق ہے یا اس سے زیادہ گہرا فرق موجود ہے ؟

دوسری بات یہ ہے کہ۔ اگر دوسری نوعیت قسم کے اختلافات بھی معلوم ہیں تو کیا وہ اختلافات ایسے ہیں جو حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یا ایسے اختلاف ہیں جن کا فطرت انسانی سے تعلق نہیں ہے جیسے رنگ و نسل۔

عورت، فطرت کے زاویۂ نظر سے

پہلی بات کے بارے میں خیال ہے کہ بحث کی گنجائش نہیں ہے، اس بارے میں تھوڑا سا بھی مطالعہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ فرق و اختلاف زن و مرد فقط تولید و تناسل کے اعضاء ہی میں نہیں، دوسری باتوں میں بھی فرق ہے، بحث اس میں ہے کہ باقی اختلافات عورت و مرد کے حقوق و فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں یا نہیں۔

مغربی دانشوروں اور ماہرین نے پہلے حصے پر مناسب طریقے سے گفتگو کی ہے، حیاتیاتی و نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں کے مطالعے کے بعد ان لوگوں نے تھوڑے سے بھی انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ ان لوگوں نے جس طرف توجہ نہیں کی وہ ہے ان اختلافات کا جائزہ جو خاندانی حقوق اور ذمہ داریوں پر اثر ڈالتے ہیں اور مرد و عورت کو غیر مشابہ قرار دیتے ہیں۔

فرانس کے مشہور فیزیالوجسٹ "ایلکسس کارلز، جو بیالوجسٹ اور اعلیٰ درجے کے سرجن تھے، موصوف نے اپنی بہت عمدہ کتاب میں دونوں باتوں کا اعتراف کیا ہے۔ موصوف کی کتاب کا فارسی ترجمہ "انسان موجودِ ناشناختہ" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یعنی موصوف کے بقول۔ زن و مرد قانون تخلیق کے مطابق مختلف طور پر پیدا ہوئے ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ دونوں کے اختلافات اور فرق ان کے فرائض و حقوق پر اثر انداز بھی ہوتے اور ان میں بھی فرق ڈالتے ہیں۔

"جنسی عمل اور تولید نسل" کے عنوان سے ایک فصل قلم بند کی ہے (طبع سوم صفحہ ۱۰۰) اس میں لکھا ہے:

> "بیضے اور تخم دان بڑے وسیع عمل کرتے ہیں۔ پہلے تو نر یا مادہ خلیے بناتے ہیں جن کی پیوستگی سے نیا انسان وجود میں آتا ہے۔ اور عین اسی دوران ایسے مادوں کی خون پر ریزش کرتے ہیں، جو رگوں، پٹھوں اور ڈھانچے نیز شعور میں مرد و عورت کے اثر ظاہر کرتے ہیں۔ یوں وہ ہمارے تمام بدنی عمل میں تیزی بخشتے ہیں۔

بیضوں سے ہونے والی ریزش، تہوّر، جوش و خروش اور خشونت و سختی پیدا کرتی ہے اور یہی خصوصیات جنگی بیلوں کو اس گائے سے ممتاز کرتے ہیں جو کھیتوں میں جتائی کا کام کرتی ہے۔ تخمدان بھی وجودِ زن میں اسی طرح کے اثرات ڈالتا ہے۔

... مرد و عورت میں جو اختلاف موجود ہے۔ وہ فقط جنسی بدن، بچہ دانی اور نظام تولید اور خاص طرز تعلیم ہی پر منتج نہیں ہوتا بلکہ ایک اور گہری علت ہے اس اختلاف کی، اور وہ ان کیمیائی مادّوں کی ریزش ہے جو تناسلی غدودوں سے خون پر ہوتی ہے۔

اس اصلی اور اہم نکتے پر توجہ نہ کرنے کی وجہ سے انقلابِ خواتین کے طرف دار سوچتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک تعلیم و تربیت دی جائے۔ دونوں کے مصروفیات، اختیارات اور ذمہ داریاں ایک قسم کی دی جائیں۔ عورت بہت سے پہلوؤں سے مرد سے مختلف ہے، بدن کے خلیے، اعضاء کی قوت و ساخت، خاص کر اعصابی سلسلہ۔ اس کی جنس کی نشانیاں اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔

فزیالوجی کے قانون قاعدے، ستاروں کی دنیا جیسے ہیں، سخت اور ناقابلِ تبدیلی۔ ممکن نہیں کہ انسانی رجحانات و ارادے ان میں دخل دے سکیں، ہم مجبور ہیں جس طرح وہ ہیں، اسی طرح انھیں مان لیں۔

خواتین کو مردوں کی اندھی تقلید کیے بغیر کوشش کرنا چاہیے کہ اپنی فطرت کے عطا کیے ہوئے انعامات کو وسعت دیں اور اپنی خاص سرشت و خمیر کے مطابق اسی راہ میں آگے بڑھیں۔ بشریت کے ارتقا میں ان کی ذمہ داریاں مردوں سے زیادہ اہم ہیں، ان ذمہ داریوں کو سبک نہ سمجھیں اور ان سے پہلو تہی نہ کریں۔"

کارل نے مرد کے مادہ تولید اور عورت کے مادہ تولید میں خلیوں اور ان کے باہم پیوست ہونے کی کیفیت بتائی اور یہ کہ تولید کے لیے مادہ کا ہونا ضروری ہے برخلاف وجود نر کے اور یہ کہ حمل،

عورت کے جسم کو مکمل کرتا ہے۔ فصل کے آخر میں لکھا ہے:

"ہمیں جوان لڑکیوں کے لیے وہ طرزِ فکر اور اس قسم کی زندگی اور فکری انتظامات اور مقاصد اور "آئیڈیالوجی" نہ رکھنا چاہئے جو نوجوان لڑکوں کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کے ماہرین کو مرد و زن کے اختلاف اعضاء، جنس، مرد و زن کے نفسیات اور ان کے فطری فرائض کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ہماری آئندہ نسل کی بنیاد و تعمیر اس بنیادی نکتے پر بڑی اہمیت حاصل کرسکے گی۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا، اس بڑے دانشور نے زن و مرد کے بڑے فطری فرق بھی بتائے اور یہ نظریہ بھی ظاہر کیا کہ ان اختلافات کے سبب فرائض و حقوق میں مشابہت نہیں ہے۔

آئندہ فصل میں ہم دوسرے دانشوروں کے نظریے بیان کریں گے کہ وہ لوگ زن و مرد میں کیا کیا اختلاف ملتے ہیں، پھر نتیجہ حاصل کریں گے کہ زن و مرد کن حصوں میں صلاحیتوں اور ضرورتوں میں مشابہ ہیں اور اس وجہ سے انھیں مشابہ حقوق رکھنا چاہیے اور کن حصوں میں مشابہ حالت نہیں رکھتے، اور ایسے حالات میں حقوق و فرائض غیر مشابہ حاصل ہونا چاہئے۔ زن و مرد کے عائلی حقوق و فرائض میں یہ حصہ کتاب نازک ترین و اہم ترین حصوں میں ہے۔

ساتواں حصّہ :

عورت و مرد کے فرق

- —— کیا عورت و مرد میں فرق کا خیال قرونِ وسطیٰ کی سوجھ ہے۔
- —— عورت کے حقوق نے افلاطون و ارسطو کو آمنے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔
- —— عورت و مرد کی تخلیق میں، قانونِ خلقت نے دونوں کے جوڑ کو زیادہ مظبوط بنایا ہے۔
- —— مرد، دنیا پر قبضہ کرنے والا ہے اور عورت مرد کو قابو میں رکھنے والی ہے۔
- —— مغرب کے نئے مقلّدوں کو زن و مرد کے جن تعلقات نے غرقِ سرور کر رکھا ہے، خود اہلِ مغرب اسکے خمار کا دور گذار رہے ہیں۔

خلاصۂ مطالب از مؤلف رح

عورت و مرد میں فرق و اختلافات

(۱)

عورت و مرد کے فرق و اختلافات ! عجیب مہمل بات ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں زندگی گذر رہی ہے ، پھر بھی کونے کھدرے میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جن کے سوچنے کا انداز قرون وسطیٰ جیسا ہے ۔ پرانے خیالات' گھسے پسے افکار ، اختلاف زن و مرد سمجھتے ہیں ۔ عورت و مرد کے درمیان فرق ہے ۔ شاید چاہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کے لوگوں کی طرح یہ نتیجہ نکال لیں کہ عورت کی جنس گھٹیا ہے ، عورت ، انسانِ کامل نہیں ہے ۔ عورت حیوان و انسان کے درمیان برزخ ہے ۔ عورت میں یہ صلاحیت و قابلیت نہیں ہے کہ ، زندگی میں مستقل و آزاد ہو ، اسے بہرحال مرد کے ماتحت اور اس کی سرپرستی میں رہنا چاہیے ۔ آج کی دنیا میں ان پرانی باتوں کا فائدہ کیا ہے ۔ آج سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ یہ باتیں جھوٹ اور جعل سازی تھیں ۔ مردوں نے زور و ظلم سے عورت کو دبا رکھا تھا ، اب سب جان گئے ہیں کہ بات برخلاف تھی عورت کی جنس برتر اور مرد کی جنس پست تر اور ناقص تر ہے ۔

خیر ، جناب ! علوم کی حیرت انگیز ترقی کی روشنی میں عورت و مرد کا فرق کھل کر سامنے آگیا ہے ۔ جعل سازی اور بہتان کی بات نہیں ، علمی اور تجرباتی حقیقتیں ہیں ۔ مگر یہ فرق اس بحث سے قطعاً غیر متعلق ہیں کہ مرد یا عورت برتر جنس ہے اور دوسری جنس گھٹیا ہے اور ناقص ہے ۔ قانونِ تخلیق کے سامنے ان کی اونچ نیچ سے مقصد ہی کچھ اور ہے ۔ قانونِ خلقت نے یہ فرق اس لیے رکھا تھا کہ زن و مرد کی خاندانی زندگی کے تعلق کو زیادہ مضبوط کرے ان کی اکائی کی نیو اچھی رکھی جائے ، قانونِ خلقت نے یہ فرق اس لئے رکھا تھا کہ زن و مرد اپنے ہاتھوں اپنے عائلی فرائض خود بانٹ لیں اور جسم کے دوسرے اعضاء کی طرح اختلاف کے باوجود ایک جسم بنائیں ۔ اگر قانونِ خلقت نے

آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں اور ریڑھ کی ہڈی کے جوڑ بنائے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ ان پر خاص نظر رکھتا اور ان میں فرق چاہتا ہے۔ ایک پر دوسرے کے مقابلے میں ظلم جائز سمجھتا ہے۔

نقص و کمال، یا تناسب

یہ موضوع میرے تعجب کا باعث ہے۔ بعض حضرات اس پر اصرار کرتے اور زور دیتے ہیں کہ جسمانی اور نفسیاتی صلاحیتوں کے لحاظ سے زن و مرد کا فرق، عورت کے ناقص اور مرد کے کامل ہونے کی دلیل ہے، اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ قانونِ خلقت نے مصلحت کی بنا پر عورت کو ناقص پیدا کیا ہے۔

عورت کے ناقص الخلقت ہونے کی بات ہم مشرق کے رہنے والوں سے پہلے اہل مغرب میں چل چکی ہے۔ وہاں مذہب و کلیسا کہتے ہیں؛

عورت کو عورت ہونے پر شرمندہ ہونا چاہیے۔ کبھی کہا جاتا ہے۔ عورت وہ مخلوق ہے جس کی زلفیں بڑی اور عقل چھوٹی ہے۔ عورت آخری وحشی ہے جسے مرد نے رام کیا ہے۔ وغیرہ۔

اس سے زیادہ عجیب یہ بات کہ، اخیری دور میں کچھ یورپ والے ایک سو اسی درجے کی گردش یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ایک ہزار ایک دلیلوں سے مرد کو مخلوقِ ناقص و پست و زبوں اور عورت کو مخلوق کامل و برتر ثابت کر دکھائیں۔

اگر آپ نے اشلے مونٹیگو کی تالیف "زن جنسِ برتر" مجلّہ "زن روز" میں پڑھی ہے۔ تو محسوس کیا ہوگا کہ یہ شخص کس زور آوری اور بے معنی تانے بانے سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عورت مرد سے کامل تر ہے۔ کتاب میں فزیالوجی، نفسیات اور معاشرتی شماریات کی حد تک کارآمد اطلاعات ہیں اور وزنی چیز ہے۔ اس کے بعد جو مصنف نے نتائج حاصل کرنا چاہے ہیں اور اپنا مقصد (جو کتاب کے نام سے عیاں ہے) ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔ آخر، ایک دن عورت کو اتنا حقیر و پست و زبون کیوں کہا تھا کہ آج مجبور ہو کر گذشتہ کی تلافی کرنا پڑ رہی ہے اور اس میں بھی وہ سب نقائص اور کمزوریاں جو

عورتوں کے ذمے لگائی تھیں اب انہیں کو مرد کے سر تھوپنے کی مہم شروع کرنا پڑی ہے ۔ کیوں ضروری ہے کہ زن و مرد کے فرق کو کسی کے ناقص اور کسی کے کامل ہونے پر زور دیں پھر کبھی مرد کا دامن پکڑیں کبھی عورت کا ۔

ایشلی مونٹیگو ایک طرف تو زور دیتے ہیں کہ زن کو جنس کے اعتبار سے مرد پر برتری حاصل ہے اور دوسری طرف مرد کے خصوصیات جتاتے ہیں کہ مرد تاریخی اور اجتماعی لحاظ سے تاریخ کا خالق ہے ، فطری عوامل نہیں ۔

مرد و عورت کا فرق "تناسب" (ایک مناسبت پر مبنی ہے) نہ نقص و کمال قانون خلقت چاہتا تھا کہ ان اختلافات سے عورت و مرد میں زیادہ مناسبت رہے ، کیونکہ دونوں بہر حال مشترک زندگی گذاریں گے ۔ الگ الگ زندگی بسر کرنا قانونِ خلقت سے انحراف ہے ۔ یہ مطلب بعد میں آنے والے توضیحات میں زیادہ روشن ہوگی اور تفاوتوں کی نوعیت اور کھلے گی ۔

نظریۂ افلاطون

یہ مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے جو ہماری صدی میں زیر بحث آیا ۔ کم از کم ایک ہزار چار سو برس پہلے یہ بحث ہو چکی ہے ۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت میں اس کا تذکرہ ہے ۔

افلاطون نے بڑی صفائی سے کہا ہے کہ عورت و مرد مشابہ صلاحیتوں کے مالک ہیں عورتیں بھی ویسی ذمہ داریاں سنبھال سکتی ہیں جو مرد سنبھالتے ہیں ۔ انھیں وہی حقوق ملنا چاہئے جن سے مرد فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

عورت کے بارے میں بیسویں صدی کے مسائل جنھیں نیا کہا جاتا ہے سب کا سرچشمہ افلاطون کے افکار میں ہے ، بلکہ اس صدی کے لوگ جسے حدّ افراط اور ناقابل قبول کہتے ہیں وہ افلاطون کے یہاں موجود ہے ۔ لوگ اتنے بڑے آدمی سے تعجب کرتے ہیں ، جو شخص "پدر فلسفہ" ہو وہ ایسی باتیں کرے ! افلاطون نے رسالہ جمہوریت کی پانچویں فصل اسی موضوع سے مخصوص کی ہے اور زن و فرزند کی اشتراکیت ، نسل کی اصلاح و بہبود ، بعض زن و مرد افراد کی تولید

وتناسل سے محرومی اوران افراد کو یہ حق دینا جو اعلیٰ درجے کے صفات سے متصف ہوں خاندان سے باہر اولاد کی تربیت وپرورش کا ضابطہ، تناسل وتوالد کے لیے معین عمروں کا تعین یعنی زن زن ومرد جنسی عمل اور اولاد پیدا کرنے کے لیے ایسی عمروں کا تعین جن میں جوش اور زندگی کی توانائی بھرپور ہو۔

افلاطون کا عقیدہ ہے، جس طرح مردوں کو جنگی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے، عورتوں کو بھی اسی طرح تربیت دی جائے، مردوں کی طرح خواتین بھی ورزشی مقابلوں اور کھیلوں میں شرکت کیا کریں۔

اس کے باوجود دو نکتے افلاطون نے ضرور لکھے ہیں:

۱۔ وہ مانتا ہے کہ عورتیں جسمانی، روحانی اور دماغی طور پر مردوں سے کمزور ہیں۔ یعنی مرد وزن کے تفاوت کو کمیّت (مقداری) کے لحاظ سے تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ "کیفیت" میں اور صلاحیتوں میں اس کے خلاف ہے۔ افلاطون کے خیال میں مرد وزن میں مماثل صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک بات یہ ہے کہ ہر شعبے میں وہ مردوں سے زیادہ کمزور ہیں اور اس سے کام لینے اور کام کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو کام مرد کر سکتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

افلاطون، عورت کو مرد سے کمزور تر ماننے کی بنیاد پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے کہ مرد پیدا ہوا، عورت نہیں۔ وہ کہتا ہے:

"خدا کا شکر ادا کرتا ہوں یونانی پیدا ہوا ہوں، غیر یونانی نہیں ہوں۔ آزاد خلق ہوا ہوں، غلام نہیں۔ مرد پیدا ہوا ہوں، عورت نہیں۔"

۲۔ افلاطون نے نسلی بہبود، عورت ومرد کی مساوی صلاحیتوں کے مطابق پرورش، زن وفرزند وغیرہ کی مشترک ملکیت (اشتراکیت) کا جو نظام بنایا ہے اس میں حاکم طبقہ کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ یعنی فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی۔ جنھیں افلاطون تنہا حکومت کے لائق سمجھتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ افلاطون، سیاسی رویّوں میں ڈیموکریسی کے خلاف اور ارسطو کراسی کا حامی ہے

گذشتہ نظریوں میں سازی باتیں ارسٹوکریٹ سے وابستہ ہیں ان کے علاوہ دوسرے طبقات کے بارے میں وہ کوئی رائے نہیں دیتا۔

ارسطو۔ افلاطون کے مقابلے میں

پرانے زمانے کے لوگوں میں افلاطون کے بعد جس کے نظریات وافکار جو ہماری دسترس میں ہیں وہ اس کے شاگرد ارسطو کے ہے۔ ارسطو نے اپنی کتاب "سیاست" میں زن و مرد کے فرق پر اظہار رائے کرتے ہوئے اپنے استاد افلاطون کی سخت مخالفت کی ہے۔ ارسطو کے نزدیک زن و مرد میں اختلاف کمیت (مقداری) ہی پہلو سے نہیں۔ کیف (کیفیت) کے لحاظ سے بھی ہے۔ قانونِ خلقت نے ہر ایک کے ذمے جو فرائض عائد کیے اور جو حقوق تجویز کیے ہیں ان میں زیادہ مقامات باہم مختلف ہیں۔ ارسطو کے عقیدے میں عورت و مرد کے اخلاقی فضائل بھی اکثر مقامات پر جدا جدا ہیں۔ ایک خلق، مرد کے لیے باعث شرف ہو سکتا ہے اور وہی خلق عورت کے لیے فضیلت نہ ہو۔ اسی طرح اس کے برعکس ایک خلق عورت کے واسطے فضیلت ہو اور مرد کے لیے نہ ہو۔

ارسطو کے نظریات نے پرانے زمانے میں ہی افلاطون کے خیالات کو منسوخ کر دیا اس کے بعد آنے والے دانش وروں نے اس کے نظریات کو افلاطون کے خیالات پر ترجیح دی

آج کی دنیا کی نظر:

یہ باتیں تھیں ماضی بعید کی، اب دیکھیں نئی دنیا کیا کہتی ہے آج کی دنیا، اندازہ و گمان کی بات کے بجائے مشاہدہ و تجربہ پر بنیاد رکھتی ہے۔ جب اعداد و شمار کی بات ہوتی ہے تو چشم دید حقائق سامنے ہوتے ہیں جدید دنیا میں فزیکس کے گہرے مطالعات، نفسیات و معاشرے کے حقائق کی روشنی میں بہت زیادہ اختلاف اور فرق معلوم ہوئے ہیں، ایسے انکشافات جسے پرانی دنیا دریافت نہیں کر سکی تھی۔

ماضی بعید میں مرد و زن کے اقدار متعین کرتے ہوئے فقط ایک کے جسم کی قوت اور موٹائی

اور دوسرے کے جسم کی چھوٹائی، ایک کا جسم بھاری بھرکم دوسرا نازک اندام، ایک قدآور دوسرا ذرا دبتے قد والی۔ ایک کی آواز میں زیادہ گرج دوسرے کی آواز میں لطافت و نرمی، ایک کے جسم پر گھنے بال، دوسرے کا جسم آئینہ اور کندن۔ اس سے آگے بڑھ کر تو بلوغ کی حد تک جو دونوں میں الگ الگ سن وسال میں ہے۔ یا پھر عقل و احساسات کا حساب لگاتے تھے۔ مرد کو مظہر عقل اور عورت کو مظہر مہر و محبت کہتے تھے۔

آج ــــ ان باتوں سے آگے بڑھ کر متعدد پہلو اجاگر ہوئے ہیں، یہ معلوم ہوا کہ زن و مرد کی دنیا اکثر معاملات میں الگ الگ اور ان معاملات میں فرق ہے۔

اہل تحقیق نے جو کچھ لکھا ہے، ہم اس سے زن و مرد کے مجموعی تفاوت اور اختلافات کا تذکرہ کریں گے اور ان اختلافات کے فلسفے پر روشنی ڈالیں گے۔ یہ بھی غور کریں گے کہ ان اختلافات کی بنیاد فطرت ہے اور کتنی باتیں ہیں جو تاریخی، ثقافتی و معاشرتی عوامل سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ تفاوت ایسے ہیں جنھیں ہر شخص تھوڑے سے مطالعے اور تجربے سے دریافت کرسکتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جن کا انکار ممکن نہیں ہے۔

دورنگی: مرد، متوسط طور پر، بھاری اور گٹھے بدن کا اور، عورت، چھوٹی اور زیادہ نازک اندام ہوتی ہے۔ مرد کا قد لمبا، عورت کا قد چھوٹا ہوتا ہے۔ مرد میں کھردراپن اور کے جسم میں نرمی و لطافت، مرد کی آواز موٹی اور بھاری، عورت کی آواز نازک اور دل کش۔ عورت کا بدن جلدی بڑھتا ہے، مرد کی جسمانی نشو و نما سست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ لڑکی شکم مادر میں لڑکے سے زیادہ جلدی بڑھتی ہے۔ مرد کے رگ پٹھے اور جسمانی قوت عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ عورت میں بیماری سے مقابلہ کرنے کی قوت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ عورت، مرد سے پہلے بالغ ہوجاتی ہے، اس میں مرد سے پہلے تولید کی قوت آجاتی ہے اور پہلے ختم ہوجاتی ہے۔ مرد کے یہاں اس کے برعکس ہے۔ لڑکی، لڑکے سے پہلے بولتی ہے۔ عورت کے متوسط مغز سے، مرد کا متوسط مغز بڑا ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی جسم کی نسبت سے عورت کا

مغز بڑا ہوتا ہے۔ مرد کے پھیپھڑے عورت کے پھیپھڑوں سے زیادہ سانس میں ہوا کھینچتے ہیں۔ عورت کے دل کی دھڑکن مرد کے دل کی دھڑکن سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔

نفسیاتی فرق: مرد، ورزش، شکار اور دوڑ دھوپ کے کام سے بہ نسبت عورت کے دلچسپی رکھتا ہے۔ مرد کے احساسات رزم و مقابلہ و جنگجوئی، عورت کے رجحانات بزم دوستی صلح پسندی چاہتے ہیں۔ مرد، حد سے آگے بڑھنے اور ہنگامہ آرائی عورت پرسکوں اور خاموش تر جذبات رکھتی ہے۔ عورت اپنے لیے اور غیروں کے لیے سخت رویے سے بچتی ہے، اسی وجہ سے عورتوں کی خودکشی مردوں سے کم ہے۔ مرد، خودکشی کے معاملے میں بھی عورت سے زیادہ سخت ہے، بندوق، پستول سے اور پھندا ڈال کر مرنے کے واقعات اور اونچی عمارتوں سے کود کر جان دینے کے قصے مرد کے زیادہ ہیں۔ عورت، خواب آور گولیاں، افیون ... کھا کر مر جاتی ہیں۔

عورت کے نفسیات اور احساسات مرد کے مقابلے میں زیادہ مشتعل ہو جاتے ہیں عورت مرد سے جلدی جوش میں آجاتی ہے یعنی عورت جن معاملات میں اسے خاص لگاؤ یا خطرہ ہو، تیزی اور جلدی سے اپنے احساسات میں بہہ جاتی ہے اور مرد بہ نسبت عورت کے زیادہ سرد مزاج ہے۔ عورت طبعاً زیور و آرائش جمال و زیبائش چاہتی ہے اسے رنگا رنگ فیشن درکار ہیں۔ مرد اس کے خلاف ہے۔ مرد کے مقابلے میں عورت کے احساسات زیادہ ناپائیدار ہیں۔ عورت مرد سے زیادہ احتیاط طلب، زیادہ مذہبی، زیادہ باتونی، زیادہ ڈرپوک اور زیادہ تکلف پسند ہے عورت نفسیاتی طور پر مادرانہ جذبات رکھتی ہے، یہ نفسیات بچپنے ہی سے اس میں موجود ہوتے ہیں۔ اسے مرد سے زیادہ خاندان اور گھر سے تعلق خاطر ہوتا اور بلا ارادہ گھریلو فکریں رہتی ہیں۔ عورت دلیل و استدلال اور خشک عقلی بحثوں میں مرد کے برابر نہیں پہنچ سکتی، ہاں، ادب، نقاشی، اور ذوق و نفسیات سے نازک تعلق رکھنے والوں میں مرد سے کم نہیں۔ مرد، راز کو چھپانے اور تکلیف دہ معاملات کو اپنے اندر محفوظ رکھنے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔

اور اسی دلیل سے رازداری کی بدولت پیدا ہونے والی آزمائشیں مرد کو زیادہ جھیلنا پڑتی ہیں۔ بخلاف عورتوں کے۔ خواتین، مرد سے زیادہ رحم دل ہیں، فوراً انھیں رونا آتا اور کبھی کبھی غش بھی کھا جاتی ہیں۔

احساسات کا تناظر:

مرد، اپنی خواہشات کا غلام ہے، عورت محبت کی بندھی ہوئی مرد جس عورت سے محبت کرتا ہے اسے چنتا اور پسند کرتا ہے عورت اس سے محبت کرتی ہے جس کی قدر و قیمت جانتی ہو اور جس نے اس سے محبت کا اظہار کر دیا ہو۔ مرد کی خواہش کہ عورت کے ساتھ رہے اور عورت بھی اس کا ساتھ دے اسے اختیار دے۔ عورت، مرد کا دل موہنے اور دل کی راہ سے اس پر چھا جانے کی فکر میں رہتی ہے۔ مرد، عورت کے سر پر سوار ہونا چاہتا ہے، عورت، مرد کے دل میں سمانا چاہتی ہے۔ مرد، عورت کو پکڑنا چاہتا ہے، عورت بھی مرد کو جذب کرنا چاہتی ہے۔ عورت، مرد میں دلیری و بہادری اور مرد عورت میں دلبری و زیبائش دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ عورت کے نزدیک سب سے بڑی چیز ہے کہ مرد اس کی حمایت کرے۔ عورت، مرد سے زیادہ خواہشات پر قابو رکھتی ہے۔ مرد کی خواہش حملہ آور اور پہل کرنے والی ہے، عورت کی خواہش میں انفعال اور تحریک ہے۔

عورت مرد کے فرق

(۲)

پروفیسر ریک کے نظریات

مشہور امریکی ماہر نفسیات، پروفیسر ریک کے نظریات "زن روز" کے شمارہ نمبر ۹۰ میں چھپ چکے ہیں۔ یہ پروفیسر مدتوں "زن و مرد" کے مسائل پر تحقیق کرتے اور نتائج حاصل کرتے رہے پھر انہوں نے ایک ضخیم کتاب میں دونوں کے درمیان فرق بتائے ہیں۔

پروفیسر موصوف کے بقول :

مرد کی دنیا، عورت کی دنیا سے بہت مختلف ہے۔ اگر عورت مرد کی طرح نہیں سوچتی یا اس جیسا کام نہیں کرتی تو اس کا سبب دونوں کی دنیاؤں کا فرق ہے۔

پروفیسر نے لکھا ہے:

توراۃ کے بموجب "زن و مرد ایک گوشت سے وجود میں آئے"! ٹھیک ہے دونوں ایک گوشت سے پیدا ہوئے ہیں، مگر دونوں کے جسم مختلف ہیں۔ پھر دونوں ترکیبات میں مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ علاوہ ازیں، دونوں کے احساسات کبھی مماثل نہیں ہو سکتے۔ حادثات اور اتفاقات کے وقت دونوں کا ردعمل ایک نہیں ہو سکتا۔ زن و مرد اپنے جنسی تقاضوں کے مطابق مختلف اقدام کرتے ہیں جیسے دو سیارے دو مداروں میں الگ الگ حرکت کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں، ممکن ہے۔ مگر کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یعنی دونوں زندگی ساتھ بسر کر سکتے ہیں، ایک دوسرے کے عاشق اور

ایک دوسرے کے صفات و اخلاق قبول کرکے تھکاوٹ اور اکتاہٹ محسوس نہ کریں۔

پروفیسر ریک نے زن و مرد کے تقابلی مطالعے میں جو اختلافات قلم بند کیے ان میں ہے:

(۱) مرد، اپنے چاہنے والی عورت کے ساتھ ہمیشہ رہنے کے خیال سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ لیکن عورت کے لیے اس سے بہتر کوئی لذت نہیں کہ وہ ہمیشہ ایک چاہنے والے مرد کے پہلو میں رہے۔

(۲) مرد کا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ ایک حالت میں رہے، عورت کی خواہش رہتی ہے کہ ہر آن نئی نویلی ہو۔ ہر صبح کو نئے حلیے میں بستر سے اٹھے۔

(۳) بہترین جملہ جو ایک مرد کسی عورت سے کہہ سکتا ہے وہ عام محاورہ ہے ـــ "پیاری میں تمھیں چاہتا ہوں"۔ خوبصورت ترین جملہ جو عورت اپنے چاہنے والے سے کہہ سکتی ہے، وہ ہے ـــ "مجھے تم پر ناز ہے۔"

(۴) اگر کوئی شخص زندگی میں کئی محبوب عورتوں کے ساتھ رہ چکا ہو تو دوسری عورتوں کی نظر میں وہ جاذب توجہ ہوتا ہے۔ مرد کو وہ عورت بدی معلوم ہوتی ہے جو کئی مردوں کے ساتھ زندگی گذار چکی ہو۔

(۵) مرد کو بڑھاپے میں بدبختی کا احساس ہو جاتا ہے، کیونکہ اپنے روزانہ مشغلے یعنی کام کو ہاتھ سے دیتے ہیں۔ مگر عورت بڑھاپے سے خوش ہوتی ہے کہ بہترین چیزیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ گھر اور چند نواسے پوتے۔

(۶) مرد کی نظر میں خوش نصیبی کے معنی ہیں معاشرے میں ایک شخصیت اور مقام حاصل کرلے۔

(۷) عورت کے نزدیک خوش نصیبی کے معنی ہیں ایک آدمی کے دل پر قابو اور لمبے زندگی بھر کے لیے اپنا بنالینا۔

(۸) مرد، ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ محبوب عورت کو اپنے مذہب و قوم میں داخل کرلے۔

(۹) عورت کے لیے شادی کے بعد خاندانی نام، دین وملت، اپنے محبوب مرد کی خاطر بدل لینا آسان کام ہے۔

شاہ کارِ خلقت

زن و مرد کے ایسے فرق جن سے دونوں کی خاندانی ذمہ داریوں اور حقوق میں فرق پیدا ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس سے قطع نظر۔ یہ مسئلہ بجائے خود خلقت کا شاہکار ہے، درسِ توحید و معرفتِ خدا ہے، جہان و کائنات کے حکیمانہ و مدبرانہ نظام پر ایک آیت و نشان ہے۔ ایک واضح مثال ہے کہ خلقت کے معاملات کسی اتفاق کا نتیجہ نہیں، فطرت اندھیرے میں اندھے کی طرح راستہ نہیں طے کر رہی ہے۔ علتِ غائی کے عمل دخل بغیر تخلیق و وجودِ کائنات آئے دن رونما نہیں ہو رہا ہے اس دعوے پر یہ بحث دلیل ہے۔

تخلیق کی عظیم قوت نے، حفظِ نوع اور مقصد تک پہنچنے کے واسطے تولید و تناسل کا انتظام کیا ہے۔ اس کے کارخانے سے ہمیشہ جنس نر اور جنسِ مادہ وجود میں آ رہی ہے۔ پھر نسل کی بقا و دوام کے لیے دونوں جنسوں کی باہمی مدد اور تعاون و وحدت کی نیو رکھی ہے، خصوصاً نوعِ انسان میں، ان دونوں کی مدد سے وہ اس دور کو مکمل کر رہی ہے۔ قوتِ تخلیق نے ہر صاحبِ حیات کی خاصیت خود خواہی و منفعت طلبی کو خدمت و تعاون، عفو و ایثار سے بدل دیا ہے، ان کو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا طلب گار بنا دیا ہے۔ اس نے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے اور دونوں کے جسم و روح کو جوڑنے کے واسطے عجیب قسم کے جسمانی و روحانی فرق رکھے ہیں۔ تاکہ وہ آپس میں زیادہ سے زیادہ جذب و انجذاب حاصل کر سکیں ایک دوسرے کے عاشق و طلب گار رہوں۔ اگر عورت میں جسم و جان، خلق و مزاج مردانہ ہوتا تو مرد سے کام لینا اور مرد کو اپنا شیفتہ وصال بنانا محال ہوتا۔ اور اگر مرد میں اوصاف جسمانی و روحانی وہ ہوتے جو عورت میں ہیں تو، عورت اسے اپنی زندگی کا ہیرو نہ مانتی وہ اس کے دل کو جتنا اپنے فن تسکار کا بہترین شاہ کار نہ سمجھتی۔ اصل مرد جہاں گیر اور زن مرد گیر پیدا ہوئی ہے۔"

قانون خلقت نے زن و مرد کو ایک دوسرے کا طلب گار بنایا ہے۔ یہ ربط عام چیزوں کا عام چیزوں جیسا نہیں، وہ تعلق جو انسان خود خواہی سے محسوس کرتا ہے۔ یعنی انسان چیزوں کو اپنی خواہش کی بنا پر طلب کرتا ہے۔ انھیں استعمال کی نظر سے دیکھتا ہے۔ انھیں حاصل کر کے اپنے وجود

و آرام پر قربان کرتا ہے۔ میاں بیوی کا تعلق یہ کہ دونوں ایک دوسرے کی خوش نصیبی و راحت کی فکر میں رہتے ہیں خود فراموشی اور ایک دوسرے پر جاں نثاری سے لذت یاب ہوتے ہیں۔

خواہشات سے بلند تر رشتہ

بعض حضرات "شہوت" اور "رافت" (خواہش و دل جوئی) میں فرق نہیں کرتے۔ تعجب تو اس پر ہے ان کے خیال میں میاں بیوی کو صرف لالچ اور شہوت کا رشتہ جوڑتا ہے۔ نفع اندوزی و حسن خدمت، جیسے آدمی، کھانے، پینے، پہننے اور سواریوں سے ربط رکھتا ہے۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ خلقت و فطرت میں خود خواہی اور نفع اندوزی کے علاوہ اور بھی رابطے موجود ہیں۔ یہ رابطے خود خواہی کے جذبے سے نہیں پیدا ہوتے۔ ان کے علاوہ سرچشموں سے ابھرتے ہیں، وہ رشتے، جان نثاری، عفو و درگذر، اپنی تکلیفوں کو بھولنا، غیر کی راحت و آرام کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ رشتے انسان کی انسانیت کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ باتیں جانوروں کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہیں جب وہ اپنی جفت یا بچوں پر وقت آنے یا حفاظت کے لئے ان کا اظہار کرتے ہیں۔

ان لوگوں کا خیال ہے کہ مرد، ہمیشہ عورت کو اسی نظر سے دیکھتا ہے جیسے بے شادی شدہ جوان ایک ہرجائی عورت کو کبھی دیکھ لے۔ یعنی دونوں کا تعلق شہوت کا ہے اور بس۔ درحقیقت ایسا نہیں یہ رشتہ، شہوت سے بالاتر ہے۔ اور وہی بلند بندھن دونوں کا پیوند ملاتا ہے، وہ رشتۂ عالی قرآن مجید کی زبان سے "مودّت و رحمت کہنا چاہئے:

> ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجاً لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃً ورحمۃً (الروم/۲۱)

ترجمہ:

> اور اس کی نشانیوں میں سے ہے۔ اس نے تمہارے لئے تمہاری جنس میں جوڑا پیدا کیا کہ تم اس کے پاس سکون حاصل کرو اور تم دونوں میں "مودّۃ" (پرخلوص محبت) اور رحمت (مہربانی) پیدا کی۔

کتنی بڑی غلط فہمی ہو گی، اگر ہم تاریخ روابط زن و شوہر فقط خدمت حاصل کرنے اور استحصال اور تنازعِ بقاء کے نام سے تعبیر کریں اور کیا کیا مہمل باتیں اس سلسلے میں کہی گئی ہیں۔ پسچ عرض کرتا ہوں بعض اوقات ان تحریروں کو پڑھتا اور دیکھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے۔ یہ لوگ زن و مرد کے روابط کی تاریخ میں صرف ایک اصل اور ایک قانون استعمال کرتے ہیں "تضاد" زن و مرد، سماجی دو طبقوں کی طرح الگ الگ برسرپیکار رہنے والے دو طبقے ہیں۔ ان کے مفروضے پر تعجب اور ان کی جہالت و نادانی پر غم کھاتا ہوں۔ اگر والدین اور اولاد کی تاریخ روابط کو استثمار اور حسن خدمت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو روابط زن و مرد کی تاریخ بھی اس نظر سے دیکھی جا سکتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ زور آور تھا۔ لیکن قانونِ خلقت نے مرد کے خمیر کو ایسا بنایا ہے کہ وہ غلاموں اور کنیزوں اور کمزوروں کی طرح اپنی بیوی پر ظلم و ستم کو روا نہ رکھے، جیسے وہ سلوک اپنی اولاد پر جائز نہیں جانتا۔

مرد، عورتوں پر ستم کرتے ہیں۔ میں اس کا منکر نہیں ہوں۔ ہاں، وہ تشریح نہیں مانتا جو اس رویّے کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مردوں نے پوری تاریخ میں عورتوں پر بہت ستم ڈھائے ہیں، لیکن ان مظالم کی بنیاد وہی اسباب تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے اپنی محبوب اولاد پر ستم ڈھائے تھے۔ بلکہ انھیں اسباب کی بنا پر خود انسان نے اپنے اوپر بھی ظلم کیے۔ اس کی بنیاد تھی جہالت و عادت یا تعصب، اس کا حسِ فائدہ طلبی سے کیا تعلق۔ اگر کبھی مناسب وقت ملا، تو تاریخ تعلقاتِ زن و شوہر پر تفصیلی گفتگو کروں گا

زن و مرد کے باہمی نفسیات و احساسات

گھریلو رابطہ ہی عورت و مرد میں مختلف چیزوں کے روابط میں فرق پیدا نہیں کرتا، بلکہ خود ان دونوں کا باہمی تعلق بھی مشابہ نہیں رہتا۔ مرد کا عورت سے رابطہ اور اس کی نوعیت ویسی نہیں ہوتی جو نوعیت عورت کی رشتے کی بنیاد پر مرد سے ہوتی ہے دونوں میں دونوں طرف سے فرق ہوتا ہے۔ طرفین میں کشش کے باوجود لیکن اجسامِ بے جان کے برعکس، جسم چھوٹا

بڑے جسم کو اپنی طرف کھینچتا ہے، کیونکہ قوت تخلیق نے مرد کو مظہر طلب و عشق اور عورت کو مظہر محبوبیت و معشوقیت بنایا ہے، مرد کے احساسات نیاز مندانہ، عورت کے احساسات ناز آفرینی ہے مرد کے احساسات طالبانہ اور احساساتِ زن مطلوبانہ ہیں۔

کچھ دن ہوئے ایک روزنامے میں اس روسی لڑکی کی تصویر چھپی تھی جس نے خودکشی کی تھی۔ اس نوجوان لڑکی نے ایک تحریر چھوڑی جس میں تھا کہ مجھے اب تک کسی مرد نے نہیں چھوا اس لیے مجھے زندگی برداشت نہیں۔

ایک لڑکی اگر کسی مرد کی محبوب نہیں بن سکتی تو اپنے اندر بہت بڑی شکست محسوس کرتی ہے۔ اسے کسی مرد نے چھوا نہیں۔ نوجوان لڑکا زندگی سے کب مایوس ہوتا ہے؟ جب اس کو کسی لڑکی نے چوما ہو؟ نہیں۔ وہ مایوس اس وقت ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو چوم سکے۔

طویل اور جامع بحث کے دوران "ویل ڈیورانٹ" لکھتا ہے، اگر شوہر کے حصول میں دخترانہ امتیاز فقط علم و فکر میں ہوتا، دل ربائی و بھول پن اور چالاکی بے کار ہوتی تو ساٹھ فی صد اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں بن بیاہی نہ رہتیں۔۔۔۔

"اعلیٰ درجے کی مفکر و تعلیم یافتہ خاتون بیگم مونیا کوالوسکی" شکایت کرتی تھیں، کوئی شخص ان سے شادی نہیں کرتا۔ انہوں نے کہا: مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟ میں دوسری عورتوں سے بہتر ہو سکتی ہوں، باوجود اس کے بے حیثیت و کم اہمیت عورتوں سے عشق کیا جاتا ہے مگر مجھ سے نہیں۔

آپ نے دیکھا، یہ محترمہ کس طرح کے احساسِ شکست میں مبتلا ہیں اور وہ بھی مرد کے مقابلے میں۔ وہ کہتی ہیں، مجھے کوئی کیوں نہیں چاہتا؟"

مرد، اس وقت شکست محسوس کرتا ہے جب شادی کے مرحلے میں وہ اپنی محبوبہ کو حاصل نہ کر سکے یا محبوبہ تو مل جائے مگر وہ اس کے قابو میں نہ آئے۔

ان سب چیزوں کا ایک فلسفہ ہے۔ گہرا، اور مضبوط اتحاد و تعلق۔ یہ رشتہ استوار کیوں

درکار ہے؟ تاکہ زن و مرد، زندگی سے زیادہ لذت حاصل کر سکیں؟ نہیں! فقط یہی نہیں۔ انسانی معاشرے کی اساس اور نسلِ آیندہ کی نیو اسی سطح پر استوار ہوتی ہے۔

ماہر نفسیات خاتون کا نظریہ

رسالۂ "زن روز" شمارہ ایک سو ایک میں "کلوڈا السن" کے قلم سے ایک نفسیاتی بحث شایع ہوئی ہے۔

یہ محترمہ خاتون کہتی ہے:

ایک خاتون نفسیاتی ماہر کے طور پر، میرا سب سے زیادہ رجحان مردوں کے نفسیات کے مطالعے کی طرف تھا۔ کچھ دن پہلے مجھے یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ میں زن و مرد کے نفسیاتی عوامل پر تحقیق کروں، اس تحقیق کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا:

۱۔ تمام عورتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی شخص کی نگرانی میں کام کریں، انھیں محکوم ہونے اور نگرانِ کار کے ماتحت کام کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔

۲۔ عورتیں یہ چاہتی ہیں کہ لوگ ان کے وجود کو موثر اور ان کو نیازمندی کا مرکز جانیں۔

اس کے بعد یہ محترمہ اپنی رائے کا اظہار یوں کرتی ہیں:

میرے خیال میں ان دونوں نفسیاتی احساسات کی بنیاد یہ ہے کہ خواتین جذبات کی تابع اور مرد عقل کے تابع ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ خواتین ہوشمندی میں مردوں کے برابر ہی نہیں بلکہ بعض اوقات اس معاملے میں وہ برتر بھی نکلتی ہیں۔ خواتین کا نقطۂ کمزوری فقط ان کے جذبات کی شدت ہے۔ مردوں کی سوچ ہمیشہ عملی ہوتی ہے، وہ بہتر فیصلہ کرتے ہیں۔ اچھے قسم کا نظم و نسق قائم کرتے ہیں، ان کی رہنمائی اچھی ہوتی ہے۔ لہٰذا مردوں کی برتری کا سبب خود فطرت کی اساس ہے۔ اس حقیقت سے عورتیں جتنی بھی ٹکر لیں۔ فائدہ مند نہ ہوگا۔ خواتین، مردوں سے زیادہ حساس ہیں لہٰذا انہیں یہ باور کرنا چاہیے کہ انھیں زندگی میں مردوں کی سرپرستی درکار ہے ..... خواتین کا مقصدِ زندگی "حفاظت" ہے۔ جب انھیں یہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے

اسی وقت کام سے ہاتھ روک لیتی ہیں۔ اس مدّعا کو حاصل کرنے کے لیے خطرات کا سامنا کرتے ہچکچاتی ہیں، ان کا احساس خوف ایک ایسا احساس ہے جسے دور کرنے کے لیے مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ جن کاموں میں لگاتار سوچنا پڑتا ہو، عورتوں کو تھکا دینے والے کام ہیں۔۔۔۔"

جلد بازی کا انقلاب: عورتوں کے پامال شدہ حقوق کی بحالی کے لیے جو انقلاب برپا ہوا اس میں بہت زیادہ بے حواسی اور جلد بازی سے کام ہوا، وجہ یہ تھی کہ انھیں یہ خیال ہی دیر میں آیا۔ ان کے جذبات نے مہلت نہ دی کہ علم ان سے اپنا فیصلہ کہتا اور اسے رہنما بناتا۔ آخر کار خشک و تر سب کچھ جل گیا۔ اس سلسلے سے عورتوں کی کچھ محرومیاں کم ہوئیں مگر حقوق کچھ زیادہ دے دیے گئے۔ بند دروازے کھولے۔ مگر بدبختیاں اور بے چارگیاں بدلے میں زیادہ ملیں۔ یہ سب کچھ خواتین ہی کو نہیں بلکہ معاشرے کے مقدر کو بھی ملا۔ طے شدہ بات ہے اگر اتنی جلد بازی نہ ہوتی تو خواتین کے حقوق بہت اچھے انداز میں ملتے اور حالات کی ابتری سے دانش وروں کی چیخ پکار، حال اور مستقبل کے واسطے ان کی یہ گھبراہٹ اور فریاد فلک تک نہ پہنچتی البتہ۔ امید باقی ہے۔ علم و دانش راہ نکالے گی۔ انقلاب خواتین جذباتیت کے بجائے علم و دانش پر قائم ہوگا۔ یورپ کے دانش وروں کے نظریات کا اظہار اس بارے میں امید افزا ہے۔

یہ دکھائی دے رہا ہے۔ جن باتوں نے مقلدینِ مغرب کو نشے میں مدہوش کر رکھا ہے، خود اہل مغرب اس نشے کے خمار اور آخری لمحات میں پہنچ رہے ہیں۔ ان کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔

ویل ڈیورینٹ کا نظریہ لذاتِ فلسفہ حصہ چہارم میں ویل ڈیورنٹ نے جنسی و عائلی مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم اس کتاب سے اپنے پڑھنے والوں کے لیے کچھ اقتباسات لکھیں گے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مغربی افکار کے رویّے دیکھیں اور جلد بازی کے فیصلوں سے احتیاط کریں۔

حصۂ چہارم، فصل ہفتم میں "عشق" کا عنوان قرار دے کر کہتا ہے:

"عشق کا پہلا صاف نغمہ، آغاز بلوغ میں شروع ہوتا ہے۔ (PUBERTY) پیوبرٹی جس کے معنی انگریزی میں "بلوغ" ہیں، لاطینی اصل کی بنا پر اس کا مطلب ہے "بالوں کا سن" وہ عمر جب لڑکے کے بدن پر بال اگنے شروع ہوتے ہیں۔ خاص کر "سینے کے بال" جن پر لڑکے ناز دکھاتے ہیں اور چہرے کے بال ترشوانے میں سی سی پوس[1] (SISYPHUS) کی طرح جبر اٹھاتے تھے۔ بالوں کی تراش خراش دونوں پہلوؤں کے بالوں کی چھوٹ۔ بظاہر قوت توالد و تناسل سے وابستہ ہے۔ اس کی بہترین شکل اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب نشاط زندگی اپنے عروج پر پہنچیا ہے۔ بڑھوتری کا یہ زمانہ، بالوں کے ساتھ اچانک آواز میں سختی بھی لے آتا ہے۔ یہ جنس کی ثانوی صفت ہے جو لڑکوں کے بلوغ پر انھیں عارض ہوتی ہے۔ اسی عمر میں لڑکیوں کو فطرت کی طرف سے اعضا و حرکات میں لوچ اور لچک عطا ہوتی ہے، جس سے آنکھوں میں خیرگی آتی ہے، ان کے کولھے چوڑے ہو جاتے ہیں کہ مادرانہ عمل آسان ہو۔ سینہ بھر جاتا ہے، پستان ابھر آتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پینے میں سہولت ہو۔ ان ثانوی خصوصیات کے ظہور کی علت کسی کو معلوم نہیں۔ پروفیسر اسٹرلنگ کے نظریے نے کچھ حامی پیدا کیے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بلوغ کے دوران نہ صرف تناسلی خلیے نطفہ پیدا کرتے ہیں بلکہ ایک نوع کے "ہرمون" بھی بناتے ہیں جو خون میں داخل ہو کر جسمانی و نفسیاتی تبدیلیاں بھی لاتے ہیں۔ اس عمر میں جسم میں نئی قوت تو جنم لیتی ہی ہے، خود روح اور مزاج و عادات میں بھی ہزاروں قسم کے تاثرات کروٹ لینے لگتے ہیں۔ رومن رولانڈ کے بقول:

زندگی کے برسوں میں ایک زمانہ وہ آتا ہے جب جسمانی تبدیلیاں آہستہ سے ایک مرد کا وجود دیں اور ایک عورت میں بدل دیتی ہیں، یہی بڑی تبدیلیاں ہیں۔ ..... دلیری و توانائی، نرم دلوں کو گرم کرکے پگھلاتی ہے اور نرمی و لطافت، زور آوری کی ہوس کو بھڑکاتی ہے۔

---

[1] سی سی پوس ایک قدیم افسانوی بہادر جس کا صبر مشہور تھا مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانے میں بال کٹوانے اور منڈوانے میں بڑی سختی جھیلنا پڑتی تھی کیونکہ خط بنانے کے اوزار دستیاب نہ تھے۔ اس کے باوجود لڑکے صبر ایوب کا مظاہرہ کرتے اور خط بنواتے تھے۔

دی موسا کہتا ہے:

سب مرد، جھوٹے، مکار، شیخی خورے، دورُخے، جھگڑالو ہوتے ہیں اور تمام عورتیں خود پسند، دکھاوے اور خیانت کی عادی ہوتی ہیں۔ ہاں، دنیا میں فقط ایک چیز بلند و مقدس ہے اور وہ ہے ان دونوں ناقصوں کا بندھن ......"

- جوڑے کی تلاش، بڑی عمر کے آدمیوں میں، ایک طرف تو مردوں پر تسلط طلبی کے لئے ہوتا ہے اور دلبری و دل ربائی سے فرار کی خاطر عورتوں کے لیے ۔ (مگر یہ مکمل کلیہ نہیں ہے) چونکہ مرد فطری طور پر جنگ جو اور شکاری جانور واقع ہوا ہے اس وجہ سے اس کا عمل مثبت اور حملہ آوری ہے۔ اس کے لیے عورت، انعام ہے جو اسے حاصل کرنا چاہیے۔ وہ اسے اڑا لینا اور اس کا مالک بننا چاہتا ہے۔ بیوی کی تلاش جنگ و پیکار ہے اور شادی، شریک زندگی کی تلاش اور اقتدار ہے۔
- عورت میں پاک دامنی کی فراوانی توالد و تناسل کی خدمت انجام دیتی ہے، کیونکہ پردہ نشینی انتخاب جنس میں مددگار ہوتی ہے۔ پاک دامنی، عورت کو قوت بخشتی ہے وہ اپنے عاشق کی جستجو میں بہت مشکلیں اٹھاتی ہے۔ عاشق سے مراد اس کا وہ ساتھی جو اس کی اولاد کے باپ بننے کا فخر حاصل کرے۔
- عورت کی زبان سے گروہ اور نوع خواتین کے فائدے کی بات ہوتی ہے اور حلقوم مرد سے فرد کے فائدے پر گفتگو۔
- عشق کے کھیل میں، عورت مرد سے زیادہ ماہر ہے۔ کیونکہ اس کے رجحان میں اتنی شدت نہیں ہوتی کہ عقل کی آنکھ اسے دیکھ سکے۔

ڈارون نے مطالعہ کیا ہے کہ مادہ جان داروں میں دنیائے عشق سے تعلق رکھنے والی مخلوق کم ہے۔

لمیرز و کیمیج اور کرافٹ ایبنگ کہتے ہیں:

- عورتیں، مردوں کی مبہم تعریفوں کے پیچھے ہو لیتی ہیں، وہ مردوں سے اپنی خواہشات پر

زیادہ توجہ کی طلب گار ہوتی ہیں، اس کا سبب ان کا جنسی لذت گہرا تعلق ہے۔

لمبرزو کہتا ہے:

عورت میں عشق کا عنصر ایک ثانوی صفت ہے جو اس نے ماں سے لی ہے۔ اس کے علاوہ تمام جذبات و احساسات جو ایک عورت کو مرد سے ملاتے ہیں۔ وہ جسمانی اسباب کے پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کے خمیر سے سر اٹھاتے ہیں جن میں یہ حس پوشیدہ ہوتی ہے کہ وہ کسی کی تابع اور کسی کی سپردگی میں۔ مرد کی حمایت اسے حاصل ہو۔ وہ اپنے حالات کو اپنے وجود کے معاملات کو اس سے منطبق کرنا چاہتی ہے۔

ول ڈیورینٹ نے "مرد و عورت" کے عنوان سے ایک فصل میں لکھا ہے:

- عورت کا خاص کام بقاء نوع کی خدمت ہے۔
- مرد کا خاص کام عورت اور بچے کی خدمت ہے۔ اور دونوں اس اساسی کام کے لیے حکمت و تدبیر کے پابند کیے گئے ہیں۔ یہ بنیادی مقصد ہیں۔ مگر آدھی مخلوق بے خبر ہے۔ حالانکہ انسان و خوش نصیبی کی روح اس میں پوشیدہ ہے۔ . . .
- عورت کی فطرت میں زیادہ رجحان پناہ جوئی کا ہے جنگ طلبی کا نہیں۔ کچھ مادہ مخلوق ایسی دیکھی ہے جس میں جنگ کا اندرونی محرک موجود ہی نہیں ہے۔ مادہ اگر کہیں لڑتی ہے تو اپنی اولاد ہی کے لیے لڑتی ہے۔
- . . . . عورت، مرد سے زیادہ صابر ہوتی ہے، اگرچہ بڑے بڑے کام اور بہادری کے معاملے اور زندگی کے بحران میں مرد کی شجاعت زیادہ کام دکھاتی ہے۔ لیکن لگاتار تحمل و برداشت، چھوٹے چھوٹے پریشان کن حالات اور تکالیف میں عورت کا صبر زیادہ ہے۔ عورت کی جنگ جوئی ایک دوسرے وجود میں ہوتی ہے۔ عورت فوج پسند کرتی ہے۔ سپاہی اسے اچھا لگتا ہے۔ دلیری کے مظاہروں میں اس کے اندر ایک عجیب محرک پیدا ہو جاتا

ہے، جیسے میچوسٹیٹک[۱۲] (MASOCHISTIC) کہا جاتا ہے۔ وہ اس وقت موت کی پروا چھوڑ دیتی ہے۔

● ..... اس کی پرانی خوشی اور قوت و مردانگی سے لذت اندوزی کبھی نئی عورت کے جذباتِ سرمایہ دوستی پر غالب آجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ پاگل بہادر سے بھی شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔

● عورت ایسے شخص سے بخوشی شادی کرنا چاہتی ہے جو شہر کا حاکم ہو۔ اگرچہ آج کل بیوی کی فرمانبرداری کم ہو چکی ہے، لیکن اس میں کچھ مردوں کی قوت اور اخلاقی کمزوری کا بھی دخل ہے۔

● ... عورت کی توجہ گھریلو معاملات پر مرکوز رہتی ہے، اس کا ذہنی پس منظر عموماً اس کا گھر ہوتا ہے۔

● عورت، فطرت کی طرح بہت گہری ہے۔ مگر گھر کی طرح اپنے اندر محدود۔

● عورت کا ضمیر اسے پرانے رسم و رواج سے باندھے رکھتا ہے۔

● عورت نہ تجربہ کاروں کے ذہن میں آتی ہے نہ عادت میں۔

— اس میں بڑے شہروں کی عورت مستثنیٰ ہے۔ وہ اگر عشق میں آزادی چاہتی ہے تو اس کی وجہ کسی ذمہ دار مرد کی شادی سے اس کی مایوسی ہے۔

● اگر جوانی میں کبھی اسے سیاسی اصطلاحات اور سیاسی باتوں سے دلچسپی رہی ہو، تو اس وقت بھی وہ اپنے ہی جذبات کو تمام انسانوں میں پھیلاتی ہے۔ اور ایک وفادار شوہر کے ملتے ہی وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ بیٹھتی اور شوہر کو وفاداری کا جذبہ یاد دلاکر گھر کا پابند کر دیتی ہے۔

● عورت، سوچے بغیر، یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اچھے قسم کے اصلاحی کام گھر سے شروع ہوتے ہیں۔

- جب عورت اپنے سرگردان مفکر شوہر کو، گھر کا فدائی، اور اپنے بچوں کا پابند بنا لیتی ہے تو اصل میں اس کا سبب احساس حفظ و بقاء نوع ہوتا ہے۔
- عورت کا عشق گھر اور بچوں سے ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کی نگہداشت میں کامیاب ہو گئی تو اسے دولت و حکومت کی پروا نہیں رہتی۔ جو لوگ اس نظام کو بدلنا چاہتے ہیں، یہ عورت ان کا مذاق اڑاتی ہے، آج کی عورت فطرتاً اگر خاندان اور بچوں کی دیکھ بھال میں کمزور نظر آتی ہے تو اس کا سبب اس کا شہری ہونا ہے وہ اپنی فطرت کو بھول گئی ہے۔ لیکن فطرت کی شکست دائمی نہیں ہوتی۔ وہ جب چاہے اپنے اندر کے ذخیروں اور دفینوں کے سہارے پلٹ سکتی ہے۔
- دنیا میں پھیلاؤ اور عدد کے اعتبار سے بہت سی قومیں اور نسلیں ہم سے زیادہ موجود ہیں۔ ان قوموں نے اپنی فطرت کے قوانین محفوظ اور باقی لامحدود رکھے ہیں۔[۱]

زن و مرد کا یہ مختصر سا تعارفِ اختلاف جو ہم نے اس مسئلہ کے ماہرین کے نظریات کی روشنی میں پیش کیا۔

"رازِ تفاوتِ ہا" ناہمواری کے راز پر کچھ تاریخی عوامل کا جائزہ بھی لینا چاہتا تھا کہ کس حد تک اس کے اثرات ہیں؟ مگر مطالب کا دامن موضوع سے آگے نکل جائے گا اس لیے نظر موڑتا ہوں، گفتگو کے ضمن میں کچھ باتیں روشن ہوتی جائیں گی۔

---

[۱] ایک علاقے کا سروے اور زمین پر پھیلی ہوئی کروڑوں قبیلوں اور نسلوں کو چھوڑ کر نتائج پر بحث اور ان پر اپنے فلسفہ و قوانین کی عام بنیاد رکھنا غلط ہے۔

آٹھواں حصّہ :

مہر اور نان و نفقہ

- مہر و نفقہ، عورت کی کنیزی کے دور کا تقیہ ہے؟
- قرآن مجید نے مہر کو مرد کی طرف سے عورت کو ہدیہ اور اس کے خلوص کی نشانی کہا ہے۔
- مہر کا نقطۂ اوّل، فطرت کا وہ تقاضہ ہے جو عشق کی بنیاد پر مرد اور عورت سے دو الگ الگ چیزیں چاہتا ہے۔
- اسلام نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں۔
- عورت کا عشق اگر خود اس کی طرف سے شروع ہو تو عشق بھی شکست کھاتا ہے اور عورت کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔
- ہمیں ان مردوں کی اصلاح کرنا چاہیے جو اسلامی قانون پر عمل نہیں کرتے۔ قانون کو خراب کرنے کی ضرورت کیا ہے؟
- مہر کا سسٹم اسلام سے مخصوص ہے، اس کو ہر سسٹم سے الگ ہو کر دیکھنا چاہیے۔
- یورپ نے سو سال اور اسلام نے چودہ سو برس پہلے عورت کو اقتصادی آزادی دی ہے۔
- فقہ اسلامی کے نقطۂ نظر سے نفقہ کی تین قسمیں۔
- یورپ کی خواتین مشین کی شکر گذار ہوں، قانون سازی کی نہیں۔

- — اسلام نے اقتصادی آزادی دی، خانہ بربادی نہیں۔
- — عورت، سرمایہ مرد سے کم حاصل کرتی ہے اور سرمایہ استعمال زیادہ کرتی ہے۔
- — آج کا مرد چاہتا ہے، نفقہ کا حق ختم کر کے، عورت سے فکری قید کا انتقام لے
- — عورت کا حقِ نان و نفقہ شوہر سے ختم کرنا شکاری مردوں کی راہ ہموار کرنا ہے۔
- — کیا، منشورِ حقوقِ انسانی نے عورت کی توہین کی ہے؟

خلاصۂ مطالب از مؤلف رحمہ

مہر اور نفقہ

(۱)

شادی کے مرحلے میں مرد "مہر" مانے۔ اور اپنی ملکیت مال یا املاک میں سے کچھ رقم لڑکی کے باپ یا ماں کو دے۔

جب تک میاں بیوی کے تعلقات باقی رہیں، شوہر، بیوی بچوں کے تمام اخراجات پورے کرے۔

خانگی رشتوں کے بارے میں انسانوں کی یہ پرانی رسم چلی آرہی ہے۔

اس رسم کی بنیاد کیا ہے؟ یہ رسم کیوں اور کیسے شروع ہوئی؟ یہ مہر کی مد کیا ہے؟ عورت کو نفقہ دینا، یعنی چہ؟

اگر زن و مرد، اپنے فطری و انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوں اور ان میں عادلانہ و انسانی رشتے برقرار ہوں، بیوی سے انسان جیسا رویّہ حکمران ہو تو بھی مہر و نان و نفقہ کا سوال پیش آسکتا ہے؟ ایسا تو نہیں کہ مہر و نان و نفقہ اس زمانے کی یادگار ہو جب بیوی شوہر کی مملوک ہوا کرتی تھی؟

عدل اور حقوق انسانی کی برابری۔ خصوصاً بیسویں صدی کا۔ تقاضہ یہ ہے کہ مہر و نان و نفقہ کا سسٹم ختم کیا جائے۔ شادیاں، بلا مہر ہوں، نفقہ کا مسئلہ ختم کیا جائے، عورت خود اپنی مالی ذمہ داریاں برداشت کرے، اولاد کے معاملات میں بھی دونوں برابر کے کفیل ہوں۔

تو ہم مہر سے بات شروع کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں، مہر، کیسے پیدا ہوا، اس کا فلسفہ کیا ہے

اور ماہرینِ معاشرتی علوم نے مہر کی وجہ کیا بیان کی ہے؟

مہر کا تاریخچہ: کہا جاتا ہے: قبل از تاریخ، انسان وحشیانہ زندگی گذارتا، قبیلوں کی صورت میں رہتا، اور نامعلوم اسباب کی بنا پر اپنے خون شریک سے شادی کرنا جائز نہیں جانتا تھا۔ شادی کے خواہش مند جوان، مجبوراً دوسرے قبیلے سے معشوقہ وشریک زندگی مانگنے جاتے تھے۔ ان دنوں مرد اولاد کی پیدائش میں اپنا کردار نہیں جانتا تھا۔ اسے واقفیت نہ تھی کہ جنسی عمل، پیدائش اولاد میں موثر ہے۔ اولاد کو بیوی کی اولاد سمجھتے تھے اپنی اولاد نہیں جانتے تھے۔ نسب، باپ کے بجائے ماں کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ بچوں میں آپ سے مشابہت محسوس تو کرتے تھے مگر اس کی وجہ معلوم نہ تھی۔ ان کے نزدیک مرد قوت تولید سے محروم مخلوق تھی، شادی کے بعد شوہر ایک ضمنی شخصیت کے طور پر بیوی کے ساتھ اسی کے قبیلے میں رہتا اور بیوی اس کی جسمانی قوت اور رفاقت سے فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس عہد کو "ماں کی حکومت" کا دور کہتے ہیں۔

جلد ہی مرد کو عملِ تولید میں اس کا حصہ معلوم ہو گیا اب وہ فرزند کا اصل مالک بن گیا۔ اسی وقت سے اس نے عورت کو اپنا تابع بنالیا اور خود گھر کا سربراہ بن گیا۔ یہاں سے "باپ کی حکومت" کا عہد شروع ہوا۔

اس پیریڈ میں بھی خونی رشتوں سے شادی جائز نہ تھی۔ مرد کو دوسرے قبیلے میں بیوی ڈھونڈھنا، پھر اسے اپنے قبیلے میں لانا پڑتا تھا۔ قبائل میں عموماً جنگ رہتی تھی لہذا، لڑکی کو لے بھاگنا پڑتا، یعنی جو، نوجوان لڑکی، لڑکے کو پسند آتی اسے اس کے قبیلے سے نکال لاتے تھے۔

آہستہ آہستہ جنگ کے بجائے صلح کا راج ہوا، اور مختلف قبائل مل جل کر جینے کے ڈھنگ سیکھ گئے۔ اب لڑکی کو بھگا لے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ لڑکا اپنی پسندیدہ لڑکی حاصل کرنے، دوسرے قبیلے جاکر، لڑکی کے باپ کی خدمت مزدوری کرتا، باپ اس کی محنت مزدوری کے بجائے اپنا داماد بنالیتا اور لڑکا اسے اپنے قبیلے لے جاتا۔

دولت میں اضافہ ہوا تو مردوں نے سوچا، مدتوں منگیتر کے باپ کی خدمت کرنے سے بہتر یہ ہے کہ مناسب ہدیہ اسے پیش کر کے منگیتر لے لی جائے۔ یہاں سے "مہر" ایجاد ہوا۔

اس ترتیب کی بنیاد پر پہلے دور میں شوہر، بیوی کا پچھ لگو اور خدمت گار تھا عورت مرد پر حکومت کرتی تھی۔ اس کے بعد، حکومت مرد کے ہاتھ آئی، مرد، دوسرے قبیلے سے عورت اٹھا لاتے تھے۔ تیسرا دور وہ آیا جب لڑکا منگیتر کے گھر جاتا، باپ سے مل کر بات کرتا اور منظوری کی صورت میں یہ لڑکا خدمت گاری بجالاتا اور محنت مزدوری کر کے ہونے والے سسرے کو راضی کرتا تھا۔ چوتھا مرحلہ وہ تھا جہاں مرد، ایک معین رقم "پیش کش" کے طور پر لڑکی کے باپ کو دیتا تھا، یہاں سے "مہر" کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہتے ہیں: مرد نے جب "ماں کی حکومت" کا دور ختم کر کے "پدر شاہی" کا عہد شروع کیا تو عورت کم از کم، مزدور بنالی گئی، اسے ایک اقتصادی ذریعہ سمجھ لیا گیا، اس سے کبھی کبھی جنسی تسکین بھی حاصل کی جاتی تھی۔ اس نے عورت کو معاشرتی و اقتصادی آزادی نہیں دی اس کی محنت مزدوری کا ثمر، باپ یا شوہر کو ملتا تھا۔

- عورت اپنی پسند سے شوہر نہیں چن سکتی تھی۔
- عورت خود مختار اقتصادی و مالی حیثیت کی مالک نہ تھی۔

دراصل مہر جیسی چیز اور نان و نفقہ کے نام سے جو اخراجات ہوتے تھے اس کے صلے میں بیوی سے یکجائی کے زمانے تک جو محنت مزدوری لیتا تھا اس کا عوضانہ تھا۔

مہر۔ نظامِ قانون اسلامی میں

انسانی معاشرے کی ترقی کا پانچواں دور جسے علوم معاشرہ کے ماہرین نے فراموش کر دیا اور اہل نظر خاموش گذر گئے۔ یعنی وہ دور جب شادی کے وقت اپنی طرف سے براہ راست عورت کو کچھ "پیش کش" کرنے لگا۔ لڑکی کے ماں، باپ اس "پیش کش" پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ عورت پیش کش قبول کرتے ہی اپنی معاشرتی

واقتصادی آزادی محفوظ کر لیتی ہے۔

اولاً : وہ اپنا شوہر خود اپنے ارادے سے منتخب کرتی ہے، ماں اور باپ کے ارادے سے نہیں۔

ثانیاً : جب تک باپ کے گھر میں رہے اور جب سے شوہر کے گھر جائے کسی کو حق نہیں کہ اس سے خدمت گاری لے اور استثمار کرے۔ محنت مشقت سے جو کمائے وہ اسی کی ملکیت ہے۔ دوسرے کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنے حقوق کے معاملات میں کسی سربراہ مرد کی محتاج نہیں ہے۔

مرد، عورت سے فائدہ اٹھانے کے معاملے میں فقط یہ حق رکھتا ہے کہ رشتے کی مدت میں اس کے وصال سے بہرہ مند ہو۔ اس پر ذمہ داری ہے کہ جب تک رشتۂ ازدواج باقی ہے اس سے وصال کرتا رہے اور اس کی زندگی کی نگہداشت رکھے۔

اس نظام کو قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس نے شادی کی اساس یہی مانی ہے۔ قرآن کریم میں متعدد آیتیں بتاتی ہیں کہ ــ مہر۔ عورت کا مال ہے کسی کا اس پر حق نہیں۔

مرد کو شادی کی پوری مدت تک بیوی کے اخراجات کی ذمّے داری پوری کرنا ہوگی اس زمانے میں محنت مزدوری، کام کاج کر کے جو کچھ کمائے وہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ باپ یا شوہر کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

یہاں پہنچ کر "مہر و نفقہ" معمّا بن جاتا ہے۔ جب مہر، باپ کی ملکیت ہوتا تھا، اس وقت لڑکی اپنے شوہر کے گھر میں لونڈی کے طور پر آتی اور شوہر اس سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس وقت مہر کا فلسفہ تھا، باپ سے لڑکی خرید اور ضروری اخراجات نان نفقہ کا فلسفہ تھا وہ اخراجات جو ہر مالک اپنی مملوکہ چیز پر کیا کرتا ہے۔ یہ صورت کہ باپ کو کچھ نہ دیا جائے، شوہر کو استثمار کا حق نہ ہو، بیوی سے اقتصادی فوائد نہیں لے سکتا بیوی، اقتصادی پہلو سے مکمل طور سے آزاد ہے۔ اسے حقوق کے لحاظ سے بھی کسی

"قیمومت" سربراہی و سرپرستی و اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر مہر دینا اور نان ونفقہ ادا کرنا کیا ہے؟

تاریخ پر ایک نظر:

پانچویں مرحلے میں "مہر و نان ونفقہ" کے فلسفے کی چھان بین کے وقت ہمیں گذشتہ چار دوروں پر تھوڑی توجہ خاص دینا ہوگی۔ دراصل اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ غیر یقینی مفروضے اور تخمینے ہیں اور بس۔ نہ وہ تاریخی حقائق ہیں نہ علم و تجربہ کے نتائج۔ قبل از تاریخ انسانی زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے ان کی بنیاد کچھ علامات و قرائن ہیں اور کچھ فلسفیانہ مفروضے جن سے انسان اور کائنات پر گفتگو کی جاتی ہے۔

"مادر شاہی" ۔ ماں کی حکومت کا عہد۔ ایک اصطلاح ہے، اس ضمن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آنکھیں بند کر کے تو ماننے والی باتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح باپ کا لڑکیاں بیچنا، یا شوہروں کا عورت سے ناجائز فوائد حاصل کرنا ان کا استثمار، جلدی مانی جانے والی چیز تو نہیں ہے۔

ان اندازوں اور مفروضوں کے اندر دو چیزوں پر نظر جمتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ کوشش ثابت کیا گیا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان حد سے زیادہ سخت دل اور درشت مزاج تھا، احساساتِ انسانی تو تھے ہی نہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ فطرت اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے جو حیرت انگیز تدابیر اختیار کرتی ہے اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس قسم کی تشریح اور اس طرح کے نظریے، انسان و فطرت کے بارے میں اہلِ مغرب کے لیے تو ممکن ہیں، لیکن اہلِ مشرق کے لیے ۔ اگر ان پر مغرب کا جادو نہ چل گیا ہو۔ تو ممکن نہیں ۔یورپین خاص اسباب کی وجہ سے انسانی جذبات سے بیگانہ ہے۔ وہ مجبور ہے اس سے ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنیادی تاریخ میں جذبات اور انسانیت کی جھلکیاں دیکھے اور مانے۔ وہ تو اگر اقتصادیات کے مسائل چھوڑ کر اٹھتا ہے تو رفتی دیکھتا ہے۔

اس کی نظر میں تاریخ مشین کا نام ہے جب اسے کچھ کھانے کو نہ دیا جائے (فیڈ نہ کیا جائے) چلے ہی گی نہیں۔ اگر جنسی مسائل کے گیر میں گیا تو انسانیت و تاریخ بشریت اپنے تمام ثقافتی و حضری، اخلاقی و مذہبی، تجلیوں اور روحانی جاہ و جلال سمیت صرف جنس کی بدلتی صورتوں میں کھیل کھلونے ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ اور اگر . . . . سرداری اور برتری کے گیر میں چلا گیا تو سرگذشت بشریت ان کے نزدیک یکسر، خون ریزی و بے رحمی ہے۔

اہل مغرب گذشتہ وسطی عہد میں مذہب اور مذہب کے نام لیواؤں کے ہاتھوں بڑے شکنجے میں رہے، بہت دکھ اٹھائے زندہ آگ میں ڈالے گئے، اسی وجہ سے لوگ خدا اور مذہب، بلکہ اس کی بو رکھنے والی چیز سے بھی ڈرتے ہیں۔ چنانچہ تمام علمی علامات و آثار دیکھنے کے باوجود، طبیعت کے بامقصد ہونے اور کائنات کے لیے ایک مدبر ہونے کا اعتراف یا "علت غائی" کے وجود کا اقرار کرنے کی جرأت نہیں کرتے۔

ہم ان شارحین سے یہ نہیں چاہتے کہ پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے پیغمبران خدا کو مان لیں: ان پیغمبروں نے عدالت و انسانیت کا نعرہ بلند کیا، انحرافات کا مقابلہ کیا، ان مقابلوں کے اچھے نتائج حاصل کیے، ہم یہ منوانا نہیں چاہتے۔ مگر اتنا تو ضرور چاہتے ہیں کہ یہ لوگ کم از کم طبیعت کے باخبرانہ دا آگاہانہ اثر کو نظر انداز نہ کریں۔

تعلقات مرد و زن کی تاریخ میں یقیناً بہت ظلم اور بڑی بے رحمیاں ہوئی ہوں گی۔ قرآن مجید نے اس بے رحمی کی بدترین مثالیں بھی بیان کی ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ سراسر تاریخ میں قساوت اور سختی کا انداز یہی رہا۔

مہر کا حقیقی فلسفہ:

ہمارے عقیدے میں "مہر" ایک ماہرانہ تدبیر" کا نتیجہ ہے۔ آغاز فطرت و تخلیق سے زن و مرد کے روابط اور ان کے رشتے کو زیادہ مستحکم کرنے کے واسطے "مہر" ایجاد کیا گیا۔

اصل خلقت میں زن و مرد کا مسئلہ عشق الگ الگ ہے عورت کا عشق کچھ اور طور طریقے

کا ہے اور مرد کا کچھ اور۔ مہر۔ کی ضرورت و ایجاد اسی مرحلے میں ہوئی۔

صوفی، اس قانون کی پوری ہستی میں کارفرما مانتے ہیں۔ ان کا تو عقیدہ ہے کہ عشق و جذب و انجذاب تمام موجودات و مخلوقات پر حکمران ہے۔ خصوصیت یہ ہے کہ موجودات میں سے ہر ایک کا کام الگ ہے ذمہ داری الگ ہے۔ اسی وجہ سے ان کے مقام میں فرق ہے۔ ایک جگہ سوز ہے ایک کے لیے ساز، فخر الدین عراقی نے کہا:

سازِ طرب عشق کہ داند کہ چہ است؟	عشق کے طرب انگیز ساز کو کوئی کیا جانے
گز زخمۂ آں نہ فلک اندر تگ و تاز است	بس مختصر ہے کہ اس کے زخمہ کی چھیڑنے تو آسمان رواں کر رکھے ہیں۔
رازیست دریں پردہ کہ گر آں را بہ شناسی	اس پردے کے پیچھے ایک راز ہے اگر وہ راز
دانی کہ حقیقت زچہ در بندِ مجاز است	معلوم ہو جائے تو سمجھ میں آئے گا کہ حقیقت کو مجاز کا پابند کیوں رکھا گیا ہے۔
عشق است کہ ہر دم بدگر رنگ در آید	عشق ہر آن نئے رنگ میں جلوہ نما ہوتا ہے۔
ناز است بجائی و بیک جای نیاز است	وہی ایک جگہ ناز اور دوسری جگہ نیاز نظر آتا ہے۔
در صورتِ عاشق چہ در آید ہمہ سوز است	عاشق کے سراپا میں جو کچھ سمایا ہوا ہے
در کسوتِ معشوق چہ آید، ہمہ ساز است	وہ "سوز" ہے اور معشوق کے لباس میں "ساز" ہی ساز ہے۔

زن و مرد کے اختلاف پر گفتگو کے دوران (گذشتہ صفحات میں ملاحظہ ہو) ہم نے کہا ہے زن و مرد کے جذبات کی نوعیت اور ایک دوسرے کے بارے میں احساسات ایک طرح کے نہیں ہیں۔ قانون تخلیق نے حسن و غرور و بے نیازی، عورت کے حصے میں۔ اور۔ نیازمندی و طلب، عشق و تغزل مرد کے حصے میں رکھا۔ اسی تقسیم کی وجہ سے عورت

کے کمزور پہلو کی تلافی مرد کی بدنی قوت سے ہوگئی۔ ترازو کے پلے برابر ہو گئے، جب ہی تو مرد طلب کے لیے عورت کے دروازے پر جاتا ہے۔ معاشرہ شناس ماہرین کے "مادر شاہی" عہد میں بلکہ "پدرشاہی" دور میں بھی یہی دیکھا اور بتایا گیا ہے کہ مرد نے عورت کے گھر جا کر رشتہ مانگا ہے۔

دانشور حضرات کہتے ہیں:

مرد، عورت سے زیادہ شہوانی ہے۔ اسلامی روایت میں اس کے برعکس ہے۔ لیکن عورت بہ نسبت مرد کے جنسی خواہش پر زیادہ قابو رکھتی ہے۔ وہ زیادہ خوددار پیدا ہوئی ہے۔ دونوں باتوں کا نتیجہ ایک ہے یعنی بہر حال مرد اپنے خمیر کے مقابلے میں عورت کی بہ نسبت زیادہ کمزور ہے۔ اس خصوصیت نے عورت کو موقع دیا ہے کہ مرد کے پیچھے بھاگنے سے بچے اور آسانی سے اس کے قابو میں نہ آئے، اس کے برخلاف، مرد کو فطرت مجبور کرتی ہے کہ عورت سے نیازمندی کا اظہار کرے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے ذرائع استعمال کرے، ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ جو اس کی رضا اور رفاقت حیات پر آمادگی کی راہ ہموار کرتا ہے وہ ہے "ہدیہ" جو اس پر نثار کیا جائے۔

جنس نر کے افراد، رفاقت کے لیے افراد جنس مادہ کا تعاقب کیوں کرتے اور باہم رقابت کیوں رکھتے ہیں؟ کیوں آپس میں لڑتے اور خون ریزی کرتے ہیں؟ اس کے مقابلے میں جنس مادہ نے لالچ، حرص اور نر کے ساتھ رفاقت کے لیے از خود رفتگی ظاہر نہیں کی۔ اس کا سبب دونوں جنسوں کے فطری تقاضے مختلف ہیں ایک نہیں ہیں۔ نر میں ہمیشہ تقاضا و طلب کا جذبہ رہتا ہے جنس مادہ میں یہ جذبہ نہیں ہے۔ جنس مادہ، نر کے لالچ اور از خود رفتگی کو دیکھ کر اس کے پیچھے نہیں دوڑتی بلکہ ایک قسم کی بے نیازی اور بے خیالی کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

مہر کا حیا اور عورت کی پاک دامنی سے گہرا رشتہ ہے۔ عورت اپنے فطری الہام

سے یہ پہچان چکی ہے کہ اس کی عزت و حرمت اس پر موقوف ہے کہ وہ اپنے تئیں گرہ پڑ کے مرد کے اختیار میں نہ دے دے ......

یہی اسباب ہیں کہ عورت باوجود جسمانی نزاکت کے مرد کو درخواست گذار کے طور پر اپنے آستانے پر کھینچ بلاتی ہے۔ مردوں کو رقابت میں برسر پیکار کھڑا کرتی، اور خود رومان اور عشق کے بہانے مرد کے پنجے سے نکل جاتی ہے۔ کتنے مجنوں ہیں جو لیلاؤں کے پیچھے سرگرداں ہیں، اور وہ اس وقت تک کسی سے رفاقت کا بندھن نہیں باندھتی اور کسی کا ہاتھ اپنے دامن تک نہیں آنے دیتی جب تک اس سے عطیہ و بخشش، صداقت و خلوص کی سند میں حاصل نہ کر لے۔

کہتے ہیں، کچھ وحشی قبیلوں میں یہ دستور تھا کہ جو لڑکی کئی امیدواروں اور عاشقانِ بے قرار سے دوچار ہوتی وہ "ڈوئل" کا پیام بھیجتی تھی۔ وہ رقیب آمنے سامنے زور آزمائی کرتے جو شخص موت یا شکست سے بچ جاتا تھا وہی اس لڑکی کے شوہر بننے کی اہلیت کا مالک بن جاتا تھا۔

کچھ روز ہوئے کہ تہران کے روزناموں میں خبر چھپی تھی کہ ایک لڑکی نے اپنے دو خواستگاروں سے "ڈوئل" کو کہا۔ وہ دونوں اس کے سامنے چھری خنجر لے کر ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔

جن کی نظر میں قوت فقط زورِ بازو کا نام ہے اور زن و مرد کے رشتے شروع سے آخر تک عورت پر ظلم اور استثمارِ مرد پر منحصر ہے۔ یہ لوگ باور نہیں کر سکتے کہ عورت، کمزور و نازک جنس بھلی درشت و سخت گیر مرد کو یوں ایک مرد کے خون کا پیاسا بنا سکتی ہے۔ ہاں، جو شخص عورت کی تخلیق میں ماہرانہ تدبیریں اور عجیب عجیب نسوانی قوتیں اور اشارتیں دیکھ سکتا ہے اسے معلوم ہے اسے باور آئے گا کہ بے شک وجودِ زن میں ایسی چیزیں چھپا رکھی ہیں اور ایسے امور عجیب نہیں ہیں۔

عورت، مرد پر بہت زیادہ اثرانداز ہوتی ہے۔ عورت کی مرد پر اثر آفرینی مرد کے اثرات سے زیادہ ہے۔ ہنر مرد کی نمود، اس کی دلاوری و بہادری اس کی شخصیت کا ابھار اور بڑاپن بہت کچھ عورت کی خوبصورت خودداری و ہمت افزائی اس کی پاک دامنی و حیا کی بدولت ہے۔ مرد کی بڑائی عورت کی "گراں بہا" ہونے کی حیثیت ہے۔ ہمیشہ عورت نے مرد کا کردار بنایا ہے وہ مرد جس کا معاشرے سے تعلق ہے اور جب پاک دامنی و حیا اور خودداری، عورت سے الگ ہو جاتی ہے اور عورت جب بھی مرد کے کردار ظاہر کرنے کے درپے ہوتی ہے تو سب سے پہلے تو وہ اپنا مہر کا استعمال غلط کرتی ہے۔ پھر مرد اپنی مردانگی بھول جاتا ہے اور معاشرہ کا ایوان ڈھے جاتا ہے۔

عورت کی وہ قوت جو پوری تاریخ میں اپنی شخصیت کو محفوظ رکھ سکی، اور مرد کے پیچھے دوڑنے سے روکتی رہی اور مرد کو اپنے آستانے پر طلب گار کی حیثیت سے طلب کرتی رہی جس نے اپنی خاطر مردوں کو رقابت و جنگ میں الجھایا، وہ مقابلے میں جان کی بازی لگا چکے، حیا اور عفت کو اپنا کردار بنائے، اپنا بدن لوگوں کی نگاہوں سے چھپائے اور اپنے تئیں پر اسرار ظاہر کرے۔ مرد کو الہام اور اس میں عشق کو جنم دے۔ اسے شجاعت و ہنرمندی میں شخصیت کے درجے پر پہنچائے، مرد میں نزل کا جذبہ، خاکساری و ناچیزی کا احساس پیدا کر کے اپنے سامنے جھکائے۔ اس عالم میں مرد کو خوشی بھی ہو۔ عورت کی یہی قوت مرد کو شادی کے وقت مہر کے نام سے عطیہ و ہدیہ پیش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

مہر، وہ عمومی آئین کی قانونی شق ہے جس کی تحریر متنِ تخلیق میں قلم قدرت نے فطرت کے قلم سے لکھوائی ہے۔

قرآن میں مہر

ہم نے کہا ہے کہ سماج کے پانچویں دور میں "مہر" کی ایک شکل ابھر کر سامنے آئی، یہ صورت، فطرت کی ایجاد ہے، قرآن مجید نے سماجی آلودگیوں سے اسے پاک صاف کر کے فطرت کا صحیح روپ نکھار دیا، قرآن کریم

اپنی بے مثال لطافت و خوش اسلوبی کے انداز میں کہتا ہے:

وآتوا النساء صدقتهن نحلة (النساء/۴)

یعنی، عورتوں کا مہر، جو انھیں کا ہے (باپ یا بھائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں) عطیہ و پیش کش کے طور پر خود ان کو دے دو۔

قرآن مجید نے اس چھوٹے سے جملے میں تین نکتوں کی طرف اشارے کیے ہیں:

۱- مہر کو مہر کے بجائے "صَدُقہ" (دال پر پیش) کے نام سے یاد کیا۔ صَدُقہ کا مادّہ ــ صدق ــ ہے۔ مہر کو صَدُقہ اس لیے کہا کہ وہ مرد کے رشتے کو سچا قرار دیتا ہے کشاف کے تفسیر نگار (زمخشری) جیسے حضرات نے اس نکتے کی تشریح کی ہے۔ اور راغب اصفہانی کے بقول (مفردات الفاظ القرآن) "صدَقہ" (دال پر زبر) کو صدقہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایمان کی دلیل ہے۔

۲- صدقات "ھن" میں ضمیر کے الحاق نے یہ اشارہ کیا ہے کہ "مہر" براہ راست عورت کا حق ہے۔ ماں باپ کا کوئی حصہ نہیں کہ انھوں نے دودھ پلایا، پالا پوسا، بڑا کیا لہٰذا یہ ان کا عوضانہ ہو۔ نہیں۔

۳- آیت میں "نحلہ" سے مزید توضیح ہو گئی کہ مہر ہدیہ اور پیش کش کے علاوہ کوئی نام نہیں قبول کر سکتا۔

حیوانات میں احساسات کا فرق

انسان ہی نہیں، تمام جانداروں میں جہاں بھی دو جنسی کا عمل موجود ہے وہاں دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ جنسِ نر میں نیازمندی زیادہ ہے۔ اس کے جذبات و احساسات میں نیازمندانہ رجحان زیادہ ہے اسی وجہ سے وہ اپنی ضرورت کے لیے جنس مادہ کی خوشی اور رضامندی حاصل کرنے کی خاطر آگے بڑھے۔ اسی بنیاد پر دونوں جنسوں کے تعلقات میں برابری ہو۔ جنسِ نر اپنی طاقت و قوت کی وجہ سے غلط فائدہ

نہ اٹھانے پائے اسے عاجزی و فروتنی میں رہنا چاہیے۔

غیر شرعی شادیوں میں ہدیے اور تحفے:

شرعی طور پر ہونے والی شادیوں سے خاص ربط نہیں غیر شرعی شادیوں میں بھی، جہاں ایک دوسرے کے وجود سے آزاد لطف اندوزی اور آزاد عشق بازی کی جاتی ہے۔ وہاں بھی مرد کو ایک ہدیہ نذر کرنا پڑتا ہے۔ اتفاق سے اگر کہیں چائے، کافی یا کھانے کو دل چاہے تو ہوٹل کا بل مرد کو ادا کرنا فرض ہے۔ مرد کے لیے عورت پیسے خرچ کرے تو مرد اپنے لیے ایک قسم کی توہین سمجھتا ہے۔ لڑکے کی عیش پرستی کے لیے امکانات اور دولت مند ہونا ضروری ہے۔ عورت کی عیش پرستی ہدیوں اور تحفوں کے جمع کرنے کا ایک بہانہ ہے۔ غیر قانونی اور ناجائز روابط زن و مرد میں یہ رسم موجود ہے۔ اس کی بنیاد زن و مرد کے غیر مشابہ جذبات ہیں۔

فرنگی کا عشق اس کی شادی سے بہتر ہے

مغربی دنیا میں، جہاں "حقوق انسانی" کی برابری کا نام لے کر "گھریلو زندگی" کے حقوق کو فطری طور طریقوں سے دور کر دیا گیا ہے۔ جہاں قانون فطرت کے خلاف کوشش جاری ہے کہ زن و مرد کو ایک دوسرے کا مشابہ بنا دیا جائے۔ اور گھریلو زندگی میں بیوی اور شوہر کو برابر کا مشابہ کردار اپنانا ہوگا۔ جہاں، عشق کا آزاد قدم گھر میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود، زن و مرد کے مقررہ قوانین فطرت اپنی رفتار سے باہر نہیں جا سکے وہاں اب بھی مرد اپنا فطری فریضہ ادا کرتا ہے۔ یعنی اظہار نیاز، طلب و درخواست، دولت نچھاور کرنا، دولت نذر کرنا۔ عورت کو ہدیہ پیش کرنا، بلکہ اس کے اخراجات برداشت کرنا۔ آج بھی یورپ میں رائج ہے۔

فرنگی شادی میں مہر کا وجود نہیں ہے۔ نفقہ و اخراجات کا بوجھ بیوی کو اٹھانا پڑتا ہے یعنی فرنگی معاشقہ، فرنگی شادی سے فطرت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔

مہر، ایک مثال ہے جو ہمیں اس گہرائی تک پہنچاتی ہے کہ زن و مرد غیر مشابہ انداز میں پیدا ہوے ہیں۔ اور قانونِ تخلیق نے فطری و طبیعی صلاحیتوں کے لیے غیر مشابہ دستاویز الگ الگ ہاتھوں میں دے دی ہے۔

مہر اور نفقہ

(۲)

گذشتہ فصل میں مہر کی ایجاد کا فلسفہ اور اس کی علت کا بیان ہم نے کیا ہے اور بتایا کہ مہر کی ایجاد کا سبب، دونوں جنسوں کے رشتے قانون تخلیق کے ہاتھوں دو الگ الگ ذمہ داریوں کا باعث ہیں۔ یہ بھی آپ جان چکے کہ "مہر" مرد کے نرم اور محبت آمیز جذبات کی پیداوار ہے۔ سخت اور مالکانہ احساسات کا اس میں دخل نہیں۔ عورتوں کی طرف سے جو حس زیادہ اثر ڈالتی ہے وہ اس کی خاص خودداری ہے یہاں اس کی کمزوری یا ارادے کی ناپختگی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ مہر قانون تخلیق کی طرف سے عورت کی قدر بڑھانے کے لیے اور اسے ایک بلند درجہ دینے کے لیے ہے۔ "مہر" عورت کو شخصیت عطا کرتا ہے "مہر" کی حقیقی قیمت عورت کی نظر میں اس کی مادی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔

جاہلیت کے رسم و رواج اسلام نے منسوخ کر دیے

قرآن مجید نے مہر کے بارے میں جاہلیت کی رسمیں منسوخ کر دیں اور اسے اپنی پہلی اور فطری حالت میں بحال کر دیا۔

جاہلیت میں، ماں باپ مہر کو حق زحمت اور اپنا حق "شیر بہا"[۱] جانتے تھے۔ تفسیر کشاف[۲] وغیرہ میں لکھا ہے کہ عرب میں لڑکی کی ولادت پر مبارک باد دینے والے کہتے تھے ھنیئاً لک

---

[۱] "شیر بہا" وہ رقم ہے جو دولہا لڑکی کے والدین کو پیش کرتا ہے۔ یعنی "دودھ کی قیمت" یہ رسم اب بھی عراق اور دوسرے علاقوں میں بطور رسم جاری ہے۔

[۲] ابوالقاسم محمود بن عمر، جاراللہ زمخشری متوفی ۵۳۸ھ جن کی تفسیر کا نام "الکشاف من حقائق التنزیل و عیون الاقاویل فی وجوہ التاویل" یہ عربی تفسیر بڑی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اور الکشاف کے نام سے مشہور ہے۔

النافجہ" ۔ یعنی ۔ افزائش دولت کی اساس مبارک ہو ۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ خدا کرے آپ لڑکی کو بیاہیں اور اس کا مہر پائیں ۔

جاہلیت میں، باپ وہ نہ ہوں تو بھائی، چونکہ ولی ہونے کے دعویدار تھے، قیمومت (سربراہی) کا حق انھیں حاصل ہوتا تھا۔ لہٰذا وہ اپنی پسند کا شوہر لاتے تھے، لڑکی کی رائے ضروری نہ تھی۔ اسی طرح مہر خود لیتے تھے، لڑکی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ لڑکیوں کا تبادلہ کرتے تھے یعنی ایک مرد دوسرے مرد سے کہتا تھا وہ اپنی لڑکی یا بہن دیتا ہے بشرطیکہ فریق مقابل بھی اپنی لڑکی یا بہن اس کے ازدواج میں دے۔ اس طرح ایک لڑکی دوسری لڑکی کا مہر قرار پاتی تھی اور یہ مہر، باپ یا بھائی لیتے تھے۔ اس طریقۂ ازدواج کو "نکاحِ شغار" کا نام دیا گیا ہے۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لاشغار فی الاسلام   اسلام میں لڑکی یا بہن کا عوض معاوضہ ممنوع ہے۔

اسلامی روایات کے مطابق صرف یہی نہیں کہ باپ کو مہر پر کوئی دست رسی نہیں بلکہ اگر شادی کے شرائط میں مہر کے علاوہ کوئی چیز مان لی جائے (زمین دی جائے گی یا کچھ اور) تو اس میں باپ حق دار و حصہ دار نہیں ہوگا۔

اسلام نے وہ رسم منسوخ کردی جس میں داماد اپنے خسر کی خدمت کرتا تھا۔ معاشرہ شناس علما کے نزدیک یہ اس دور میں ہوتا تھا جب انسان کو نقد تبادلے کا علم نہ تھا۔

داماد، اپنے خسر کی خدمت فقط اسی لیے نہیں کرتے تھے کہ باپ اپنی لڑکی کے رشتے سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، بلکہ اس کے اور اسباب بھی تھے اور ان میں بسا اوقات تمدن کے ارتقا کا بھی دخل ہوتا تھا۔ اور بجائے خود ظالمانہ انداز نہ تھا۔ بہر حال قطعی طور پر دنیا میں یہ رسم موجود تھی۔

واقعۂ موسیٰ اور شعیب، علیٰ نبینا وعلیہما السلام قرآن مجید میں موجود ہے[1] اس سے مذکورہ بالا

---

[1] پورا واقعہ دیکھیے سورۂ القصص آیت ۲۳ سے ۲۸ تک

رسم کے وجود کا سراغ ملتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلتے وقت "مدین" کے کنوئیں پر پہنچے، اس وقت شعیب علیہ السلام کی لڑکیاں اپنی بھیڑیں لیے ذرا دور کھڑی تھیں، کسی کو ان کی باری کا خیال نہ تھا، موسیٰ کو رحم آیا، انہوں نے ان لڑکیوں کی بھیڑ بکریوں کے پینے کے لیے پانی کھینچا اور انھیں سیراب کیا۔ لڑکیاں باپ کے پاس آئیں، اور قصہ بیان کیا، شعیبؑ نے آدمی بھیج کر موسیٰؑ کو اپنے گھر بلایا، ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ ایک دن شعیب نبی نے موسیٰؑ سے کہا، میں اپنی دو لڑکیوں میں سے ایک کی تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں، مگر تمھیں آٹھ سال میرے یہاں کام کرنا ہوگا، پھر اگر تمہارا دل چاہے تو مزید دو سال اور کام کرنا۔ یعنی دس سال تک۔ حضرت موسیٰ نے بات مان لی، اور وہ حضرت شعیبؑ کے داماد بن گئے۔ یہ رسم اس زمانے میں بہر حال تھی۔ اس کی بنیاد دو باتوں پر نظر آتی ہے۔

۱۔ سرمایہ نہ ہونا۔ داماد اپنے خسر یا بیوی کی جو خدمت کر سکتا تھا وہ کرتا تھا۔

۲۔ جہیز دینا۔ علم معاشرہ کے ماہر سمجھتے ہیں کہ جہیز کی رسم یعنی لڑکی کی طرف سے باپ کا کچھ ساز و سامان دینا پرانے زمانے سے چلا آتا تھا۔ اس ضمن میں داماد کو بطور اجیر کے رکھ لیتا یا اس سے کچھ مال وصول کرتا۔ عملی طور پر باپ جو کچھ داماد سے لیتا وہ لڑکی کے مفاد اور لڑکے کے کام کے لیے ہوتا تھا۔

اسلام نے یہ آئین ختم کر دیا۔ خسر، مہر کو اپنا مال نہیں سمجھ سکتا، خواہ اس کا یہ ارادہ ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس مال کو لڑکی کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ حق فقط لڑکی ہی کو ہے جسے اپنے مال کا اختیار ہے جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اسلامی روایات میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ اس طرح مہر مقرر کرنا درست نہیں۔

جاہلیت میں ایک اور رسم تھی جو عملاً لڑکی کو مہر سے محروم کر دیتی تھی۔ دستور تھا کہ مرنے والے کے ترکے میں اس کی بیوی بھی شمار ہوتی تھی۔ جب کوئی شخص مر جاتا تھا تو اس کے وارث مثلاً اولاد یا بھائی جیسے مرتے والے کے سرمایے سے ترکہ لیتے اور مالک بنتے، اسی طرح

اس بیوی کی زوجیت بھی ترکے میں پاتے مرنے والے کا لڑکا یا بھائی اس کا مختار ہوتا اور جسے چاہتا وہ عورت نکاح میں دیتا اور مہر کا خود مالک بنتا۔ یا نیا مہر مقرر کیے بغیر اپنی بیوی قرار دے لیتا تھا۔

قرآن کریم نے زوجیت کی میراث کا دستور منسوخ کر دیا:

یا ایہا الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرھا[1]

پیغمبر اور قرآن پر ایمان لانے والو، یاد رکھو، تمھارے لیے جائز نہیں کہ اپنے مورثوں کی بیویوں کو میراث بناؤ، دراں حالے کہ وہ عورتیں تمھاری بیوی نہ بننا چاہیں۔

قرآن کریم کی دوسری آیت میں کلی طور پر باپ کی بیوی سے شادی پر پابندی لگا دی گئی ہے خواہ وہ میراث کے طور پر نہ بھی ہو۔ آزادانہ اور رضامندی سے کرنا چاہیں، جب بھی حکم ہے کہ:

ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم[2]

جن سے تمھارے باپ شادی کر چکے ان سے تم نکاح نہ کرنا۔

جو رسم بھی عورتوں کے حق مہر کو نقصان پہنچاتی تھی اسے قرآن مجید نے ختم کیا۔ ان میں سے ایک وہ موقع جب آدمی کا دل ایک عورت سے بھر جاتا تھا، توجہ نہ رہتی تھی، تو وہ شخص بیوی پر تنگی اور سختی کرتا طلاق پر تیار کرکے دیے ہوئے مہر کا کچھ حصہ یا پورا مہر واپس مانگتا تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا:

ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن

یعنی عورتوں کو کچھ دیا مال مہر واپس لینے کی خاطر تنگ نہ کرو۔

ایک رسم یہ بھی تھی کہ آدمی کبھی بھاری مہر دے کر شادی کرتا پھر عورت سے دل سیر ہو جاتا

[1] القرآن الکریم ۔ سورۃ النساء آیت /۱۹

[2] القرآن الکریم ۔ سورۃ النساء آیت /۲۳

تو پیچھا چھڑانے اور نئی شادی رچانے کی خاطر، دیا ہوا بھاری مہر واپس لینے کی فکر میں عورت پر بہتان باندھتا، اس کی آبرو پر داغ لگاتا اور یہ جتاتا تھا کہ عورت پہلے ہی سے شادی کے لائق نہ تھی اس کا نکاح فسخ ہونا اور میرا مہر واپس ملنا چاہیے۔ قرآن مجید نے اس رسم کو بھی منسوخ کر دیا۔

مہر کا نظام خاص اسلام کا نظام ہے

دین اسلام کے مسلمات میں ایک بات ہے کہ مرد، عورت کے مال اور کاروبار سے سروکار نہ رکھے۔ وہ بیوی کو کام کرنے کا حکم نہیں دے سکتا کہ یہ کام میرے لیے کرو وہ نہ کرو۔ اگر عورت کوئی ایسا کام کرے جس سے اسے پیسہ حاصل ہو تو مرد کو عورت کی مرضی حاصل کیے بغیر اس دولت میں تصرف کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس جہت سے مرد و زن میں برابری ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک مسیحی رسم اس کے برخلاف تھی۔

اسلام کی نظر میں شوہر دار بیوی اپنے حقوق معاملات میں شوہر کی سرپرستی سے آزاد ہے، وہ اپنے کاروبار خود کر سکتی ہے۔ عین اس اقتصادی آزادی کی صورت حال میں بھی جبکہ اسلام نے شوہر کو مال اور کاروبارِ زوجہ پر حق نہیں دیا، مہر کی معافی نہیں کی، یہ حکم بجائے خود بتاتا ہے کہ مہر، اسلام کی نظر میں اس لیے نہیں ہے کہ مرد کچھ عرصے بعد عورت کی ذات سے مالی فائدہ اٹھائے اور اس کی جسمانی قوت کا استثمار کرے۔ اسی وجہ سے اسلام کا نظام مہر اس کی خصوصیات سے ہے۔ مہر کے اس سسٹم کو دوسرے نظام اور فلسفے سے مخلوط نہ کرنا چاہیے جو اعتراضات وہاں ہوتے ہیں اسلام کے نظام مہر پر نہیں ہو سکتے۔

آئینِ فطرت

ہم نے کہا ہے کہ قرآن مجید نے مہر کو "نحلہ" عطیہ کہا ہے۔ قرآن نے اس عطیہ و بخشش کو لازمی کر دیا۔ قرآن نے بڑی باریک بینی سے فطرت کی گہرائیوں کو پیش نظر رکھا۔ زن و مرد کے خاص رویوں کے بارے میں جو فطرت نے دونوں میں چھپا رکھے ہیں، اسلام نے دوستی کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے ملحوظ رکھتے ہوئے مہر کو نظر انداز نہ کرنے کی تاکید کی۔ عورت کا رویہ، مرد کی محبت کا شکریہ

ہونا چاہیے۔ عورت کی محبت ہی اچھی ہے اس کے ردّ عمل میں مرد کی محبت ہو گی ابتدا میں نہیں۔ (کلیہ ہے) عشق میں عورت کی پہل۔ یعنی جو عشق عورت کی طرف سے شروع ہو اور مرد کی درخواستِ ابتدائی شریک نہ ہو وہ ہمیشہ شکست پاتا ہے اور عورت کی شخصیت مُرجھا جاتی ہے، اس کے برخلاف عورت کا جو عشق مرد کی محبت کے جواب میں ہو، ایسا عشق نہ خود ناکام ہوتا ہے، نہ عورت کی شخصیت کو نقصان و شکست سے دوچار کرتا ہے۔

کیا یہ سچ ہے کہ عورت بے وفا ہوتی ہے؟ عورت کی محبت کمزور ہوتی ہے؟ عورت کے عشق پر اعتبار نہ کرنا چاہیے؟

یہ بات سچ بھی ہے اور جھوٹ بھی۔ سچ ہے، اگر عشق کی ابتدا عورت کی طرف سے ہو۔ اگر کوئی عورت کسی مرد پر عاشق ہو جائے، کسی کو دل دے دے تو عشق کی آگ جلدی بجھ جاتی ہے۔ ایسے عشق پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ جھوٹ ہونے کی صورت وہ ہے جہاں عورت کے دل میں آگ بھڑکے اور عشق بطور عشق مرد کے ردعمل میں شعلہ فشاں ہو۔ مرد کے عشق صادق کے جواب میں جذبۂ محبت عورت کے دل میں بیدار ہوا ہو۔ یہ عشق عملاً فسخ ہو جائے، بعید از حقیقت ہے۔ ہاں، مرد کا عشق ٹھنڈا ہونے لگے تو عورت کا جذبۂ عشق بھی تمام ہو جائے گا۔ عورت کا فطری عشق اس نوع کا ہوتا ہے۔

عورت کی بےوفائی کی شہرت نوع اول (پہلی قسم) کی محبت و عشق سے متعلق ہے۔ اور جہاں عورت کی وفاداری مشہور ہے وہ عشق کی دوسری قسم سے وابستہ ہے۔ معاشرے کو اگر زن و شوہر کے رشتے میں مضبوطی کی ضرورت ہے تو وہ ایسے راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہے جو قرآن مجید نے اختیار کیا ہے۔ یعنی قوانین فطرت کی نگہداشت۔ جس میں ایک مسئلہ محبت میں زن و مرد کا فطری رویّہ ہے۔ اس رویہ پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ قانونِ مہر بھی فطرت سے ہم آہنگ ہے۔ مہر، زمین ہموار کرتا ہے وہ نشانی ہے کہ عشق و محبت مرد کی طرف سے شروع ہوئی ہے، عورت اس محبت کی جوابدہ ہے اور مرد نے اس کے احترام میں ایک ہدیہ نثار کیا ہے

لہذا، قانون مہر کو - جو کلی و مجموعی آئین اساسی کی دفعہ ہے - اور خالقِ فطرت کی طرف سے تدوین یافتہ ہے - حقوق مرد و زن کی برابری کا بہانہ بناکر کالعدم قرار دینا غلط ہے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ قرآن نے مہر کے سلسلے میں، جاہلیت کے رسم و رواج کو اس عہد کے مردوں کی خواہش کے باوجود بدل دیا۔ قرآن مجید میں مہر کے بارے میں جو کچھ ہے وہ جاہلیت کی رسم نہیں تھی جو ہم یہ کہہ سکیں کہ قرآن، مہر کے ہونے نہ ہونے کو براہ راست کوئی اہمیت نہیں دیتا - قرآن مہر کو یکسر منسوخ کر سکتا تھا وہ مردوں کو اس پابندی سے بچا سکتا تھا مگر اس نے یہ نہ کیا۔

نقد و نظر

مہر کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر آپ نے سمجھ لیا، یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں مہر کا فلسفہ کیا ہے۔ اب مناسب ہے کہ اسلامی قوانین اس مسئلہ پر نقد کرنے والوں کی باتیں سنیں۔

خانم منوچہریان، نے اپنی کتاب "انتقاد بر قوانینِ اساسی و مدنی ایران" میں مہر کے اوپر ایک فصل میں لکھا ہے:

"جیسے باغ، مکان، گھوڑے یا خچر کے لیے مرد کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح بیوی خریدنے کے واسطے جیب سے پیسے نکالنا پڑتے ہیں اور جس طرح گھر، باغ اور خچر کی قیمت بڑے چھوٹے، خوبصورت اور بدشکل ہونے سے گھٹتی بڑھتی ہے یونہی عورت بھی بدصورتی، زیبائی، دولت مندی اور غربت کی بنیاد پر کم و زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ ہمارے مہربان و جوانمرد قانون ساز حضرات نے، عورت کی قیمت پر بارہ دفعات قلمبند کیے ہیں۔ فلسفہ ان کا یہ ہے کہ اگر میاں بیوی کے رشتے میں روپے کا ذکر نہ ہو تو یہ رشتہ کمزور اور جلد ٹوٹ جاتا ہے۔"

اگر مہر کا قانون کسی اجنبی نے بنایا ہو، کیا اس وقت بھی اتنی ہی بے تو جہی و تہمت و افترا کا سبب ہوگا؟ کیا جب بھی اور جو بھی روپیہ پیسہ کوئی کسی کو دیتا ہے تو وہ اسے خریدنا چاہتا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو بخشش و ہدیہ و تحفہ کی رسم کو ختم کر دینا چاہیے۔ قانونِ مدنی میں

مہر کی بات قرآن مجید کی اساس پر ہے۔ قرآن نے صاف صاف کہا ہے کہ مہر، عطیہ و پیش کش کے علاوہ اور کوئی عنوان نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ اسلام نے اقتصادی قوانین کچھ اس طرح بنائے ہیں جن میں شوہر کو بیوی کے مال سے اقتصادی فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اس صورت میں مہر کو "قیمت زن" کے نام سے کیوں یاد کیا جاسکتا ہے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایرانی مرد اپنی بیویوں سے اقتصادی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں بھی مانتا ہوں، واقعاً، بہت سے ایرانی مرد بیوی کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن اس کا مہر سے کیا تعلق ہے۔ مرد یہ تو نہیں کہتے کہ چونکہ ہم نے مہر ادا کیا ہے لہٰذا ہم اپنی بیویوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ایرانی مردوں کی اپنی بیویوں پر حکمرانی کا مرکزی نکتہ کچھ اور ہے۔ مردوں کی اصلاح کے بجائے قانونِ فطرت کو بگاڑنے، اور مزید خرابیوں کو جنم دینے کی وجہ کیا ہے؟ اس پوری گفتگو میں صرف ایک بات پردے کی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایرانی، مشرق کے باشندے اپنے انسانی معیار، اور زندگی کا فلسفہ بھول جائیں اور اجنبی رنگ و شکل بنالیں تاکہ ان کا نگلنا آسان ہو جائے خانم منوچہریاں کہتی ہیں:

"اگر عورت اقتصادی حیثیت سے مرد کے برابر ہو تو اس کے لیے نان و نفقہ و لباس و مہر کے قائل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے اور بہت سی بندشیں بندیاں اور مرد سے معاملات کو یکجا کرنے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔

اگر اس گفتگو کی چھان پھٹک کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا: جن تاریخی ادوار میں عورت کو حق مالکیت اور اقتصادی آزادی حاصل نہ تھی اس دور میں مہر و نفقہ کی کسی حد تک معقول وجہ موجود تھی، مگر جب عورت کو اقتصادی آزادی دے دی گئی۔ جیسے اسلام میں، تو اب مہر و نفقہ کا جواز باقی نہیں۔

ان لوگوں کے خیال میں مہر کا صرف فلسفہ یہ ہے کہ عورت کے اقتصادی حقوق چھین کر فقط مہر دے دیا جائے۔ بہتر ہوتا کہ یہ حضرات مختصر سا مطالعۂ قرآن بھی کر لیتے اور مہر کی جو

تعبیر آیات میں کی گئی ہے ان پر غور کر کے مہر کا اصلی فلسفہ دریافت کرتے اور جب انھیں اس کتاب کے اعلیٰ منطقی دلائل معلوم ہوتے تو بہت خوش ہوتے کہ ان کے ملک کی آسمانی کتاب ایسی عالی مرتبہ ہے۔

چالیس نکاتی تجویز کے مصنف نے رسالہ "زن روز" کے شمارہ ۸۹ صفحہ ۱۷ پر جاہلیت میں عورت کے افسوس ناک حالات اور اس بارے میں اسلامی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"چونکہ عورت و مرد، مساوی پیدا کیے گئے ہیں لہذا قیمت یا اجرت کی یکطرفہ ادائگی عقلی دلیل و منطق کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے مرد کو عورت کی ضرورت ہے اسی طرح عورت کو بھی مرد کی ضرورت ہے۔ تخلیق میں ان کو ایک دوسرے کا محتاج پیدا کیا گیا ہے۔ دونوں برابر کی ضرورت کے محتاج ہیں۔ لہذا ایک کو کسی چیز کا پابند کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا بے دلیل بات ہے۔ اس نقطہ نظر سے کہ طلاق مرد کے اختیار میں ہے اور عورت کی مشترک زندگی محفوظ نہیں تھی لہذا مہر کا حق عورت کو دے کر، شوہر کی شخصیت پر بھروسے کے ساتھ ایک مالی مطالبے کا بھی وثیقہ مانگا گیا....."

صفحہ ۷۲ پر فرماتے ہیں:

"اگر دفعہ ۱۱۳۳، قانون مدنی، جس میں تصریح ہے: "مرد جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔"

اس کی اصلاح کر دی جائے اور مرد کی خواہش و رائے پر طلاق نہ ہو تو "مہر" و "صداق" کا فلسفۂ وجود خود بخود ختم ہو جائے گا۔

اس قسم کی باتوں کی وقعتی ہماری سابقہ گفتگو کے بعد واضح ہو چکی، مہر، قیمت یا اجرت نہیں، منطق و عقلی بات بھی کہی جا چکی۔ زن و مرد باہم برابر کی محتاجی نہیں رکھتے۔ فطرت نے دونوں کو مختلف جہتوں میں رکھا ہے۔

سب سے زیادہ بے اساس یہ بات ہے کہ مرد کے حق طلاق کے مقابلے میں مہر کا فلسفہ مالی

دستاویز بیان کیا گیا ہے اور دعوی ہے کہ اسلام نے اسی بنیاد پر مہر مقرر کیا ہے۔

اس قسم کے حضرات سے پوچھنا چاہیے :

اسلام نے مرد کو حق طلاق کیوں دیا جو عورت کو مالی دستاویز کی ضرورت پڑی ؟

اس کے علاوہ آپ کی بات کا تو مطلب یہ ہوا کہ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازدواج محترمہ کا مہر اس لیے مقرر کیا کہ حضرت اپنے مقابلے میں مالی دستاویز دینا چاہتے تھے۔ اور حضرت علیؑ وحضرت فاطمہ سلام اللہ علیہما کے درمیان مہر اس وجہ سے تھا کہ حضرت فاطمہؑ کو مالی دستاویز دے کر علیؑ کے بارے میں ذہنی اطمینان حاصل کریں۔

اگر حقیقت یہ ہوتی تو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورتوں کو یہ نصیحت کیوں فرماتے کہ اپنا مہر شوہروں کو بخش دیا کریں ۔ اور اس بخشش کے ذیل میں ثواب کیوں بیان فرماتے ؟ نیز یہ کہ یہ نصیحت کیوں فرماتے کہ حتی الامکان مہر زیادہ نہ رکھا جائے ؟ کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک شادی کا ہدیہ مرد کی طرف سے عورت کے نام مہر کے طور پر دیا جائے اور عورت کی طرف سے مہر یا اس کے مساوی بخشش الفت اور رشتۂ ازدواج میں استحکام کا باعث نہ تھا ؟

اگر اسلام کی نظر میں مہر، مالی وثیقہ و دستاویز ہوتا، تو آسمانی کتاب میں "وآتوا النساء صَدُقاتِهِنَّ نِحْلَةً" کیوں ہے۔ یہ کیوں نہیں کہ "وآتوا النساء صدقاتهن وثيقة"

ان باتوں سے بڑھ کر ۔ مصنف مذکور نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ صدر اسلام میں رسم مہر ایسی ہی تھی جیسے آج ہے ۔ آج کل کی رسم کے مطابق، مہر میں نمایاں پہلو مرد کی ایک ذمّے داری و فریضہ ہے۔ یعنی مرد ایک رقم معین عقد و دستاویز کے مطابق قبول کرتا ہے، عموماً اس رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاتا، البتہ، لڑائی جھگڑے کے وقت مطالبہ ہوتا ہے، تو اس قسم کا مہر دستاویزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ صدر اسلام میں دستور

تھا کہ مرد، مہر کے نام سے جس کا وعدہ کرتا تھا وہ نقد ادا کر دیتا تھا۔ لہٰذا، مہر کو اسلام کے نزدیک دستاویز قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی، مہر کے بغیر کسی زوجہ کو شوہر کے حوالے کرنے پر خوش نہ ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ شیعہ سنی کتابوں میں مذکور ہے:

ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور حاضرینِ بزم کے سامنے کہنے لگی:

— یا رسول اللہؐ! مجھے اپنی زوجیت میں قبول فرمالیں۔

آنحضرتؐ نے سکوت اختیار فرمایا، کوئی جواب نہ دیا، وہ عورت بیٹھ گئی۔ ایک صحابی نے کھڑے ہو کر عرض کی۔

— یا رسول اللہ! اگر آپ مائل نہیں تو میں حاضر ہوں!

آنحضرتؐ نے پوچھا:

— مہر کیا دو گے؟

— میرے پاس کچھ نہیں۔

— یوں تو نہیں ہوسکتا، گھر جاؤ، شاید کچھ مل جائے، جو ملے وہ لے آؤ اور اس بی بی کا مہر دے دو۔

وہ آدمی گھر گیا، واپس آیا، اسے گھر میں کچھ نہ ملا۔

— اچھا دوبارہ جاؤ، ایک لوہے کی انگوٹھی مل جائے تو وہی لے آؤ کافی ہے۔

دوسری مرتبہ گیا، گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ عرض کرنے لگا، بس یہی کپڑے ہیں جو پہنے ہوئے ہوں۔

ایک صحابی نے   سے پہچان لیا اور کہا، یا رسول اللہؐ بخدا اس شخص کے پاس

اس لباس کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی کے نصف کو مہر قرار دے دیجئے۔
آنحضرتؐ نے فرمایا:
اگر اسے دو حصے کر دیا جائے تو کسی کا بھی جسم تو نہ ڈھکے گا۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔
وہ شخص بیٹھ گیا۔ عورت اسی انتظار میں دوسری طرف بیٹھی تھی۔ محفل میں باتیں ہونے لگیں اور دیر ہو گئی۔ وہ شخص اٹھا کہ جائے، آنحضرتؐ نے آواز دی:

— ادھر آؤ! — وہ حاضر ہوا۔
— اچھا یہ بتاؤ، قرآن آتا ہے؟
— جی ہاں! یا رسول اللہؐ، فلاں فلاں سورہ آتا ہے۔
— زبانی سنا سکتے ہو!
— جی ہاں، سنا سکتا ہوں۔
— اچھا، ٹھیک ہے، یہ عورت تمہارے عقد میں دیتا ہوں، اور مہر یہ ہے کہ اسے قرآن کی تعلیم دے دو۔

اس شخص نے بیوی کا ہاتھ ہاتھ میں لیا اور دونوں چلے گئے۔
مہر کے بارے میں اور بہت سی باتیں کہنے کی ہیں مگر اب نہیں پر ٹھہرتا ہوں۔

مہر و نفقہ

(۳)

نفقہ :

ہم مہر کے بارے اسلام کا نظریہ و فلسفہ بیان کر چکے، اب "نفقہ" کے متعلق بحث باقی ہے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلامی قوانین میں "نفقہ بھی" "مہر" کی طرح ایک خاص نہج و انداز کی چیز ہے، اس کو ان معنوں میں نہ سمجھنا چاہیے جو غیر اسلامی دنیا میں تھے یا آج بھی اس کا کوئی مفہوم کہیں مراد لیا جاتا ہو۔

اگر اسلام نے مرد کو یہ حق دیا ہوتا کہ عورت کو اپنی خدمت گذاری کے لیے رکھو، بیوی کی محنت، کاروبار اور اس کی دولت کو اپنا مال سمجھو۔ تو نفقہ دینے کے معنی عیاں تھے۔ واضح سی بات ہے، جب انسان کسی جانور یا آدمی سے اقتصادی فائدہ اٹھائے گا تو اس کے اخراجات زندگی بھی پورے کرے گا۔ گھوڑے والا اپنے گھوڑے کو دانہ پانی نہ دے گا تو جانور بھی گاڑی نہ کھینچے گا۔

اسلام، مرد کے اس حق کو نہیں مانتا، اس نے عورت کو حق ملکیت دیا ہے۔ وہ دولت کما سکتی ہے۔ مرد کو حق نہیں کہ بیوی کی خاص دولت میں تصرف کرے اور لازم قرار دیا کہ گھر کا بجٹ پورا کرے بیوی، بچوں کا خرچ نوکر چاکر، کام کاج، گھر وغیرہ کے اخراجات ادا کرے۔ کیوں، علت و سبب کیا ہے؟

افسوس ہے، مغرب نواز ایک لمحہ کے لیے ان معاملات پر ذرا بھی توجہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ آنکھیں بند کر کے بعینہ وہی اعتراضات کرتے ہیں جو یورپ والے اپنے قانونی سسٹم پر کرتے ہیں ــــــ اور وہ صحیح بھی ہیں۔ یہ لوگ انھیں اعتراضات کو اسلامی قوانین

پر دھرا دیتے ہیں۔

اگر کوئی کہتا ہے کہ مغرب میں بیوی کا نان و نفقہ انیسویں صدی میں وظیفہ خواری و تنخواہ داری و نشان کنیزی تھا تو غلط نہیں کہتا، سچ کہتا ہے۔ آخر ایک عورت بے معاوضہ پابند ہو کر مرد کی گھریلو زندگی کی دیکھ بھال کرے اور ملکیت سے محروم بھی ہو تو جو دو نوالے اسے دیے جائیں گے وہ تنخواہ و وظیفے سے زیادہ کیا ہوں گے، جیسے قیدی یا، بارکش جانور کا راتب۔

اگر دنیا میں کوئی قانون ایسا موجود ہو، جو خاص طور پر جو مرد کی گھریلو زندگی کی ذمہ داریوں کا بطور فرض والا بوجھ، بیوی کی گردن سے اٹھا لے، اسے دولت کمانے کا حق اور اقتصادی آزادی دے، گھریلو بجٹ میں شرکت سے معاف رکھے، جب تو یقیناً کوئی فلسفہ جدا گانہ ہوگا۔ اور اس کے اوپر غور کرنا پڑے گا۔

انیسویں صدی کے آخری حصے تک فرنگی عورت کی محرومی۔

ڈاکٹر شائگان نے "شرحِ قانونِ مدنی ایران کے صفحہ ۳۶۲ پر لکھا ہے:

"عورت اپنی ملکیت میں جو خود مختاری رکھتی ہے وہ فقہ شیعہ میں ابتدا سے تسلیم شدہ ہے۔ یونان، روم، جاپان اور کچھ عرصہ پہلے اکثر ممالک کے قوانین میں یہ بات مذکور نہ تھی۔ یعنی بیوی، نابالغ اور دیوانے کی طرح اپنی ملکیت سے "مجبور" یعنی وہ اپنی جائداد و املاک میں تصرف سے محروم تھی۔ انگلستان میں ایک زمانہ وہ تھا کہ بیوی کی حیثیت، شوہر کے وجود میں محو تھی۔ سنہ ۱۸۷۰ء اور سنہ ۱۸۸۲ء میں باری باری دو قانون وضع ہوئے جن کا نام شوہر رکھنے والی خواتین کا قانونِ ملکیت اس کی وجہ سے کورٹ آف وارڈس سسٹم کا خاتمہ ہوا۔

اٹلی میں یہ قانون سنہ ۱۹۱۹ء میں اور سنہ ۱۹۰۰ء میں جرمن کے "قانونِ مدنی (سول لا) یونہی سنہ ۱۹۰۷ء میں سوئیزرلینڈ کے قانون نے، بیوی کی اہلیت و حق ملکیت و تصرف کو تسلیم

کیا جیسے شوہر کو یہ حق حاصل تھے۔

لیکن پرتگال و فرانس میں، با شوہر بیوی مجبور شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ ۱۹۳۸ء کی ۱۸ فروری کو فرانس میں حجر (کورٹ آف وارڈس) کے ضابطے کو ہموار کر دیا گیا ہے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے، صدی کی بات ہے یعنی بیوی کو شوہر کے مقابلے میں حق ۱۸۸۲ء میں ملا۔ وہ بھی۔ انگلستان میں یا بیوی کی ملکیت سے بہ اصطلاح قانون "کورٹ آف وارڈ شپ ختم ہوئی۔

یورپ نے عورت کو اچانک اقتصادی خود مختاری کیوں دے دی؟

ایک صدی پہلے یہ حادثہ رونما ہوا کیسے؟ کیا مردوں کے انسانی جذبات میں جوش آیا اور انھیں اپنے ظالمانہ رویے کا احساس ہوا؟

ویل ڈیورینٹ نے اس کا جواب دیا ہے، اس نے کتاب" لذاتِ فلسفہ" میں وجوہ و اسباب، کے عنوان سے ایک بحث کی ہے۔ یورپ میں آزادی خواتین کے اسباب و علل پر اس میں تفصیل مہیا کی ہے۔ افسوس ناک بات جو وہاں ملی وہ یہ ہے کہ یورپ کی آزادی و حق ملکیت عورت کو مشین کا شکر گذار ہونا چاہیے آدمیوں کا نہیں۔ اسے بڑی بڑی مشینوں کے پہیوں کے سامنے جھکنا چاہیے۔ مغربی مردوں کے سامنے نہیں۔ یہ تو کارخانہ داروں کی حرص تھی، انھوں نے عورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی خاطر مزدوری کم اور کام زیادہ کے نقطۂ نظر سے انگلستان کی قانون ساز اسمبلی میں مسودۂ قانونِ آزادی اقتصادی خواتین کا بل پیش کر دیا۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:۔

"رسم و رواج قدیم کی دگرگونی کا کیا سبب بتاؤں وہ رسم و رواج جو تاریخ مسیحیت سے بھی پرانے تھے؟ ایک عام سبب اس تبدیلی کا مشینوں اور

کارخانوں کی فراوانی ہے۔ "آزادی خواتین" صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے......"

"ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کاروبار ملنا مشکل ہو گیا تھا مگر روزانہ اشتہاروں میں ان سے کہا جاتا تھا کہ اپنی بیوی بچوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ کارخانہ داروں کو اپنے منافع اور حصوں کی فکر تھی وہ حکومت کے اخلاق و رسم و رواج سے اپنا ذہن پریشان نہیں کر سکتے تھے۔ جن لوگوں نے بے خبری کے عالم میں "گھر پھونکنے" کا منصوبہ بنایا وہ وطن دوست، انیسویں صدی کے وطن پرست کارخانہ دار تھے۔"

"ہماری پرانی ماؤں کی آزادی کے لیے پہلا قدم سنہ ۱۹۸۲ء کا قانون تھا۔ اس قانون کی رو سے عظیم برطانیہ کی خواتین نے بے مثال امتیازات حاصل کیے۔ وہ جو پیسے حاصل کریں اپنے لیے محفوظ کر سکتی تھیں۔ اس اعلیٰ درجے کا اخلاقی و مسیحی قانون، کارخانہ داروں نے مجلس عوام میں پیش کیا تاکہ انگلستان کی خواتین کو فیکٹریوں میں کھینچ سکیں، اس وقت سے آج تک ناقابل مقابلہ نفع اندوزی نے غلامی، جان کنی، گھروں سے نکالنے کی مہم جاری ہے۔ عورتیں بندگی میں گرفتار، نزع کے عالم میں بڑی بڑی دوکانوں اور کارخانوں میں زندگی گذار رہی ہیں۔"

آپ نے دیکھا کہ سرمایہ داروں اور مالکان کارخانہ نے انگلستان میں اپنے مادی منافع کی خاطر عورتوں کے حق میں یہ قدم اٹھایا تھا۔

قرآن اور خواتین کی اقتصادی آزادی

اسلام نے چودہ سو برس پہلے ایک قانون دیا:

للرّجال نصیب ممّا اکتسبوا وللنساء نصیب ممّا اکتسبن [1]

مرد جو کچھ کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کماتے ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں قرآن مجید نے مردوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا مالک اور عورتوں کو ان کے نتائج کار و کوشش کا حقدار قرار دیا ہے۔

[1] القرآن الکریم - النساء / ۳۲

دوسری آیت مبارکہ میں ارشاد ہے :-

للرّجال نصیب ممّا ترک الوالدان والاقربون وللنسآء نصیب ممّا ترک الوالدان والاقربون۔[1]

جو مال باپ یا ماں یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں مردوں کا حصہ ہے اور جو مال ماں باپ یا قرابت دار مرنے کے بعد چھوڑیں اس میں عورتوں کا حصہ ہے۔

اس آیت سے خواتین کی وارث ہونے کی حیثیت ثابت ہوتی ہے۔ عورت کے وارث ہونے نہ ہونے کی تاریخ بھی تفصیل طلب ہے جسے انشاء اللہ ہم بیان کریں گے۔ جاہلیت کا عرب عورتوں کو میراث دینے پر تیار نہ تھا۔ قرآن نے عورتوں کا یہ حق ثابت کر دیا۔

ایک تناظر : قرآن کریم نے تیرہ سو برس پہلے یورپ میں عورتوں کو اقتصادی آزادی عطا کی فرق یہ تھا :

۱۔ اسلام کا خواتین کو اقتصادی آزادی عطا کرنے کا سبب، اسلام کی انسانی جہت، عدل و دوستی و الٰہیت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ نہ انگلستانی کارخانہ داروں کی ہوس نفع اندوزی تھی جس نے اپنے پیٹ بھرنے کے لیے یہ مسودۂ قانون پیش کیا ہو۔ اس کے بعد وہ ڈھول پیٹتے کہ ہم نے عورت کے حقوق کو قانونی طور پر منوایا، ہم نے زن و مرد کے حقوق کو برابر تسلیم کیا۔

۲۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی بخشی، لیکن بقول ول ڈیورینٹ، "خانہ براندازی" نہیں کی۔ گھر میں آگ نہیں لگائی۔ خاندانوں کی نیو نہیں اکھیڑی، بیویوں کو شوہروں، بیٹیوں کو باپوں کے خلاف سرکشی پر نہیں ابھارا۔ اسلام نے ان دو آیتوں سے ایک عظیم سماجی انقلاب برپا کیا مگر پرسکون، بے ضرر اور بے خطر۔

---

[1] القرآن الکریم، النساء آیت / ۷

۲- یورپ نے جو کچھ کیا وہ بقول "ویل ڈیورانٹ" یہ تھا کہ عورت کو گھر کی بندگی وجاں کندنی سے آزاد کر کے دوکانوں اور کارخانوں کی بندگی وجاں کندنی میں ڈال دیا، یعنی مغرب نے ایک ہتھکڑی بیڑی، عورت کے ہاتھ پاؤں سے کھولی اور دوسری ہتھکڑی بیڑی ڈال دی۔ اسلام نے عورت کو مرد کی بندگی وکنیزی سے گھر اور کھیت دونوں جگہ آزادی بخشی اور مرد کو گھریلو اجتماعی زندگی کے اخراجات کا ذمہ دار بنایا، عورت کے کاندھوں سے اپنے اور گھر کے اخراجات اور ہر قسم کا جبر و پابندی کا بوجھ اتار دیا۔ اسلام کی نظر میں عورت انسانی خمیر کے مطابق دولت کے حصول، اس کی حفاظت واضافہ کی سعی کر سکتی ہے۔ اسے زندگی کا جبر نہیں دبا سکتا اور اس کی خودداری وجمال وزیبائی ہیئتہ اطمینانِ خاطر کے ساتھ اس کے ہمراہ رہ سکتی ہے زندگی کا جبر اسے نہیں چھین سکتا۔ لیکن کیا کیا جائے ہمارے کچھ لکھنے والوں کی آنکھیں اور کان بند ہو چکے ہیں کہ ان مسلم تاریخی وفلسفی حقائق کو سوچیں۔

انتقاد اور جواب

خانم منوچہریان نے "انتقاد بر قوانین اساسی ومدنی ایران کے صفحہ ۲ پر لکھا ہے:

"ہمارا سول لا، ایک طرف تو مرد کو اپنی بیوی کا نفقہ دینے پر تیار کرتا ہے۔ اس کے لیے کپڑے لتے، خوراک اور مکان دے، جیسے مالک اپنے گھوڑے گدھے کے لیے خوراک اور تھان مہیا کرتا ہے اسی طرح بیوی کو کم از کم زندگی کے یہ اسباب فراہم کرے دوسری طرف نہ معلوم کیوں سول لا کی دفعہ ۱۱۱۰ میں لازم قرار دیتا ہے کہ عدۃ وفات میں بیوی کو نفقہ کا حق نہیں ہے۔ حالانکہ وفاتِ شوہر کے وقت عورت مہربانی تسلی کی محتاج ہوتی ہے، وہ اپنے مالک کو ہاتھ سے کھو بیٹھنے پر پریشان حال وآشفتہ خاطر نہ ہو، ہمدردی وغم خواری چاہتی ہے۔ ممکن ہے آپ فرمائیں کہ تم تو آزادی کا دم بھرتی ہو، ہر منزل میں مرد کے برابر ہونا چاہتی ہو یہاں وظیفہ خوار ومراتب دار بننے کی آرزو کیوں ہے۔ یہ امید کیوں کرتی ہو کہ شوہر کے بعد بھی بندگی وتنخواہ جاری رہے۔ جواب یہ ہے

کہ فلسفۂ کنیزی زن کے مطابق جو "سوال" کا سانچہ ہے۔ بقول سعدی اچھا ہوتا کہ "مالکان آزادی" اپنے بعد کے لیے بھی بیوی کے لیے نفقہ مقرر کر جاتے۔ اور قانون اس پہلو کی نگہداشت کرتیا"

ہم محترمہ سے پوچھتے ہیں، قانونِ مدنی اور قانونِ اسلام یا بقول آپ کے "فلسفہ کنیزی زن" میں کہاں سے آپ نے یہ دریافت کیا ہے کہ مرد، بیوی کا مالک ہے؟ اور مرد کا نفقہ دینا اس سبب سے ہے کہ عورت اس کی مملوک ہے۔ یہ کون سی ملکیت ہے کہ مالک اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ "پانی کا گلاس اٹھادو" یہ مالکیت کیسی ہے کہ مملوک جو کام کرے وہ مملوک ہی کا ہے مالک کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ کیسی مالکیت ہے کہ مملوک چھوٹا سا کام بھی مالک کے لیے انجام دے۔ اگر اس کی خواہش ہو۔ تو مزدوری طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ کیسا مالک ہے جو اپنے زیردست سے اپنے بچے کو مفت دودھ نہیں پلوا سکتا، حالانکہ مالک کے گھر میں بچہ اسی نے جنا ہے۔

دوسرے یہ کہ۔ جو بھی کسی کا کھاتا پیتا ہو وہ مملوک ہوا کرتا ہے؟ اسلام ہو یا کوئی بھی قانون ہو، اولاد، باپ یا ماں باپ دونوں کے واجب النفقہ ہیں۔ تو اس دلیل کے مطابق تمام دنیا کے قوانین اولاد کو باپ کی ملکیت مانتے ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر ماں باپ غریب ہوں تو اولاد پر ان کا نان ونفقہ واجب ہے، یعنی اسلام نے باپ اور ماں کو اولاد کا مملوک قرار دیا ہے؟

تیسرے یہ کہ۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات ہے کہ فرماتی ہیں۔ بیوی کا نفقہ عدہ وفات میں کیوں واجب نہیں؟ اس وقت بیوی اپنے میاں کو ہاتھ سے کھو بیٹھی ہے وہ شوہر کے روپے کی زیادہ محتاج رہے۔

جیسے محترمہ، سو سال پہلے کے یورپ میں رہتی ہیں، عورت کی احتیاج، شوہر کے نفقہ دینے کی اساس نہیں ہے۔ اگر اسلام کی نظر میں عورت اپنے شوہر کی شریک حیات ہوتے ہوئے حق مالکیت سے محروم ہوتی تو یہ مطالبہ صحیح تھا کہ وفات شوہر کے بعد اس کا انتظام کیا

جائے کیونکہ اس کی زندگی کی وضع بدل گئی۔ لیکن جو قانون بیوی کو حق ملکیت دے چکا ہے اور بیویاں اپنے اس حق کی بنا پر اپنا پیسہ شوہر کی زندگی میں محفوظ کر سکتی ہیں تو آشیانہ اجڑنے کے بعد کیا ضرورت ہے ایک مدت کے لیے ہی سہی وہ نفقہ لیں۔ نفقہ کا حق مرد کے آشیانے کی زیبائش کے لیے تھا، آشیانے کی ویرانی کے بعد کوئی ضروری نہیں یہ حق جاری رکھا جائے۔

نفقہ کی تین قسمیں

اسلام میں نفقہ تین نوع کا ہے:

۱۔ مملوک کو مالک کی طرف سے دیا جانے والا نفقہ، وہ اخراجات جو حیوانات کے مالک ان جانوروں پر کرتے ہیں اس نفقہ کی بنیاد مالکیت ومملوکیت ہے۔

۲۔ وہ نفقہ جو کم سن اور محتاج اولاد کو دیا جاتا ہے یا وہ اخراجات جو غریب ماں باپ پر ہوتے ہیں۔ اس نفقہ کی بنیاد مالکیت ومملوکیت نہیں ہے۔ اس کی بنیاد وہ فطری حقوق ہیں جو اولاد اپنے وجود میں لانے والوں پر رکھتے ہیں اور والدین کے وہ حقوق ہیں جو تولید میں شرکت اور بچے کی پرورش و تربیت میں تکالیف برداشت کرنے کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس نفقہ کے وجوب کی شرط یہ ہے کہ واجب النفقہ عاجز وغریب ہو۔

۳۔ وہ نفقہ جو شوہر اپنی بیوی کو دیتا ہے۔ اس نفقہ کی بنیاد نہ مالکیت ہے، نہ مملوکیت، نہ وہ فطری حق جو نوع دوم میں بتایا گیا ہے، نہ اس کی بنیاد بیوی کا غریب و عاجز ہونا ہے۔ بیوی، ملینوں کی مالک اور بے حد وحساب آمدنی کی مالک ہو، اور شوہر کی آمدنی کم ہو جب بھی گھر کے اخراجات، جن میں بیوی کا نجی خرچ بھی شامل ہے۔ مرد کے ذمے ہے۔

پہلی اور دوسری نوع وقسم کے نفقے سے اس نفقے کا فرق یہ بھی ہے کہ ان دونوں مقامات میں اگر آدمی اپنی ذمہ داری پوری نہ کرے اور نفقہ نہ دے تو گنہ گار ہوگا مگر وہ قرض نہیں جس کی ادائگی یا مطالبہ کیا جا سکے، یعنی اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے، تیسری قسم کے نفقے میں اگر آدمی غفلت کرے تو بیوی کو قانونی چارہ جوئی کا حق ہے وہ دعوی کر سکتی ہے اور ثبوت کے بعد وہ عدالت کے ذریعے اپنے واجبات وصول کر سکتی ہے۔ اس نفقہ کی بنیاد کیا ہے؟ اس پر آئندہ فصل میں ہم بحث کریں گے۔

کیا آج کی بیوی مہر و نفقہ نہیں چاہتی؟

میں نے کہا ہے: اسلام کی نظر میں گھر بلو بجٹ کی فراہمی جس میں بیوی کے ذاتی اخراجات بھی ہیں، مرد کے ذمے ہے، اس کی ذمہ داری عورت پر نہیں ہے۔ خواہ بیوی بہت بڑی سرمایہ دار اور شوہر سے کئی گنا زیادہ مال رکھتی ہو، اسے اخراجات میں شرکت پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ نہ روپے کے لیے نہ کسی کام کے لیے فقط اور فقط وہ خود اپنے ارادے اور خواہش سے جو کرنا چاہے وہ کرے۔

اسلام کی نظر میں باوجودیکہ زندگی کے اخراجات جن میں عورت کے مصارف بھی داخل ہیں، مرد کے ذمّے ہیں، پھر بھی مرد کو کسی قسم کا اقتصادی تسلّط اور بیوی کی فردی قوت اور کام سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے وہ استثمار نہیں کر سکتا۔ بیوی کا نفقہ اس حیثیت سے نفقۂ والدین سے مشابہت رکھتا ہے کہ وہ بھی خاص حالات میں اولاد کو دینا پڑتا ہے اور اس کے عوض میں وہ ماں یا باپ سے خدمت نہیں لے سکتا۔

مالی معاملات میں عورت کی نگہداشت

اسلام نے بے مثال انداز میں عورت کی مالی حیثیت سے نگہداشت کی ہے۔ ایک طرف اسے اقتصادی آزادی دے کر مرد کی دست رس و بالادستی کو کم کیا ہے، عورت کے معاملات میں مرد کی قیمومیت کو۔ جو پرانی دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور یورپ میں بیسویں صدی تک باقی رہی۔ شوہر سے لے لی۔ دوسری طرف گھریلو اخراجات کی فراہمی کا بوجھ اس کے کاندھے سے اتار کر اسے پیسے کے پیچھے دوڑنے اور ہر قسم کے جبر و پابندی اور دوا دوش سے معاف کر دیا۔

مغرب پرست جب خواتین کی حمایت کا نام لے کر اس قانون پر تنقید کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجبور ہو کر شاخ در شاخ دروغ بے فروغ کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ نفقہ کا فلسفہ ہے مرد کا اپنے تئیں عورت کا مالک سمجھنا اس سے اپنی خدمت لینا۔ جیسے جانور (یا)

کا مالک اپنے مملوکہ جانوروں کا خرچ برداشت کرنے پر مجبور ہے کہ وہ چوپائے اسے اپنی سواری دے سکیں اس کے لیے باربرداری کر سکیں، قانونِ نفقۂ زن بھی اسی لیے ضروری ہے کھاؤ، مرد نہیں۔

جو شخص ان معاملات میں قانون اسلام پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ اسلام نے حد سے زیادہ عورت پر نوازش کی ہے اور مرد پر دباؤ ڈالا ہے، اسے بیگار میں پکڑ کر عورت کی مزدوری کروائی ہے۔ تو یہ کہنے والا اپنی بات کو بڑا آب و رنگ دے کر پیش کر سکتا ہے نہ یہ کہ عورت کا نام اور اس کی حمایت کا ڈھونگ رچا کر اس قانون پر حملہ کرے۔

درحقیقت، اسلام عورت کے مفاد اور مرد کے خلاف یا مرد کے مفاد اور عورت کے خلاف، قانون نہیں بنانا چاہتا۔ اسلام نہ مرد کا حامی ہے نہ عورت کا، اسلام اپنے قوانین میں انسانی معاشرے کی بہبود کو ملحوظ رکھتا ہے، میاں بیوی اور ان کی آغوش میں پرورش پانے والے بچے خوش و خوشحال رہیں۔ اسلام کی نظر میں، میاں بیوی اور اولاد کی فلاح و بہبود کا راستہ یہ ہے کہ فطرت نے جو قوانین اور قاعدے، جو رویے اور طریقے قادر و توانا خالق سے حاصل کیے ہیں ان سے چشم پوشی نہ کی جائے۔

ہم نے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اسلام نے ہمیشہ اس کلیہ کی نگہداشت کی ہے کہ مرد کو خریدار اور عورت کو مالکِ مال و اسباب جانتا ہے۔ اسلام کی نظر میں مشترک زندگی و وصال میں مرد اپنے آپ کو فائدہ اٹھانے والا سمجھ کر اس عمل کا خرچ برداشت کرے۔ زن و مرد یہ نہ بھولیں کہ ان دونوں کی فطرت نے عشق کے دو جداگانہ رویّے انھیں بخشے ہیں، شادی اس وقت پائدار و لذت بخش و مستحکم رہ سکتی ہے جب عورت و مرد اپنے اپنے فطری رویے کے مطابق سامنے آئیں۔

۲۔ مرد پر عورت کے نفقہ کا فرض اس علت و وجہ سے بھی ہے کہ فطرت کی طرف سے تولیدِ نسل کی روح فرسا اور رنج و زحمت کشی کی ذمہ داری عورت کے ذمہ رکھی گئی ہے۔

اور اس سلسلے مرد کا ایک آن کے لیے لذت بخش عمل ہے اور بس، عورت ہے کہ (کم سنی اور بڑھاپے کے علاوہ) ماہواری کی بیماری جھیلے، حمل کے دنوں کا بوجھ اٹھائے، پھر ان دنوں کی مخصوص بیماری سے گذرے، بچہ جننے اور اس کے عوارض و مشکلات سے دوچار ہو۔ بچے کو دودھ دے، اس کی دیکھ بھال کرے۔

ان مرحلوں میں بدنی اور اعصابی قوت صرف ہوتی ہے، کام کاج کے لیے اس کی توانائی میں کمی آتی ہے۔ ان اسباب و وجوہ کے بعد بھی اگر قانون زن و مرد کو اخراجات زندگی میں مشابہ صورت حال میں قرار دے اور عورت کی حمایت نہ کرے تو خواتین کی حالت بڑی مظلومانہ ہو جائے۔ یہی معاملات ہیں جن کی بنا پر جانوروں میں جنسِ نر، جنسِ مادہ کی حفاظت کرتی ہے، اور نر اپنی مادہ کو زمانۂ حمل و تولید میں خوراک و آذوقہ مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

زن و مرد، محنت و قوت، اقتصادی، اور تولیدی جیسے سخت کام میں ایک دوسرے کے مشابہ پیدا نہیں ہوئے ہیں۔ اگر بیگانگی کی بات آ پڑے اور شوہر، بیوی سے کہہ دے کہ میں اپنی آمدنی سے ایک پیسہ بھی تم پر خرچ نہیں کروں گا تو بیوی ہرگز اس قابل نہیں کہ وہ مرد کے ہم پلہ کھڑی ہو سکے۔

ان باتوں سے قطع نظر، عورت کو مرد سے کہیں زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیب و زینت عورت کی زندگی کا حصہ ہے وہی اس کی اصلی ضرورت ہے۔ ایک عورت اپنی عام زندگی میں اپنی زیب و زینت شان و شوکت پر جو خرچ کرتی ہے وہ کئی مردوں کے خرچ کے برابر ہوتا ہے۔ زیبائش و آرائش کے رجحان سے عورت میں خود بخود رنگینی و تنوع پیدا ہوتا ہے۔ ایک مرد کے لیے ایک جوڑا، جب تک پہنا جا سکے، پھٹ نہ جائے قابل استعمال ہے مگر ایک عورت کے لیے؟ عورت کے لیے ایک جوڑا اس وقت تک قابل استعمال ہے جب تک کہ وہ اسے نئے لباس میں ملبوس دکھائے۔ بہت سے زیورات عورت کے لیے ایک دفعہ سے زیادہ پہننے کے قابل نہیں رہتے۔

حصول دولت کے لیے عورت کی محنت و کوشش مرد سے کم، مگر دولت کا استعمال مرد سے کہیں زیادہ ہے۔

پھر یہ کہ، عورت کا عورت رہنا، یعنی حسن و جمال، نشاط و غرورِ زن کی بقا، زیادہ آسائش، زیادہ راحت چاہتی ہے۔ اس کے لیے محنت کم اور اطمینانِ خاطر زیادہ درکار ہے۔ اگر عورت، مرد کی طرح دائمی طور پر تلاشِ معاش اور فکرِ روزی میں، سرگرداں اور پیسے کے پیچھے دوڑنے پر مجبور ہو، تو اس کا غرور ٹوٹ جائے، مرد کی طرح مالی پریشانیوں سے اس کے ماتھے پر بل اور پیشانی پر شکن پڑ جائے اس کی بھویں تنی ہوئی اور چہرہ شکستہ نظر آنے لگے۔ اکثر لوگوں سے سنا ہے، یورپ کی عورت تلاشِ معاش کے لیے کارخانوں اور دفتروں میں مجبوراً جاتی ہے اسے مشرقی زندگی کی تمنا رہتی ہے۔ صاف سی بات ہے جس عورت کو ذہنی سکون نہ ہو گا اسے موقع ہی نہ مل سکے گا کہ وہ مرد کے لیے سرمایۂ مسرت و خوشی مہیا کر سکے۔

لہذا، فقط عورت کا مفاد نہیں، مرد، اور گھر کی مرکزیت کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ عورت تلاشِ معاش کی تھکا دینے والی جبری محنت سے معاف رکھی جائے۔ مرد بھی یہی چاہتا ہے کہ اس کے گھر کا مرکز، آسائش اور تھکاوٹ دور کرتے بلکہ بیرونی پریشانیوں کو بھلا دینے کا مرکز ہو۔ عورت کے امکان میں ہے وہ گھریلو ماحول کو آرام محل اور فراموش خانہ افکار بنا دے۔ کس قدر بدنصیب ہے وہ شوہر جو تھکا، ماندا، گھر میں قدم رکھے اور اپنے سے زیادہ تھکی ہاری بیوی کا سامنا کرے۔

یوں، مرد کے لیے بہت ضروری ہے کہ بیوی صحت و نشاط اور اطمینان خاطر سے رہا کرے۔

اسی نکتے کی خاطر، مرد، تیار رہتے ہیں کہ جان پر کھیل کر روپیہ کمائیں اور دونوں ہاتھ پر دولت رکھ کر بیوی کی نذر کریں کہ وہ کھلے ہاتھ سے اپنے جسم و جاں پر خرچ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد کو اپنی روحانی طلب کا احساس ہے، وہ سمجھ چکا ہے کہ اللہ نے عورت کو

سرمایۂ آرام و آسائش روح بنایا ہے:

وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا۔ [1]

اور اس سے اس کا جوڑا بھی بنایا تاکہ اس کے پاس رہے اور سکون حاصل کرے۔

شوہر سمجھتا ہے کہ اپنی بیوی کو جس قدر اطمینانِ خاطر عطا کرے گا اسی قدر بواسطہ اپنی بھلائی حاصل کرے گا، گھر کے ماحول کو بارونق بنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ جوڑے میں کم از کم ایک تو افکار و آلام سے آزاد رہے کہ دوسرے روح کو سکون اور دل کو خوشی دے سکے۔ تقسیم کار کے وقت بہتر یہی ہے کہ معرکۂ حیات میں مقابلے کے لیے مرد کا باہر نکلنا ہی بہتر ہے اور سکون و راحتِ روح کا سامان کرنے کے لیے دوسرا شریکِ حیات۔ بیوی۔ کو ہونا چاہیے۔

مالی اور مادی معاملات میں عورت کو مرد کا نیاز مند پیدا کیا گیا ہے اور مرد کو روحانی و نفسیاتی پہلو سے عورت کا نیاز مند بنایا گیا ہے، عورت، مرد کا سہارا لیے بغیر، مرد سے کئی گنا ضروریات کو پورا کرنے اور مالی احتیاجات سے فائدہ اٹھانے سے عاجز ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے عورت کے قانونی شریکِ حیات کو۔ فقط اس کے قانونی شریکِ زندگی۔ اس کے لیے مرکزِ اعتماد بنایا ہے۔

عورت اگر اپنی پسند کی شان و زیبائش چاہنے لگے اور اپنے قانونی شوہر پر ہی بھروسہ نہ کرے دوسرے مردوں پر بھی توجہ دینے لگے تو۔ بصد افسوس۔ یہ وہی حالت ہوگی جو آج کل مثالیں بن کر روز افزوں ہوتی جائے گی۔

نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈا

"شکاری مردوں کو راز معلوم ہو گیا ہے۔ نان و نفقہ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک سبب یہ ہے، کہ جب بیوی کی شوہر کے پیسے سے غرض ختم کردی جائے گی تو وہ آسانی سے شکاری کی

---

[1] القرآن الکریم، الاعراف/۱۸۹

گود میں بیٹھ سکے گی۔ کمپنیوں میں خواتین کو زیادہ رقم کی ادائیگی پر غور کیجئے تو میری بات کو بہتر سمجھ سکیں گے۔

کسی بیوی کے لیے کیسے ممکن ہے کہ اپنی زندگی کا رابطہ شوہر سے توڑ لے پھر یہ چاہے کہ وہ اپنے معاملات کو جس طرح چاہے چلائے۔

اگر سچی بات سمجھنا چاہتے ہیں تو ۔۔ نان و نفقہ کی پابندی اڑانے ۔۔ کی مہم میں ان مردوں کی کمک بھی ہے جو خواتین کی زینت و آرائش اور فضول خرچیوں سے عاجز آچکے ہیں۔ یہ لوگ آزادی و مساوات کے نام سے فائدہ اٹھا کر فیشن پرست فضول خرچ بیویوں سے اپنا انتقام لے رہے ہیں

ویل ڈیورینٹ نے اپنی کتاب "پلیژر آف فلاسفی" میں نئی شادی کے بیان میں لکھا ہے:

"قانونی شادی، قانونی طور پر حمل سے دوری، اور طرفین کی رضامندی سے طلاق، اور اولاد و نفقہ نہ ہونے کی ذمہ داری کا نام ہے۔"

"..... فیشن پرست، متوسط طبقے کی خواتین، محنت کش مردوں کے لیے بہت جلد انتقام کا باعث بنیں گی جس کا نشانہ جنس خواتین ہو گی۔ شادی کے معنوں میں ایسی تبدیلی آئے گی کہ ایسی عورتیں نابود ہو جائیں گی جو سرمایۂ زینت اور بڑے مصارف رکھنے والے گھروں کی وحشت کا سبب ہیں۔ مرد، مطالبہ کریں گے کہ بیویاں خود پورے کریں۔ دوستانہ شادی (نئی شادی) کا تقاضہ ہے کہ بیوی حمل کے وقت تک کام کرے۔ یہاں ایک نکتہ ہے جو عورت کی آزادی کو مکمل کر دے گا۔ وہ ہے کہ ۔عورت شروع سے آخر تک اپنے اخراجات خود ہی پورے کیا کرے۔ صنعتی انقلاب اپنے ظالمانہ نتائج ۔ عورت کے بارے میں ۔ دکھا رہا ہے ۔عورت کو اپنے شوہر کے ساتھ کارخانے میں کام کرنا چاہئے ۔ بیوی کا کمرے میں اکیلے بیٹھے رہنا اور مرد کا بیوی تک کے بے کار رہنے کے عوض میں دوگنا کام کرنا کیوں ضروری ہے۔ بیوی کو بھی کام اور صلے، تنخواہ اور محنت کشی میں میاں کے برابر ہونا چاہیے۔"

شوہر کی جگہ دولت

تولید نسل کی فطری ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ مالی و اقتصادی لحاظ سے کسی نقطۂ اعتماد سے وابستہ ہو۔ یہ حقیقت قابل انکار نہیں ہے۔

آج یورپ میں ایسے افراد ہیں جنھوں نے آزادیٔ نسواں کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ "مادر شاہی" کا دور آجائے گا اور باپ، خاندان سے بالکل جدا کر دیا جائیگا۔ عورت کی مکمل اقتصادی آزادی، اور تمام حالات و معاملات میں مرد کی برابری کے بعد، باپ عضوِ زائد بن کر خاندان سے نظر انداز ہو جائے گا۔

عین اسی ماحول میں یہ لوگ باپ کی جگہ دولت کو بٹھاتے ہیں دولت کو باپ کی جانشینی قبول کرنے کی درخواست دیتے ہیں، وہ اس پر تیار نہیں ہوں گے کہ عورت تن تنہا خاندان بنائے اور ساری ذمہ داریاں اسے دیں کہ وہی مالی امداد بھی فراہم کرے اور حمل و تولید نسل سے دور رہ جائے، انہیں معاشرے اور نسل کے ختم ہو جانے کا بھی خیال ہو گا یعنی گھریلو عورت اگر گذشتہ دور میں "نفقہ خور" ــ اور بقول معترض "مرد کی مملوکہ تھی، تو مستقبل میں وہ نفقہ خور اور دولت کی باندی ہو گی اور باپ کا منصب اور اس کے فرائض اسے منتقل ہو چکے ہوں گے۔

کاش! جو لوگ آنکھیں بند کر کے کنبہ کے مقدس ماحول کو جو قوانینِ مقدس آسمانی پر استوار ہے، کدال مار مار کر گرا رہے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں کے نتائج اور اس کے دور رس اثرات کو بھی سوچ لیں۔

برٹرینڈ رسل نے "میرج اینڈ مورل" میں ایک فصل کا عنوان رکھا ہے۔ کنبہ اور حکومت۔ اس میں بچوں کی تعلیم اور صحت کے بارے میں حکومت کی مداخلت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"بظاہر باپ بیالوجیکل وجود کے تمام اسباب ہاتھ سے کھو چکا ہے.....

باپ کو نکالتے ہیں ایک مؤثر عامل اور ہے اور وہ عورتوں کا مادّی طور پر آزاد ہونے کا رجحان ہے۔ جو خواتین آج کل الیکشن میں ووٹ دیتی ہیں۔ عموماً گھر والیاں نہیں ہیں۔ گھر والیوں کے اعتراضات بھی مجرد خواتین سے زیادہ ہیں۔ اور باوجود قانونی امتیازات کے کام میں مقابلے کی وجہ سے پیچھے رہ جاتی ہیں... گھر والیوں کے لیے دو راستے ہیں جن سے وہ اپنی اقتصادی آزادی برقرار رکھ سکتی ہیں۔

۱۔ اپنے کام میں مصروف رہیں (دفتر جائیں) بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کھلائیاں نوکر رکھیں اور بچوں کو ان کے حوالے کر دیں۔ اس کے نتیجے میں پرورشگاہ اطفال اور کنگڈر گارڈن نامی اداروں کی فراوانی ہوگی۔ آخر کار نفسیاتی لحاظ سے بچے کا نہ باپ رہے گا نہ ماں۔

۲۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ جوان بیویوں کو مالی امداد، ماہانہ خرچ دیں کہ وہ خود اپنے بچوں کی دیکھ بھال کریں۔

آخری طریقہ، بجائے خود اس وقت تک مفید نہ ہوگا جب تک ماں کی نئی ذمے داری یعنی بچے کی معین عمر تک پرورش کے بارے میں قانون وضع نہ ہو۔ مگر یہی ایک راستہ ہے جس میں خصوصیت یہ ہے کہ ماں خود اپنے بچے کو پالے گی، بڑا کرے گی۔ اور اس عمل میں کسی طرح بھی مرد کی نظر میں حقیر نہ ہوگی...........

اس قانون کی تکمیل کے بعد کنبے کے اخلاق پر اس کے ردّ عمل کا انتظار کرنا ہوگا ممکن ہے قانون یہ بات کہے کہ غیر قانونی بچہ جننے والی ماں شوہر کی مالی امداد کی حقدار نہ ہوگی یا پھر ماں کی زنا پر موجود دلائل کے بعد خود باپ کو مالی امداد کی تجویز سامنے آئے۔ اس صورت میں مقامی پولیس کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ گھر والی خواتین کی نگرانی کرے۔ اس قانون کے نتائج بہت روشن نہ ہوں گے۔ اور یہ خطرہ بھی ہے کہ جو لوگ اس اخلاقی ارتقا کا مزا چکھ رہے ہیں اور اس کے موجد ہیں

وہ زیادہ خوش نہ ہوں۔ آخرِ کار پولیس کی مداخلت ختم کر دی جائے اور وہ وقت آجائے کہ ناجائز مائیں بھی شوہر سے وظیفہ حاصل کرنے لگیں اس وقت مزدور طبقے کے باپ کی مالی حالت مکمل طور پر ختم ہو جائے گی اور اس کی اہمیت بچوں کے لیے کتنے بلی سے بڑھ کر نہ ہو گی ۔ ۔ ۔ ۔ تمدن یا کم از کم جو تمدن اب تک پھیل چکا ہے وہ مادری احساسات میں روبزوال ہے۔

زیادہ امکان اسی کا ہے کہ اس تمدن کی نگہداشت کے لیے جو بہت زیادہ تبدیلیاں اور ترقیاں حاصل کر چکا ہے ایک وقت آئے گا جب حاملہ عورتوں کو اتنی امداد دینا پڑے گی کہ وہ اس عمل میں کچھ باقاعدہ نفع حاصل کر سکیں پھر یہ ضروری نہیں کہ تمام یا اکثر عورتیں مادرانہ نوکری پسند کریں۔ آخر یہ کام بھی دوسرے کاموں کی طرح سنجیدگی اور مکمل واقفیت کے بعد ہی پسند کیا جاسکے گا لیکن یہ سب باتیں مفروضوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ میرا مدعا تو یہ ہے کہ خواتین کا انقلاب "پدرشاہی" کنبے کا زوال ہے جو قبل از تاریخ مرد کی عورت پر فتح مندی کی علامت تھا۔ مغربی علاقوں میں باپ کی جگہ دولت کی آمد ایک ترقی شمار کی جاتی ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

عورت کا نفقہ ختم کر دینے سے یا بقول اہل یورپ "خواتین کی مادی آزادی" سے مذکورہ بالا بحث کے بعد درج ذیل نتائج نکلیں گے :

- باپ کا کنبے سے خارج کیا جانا، اور کم از کم باپ کی اہمیت کا خاتمہ اور "مادرشاہی" دور ماضی کی بازگشت۔
- باپ کی جگہ دولت کی آمد اور ماں کا باپ کے بجائے حکومت سے مالی امداد حاصل کرنا۔
- مادرانہ جذبات کا زوال۔

- ماں کا جذباتی رخ کے بجائے نوکری اور فن کا رخ اختیار کرنا۔

ان باتوں کا واضح نتیجہ انسانیت کا خاتمہ ہے۔ ہر بات ٹھیک ہو جائے گی، بس ایک بات رہ جائے گی اور وہ ہے سعادت، خوشی اور وہ روحانی لذت جو کنبے کی مرکزیت سے حاصل ہوتی ہے۔

بہرحال میرا مقصد تو یہ ہے کہ۔ عورت کی مکمل آزادی و خود مختاری کے حامی بھی، باپ کو کنبے کی فضا سے نکال کر، عورت کے فطری فریضے، تولید نسل، کو ایک حق اور امداد کا سبب مانتے ہیں اور کبھی تو اسے مزدوری اور کرایے کے طور پر حکومت پر ذمہ داری ڈالتے ہیں کہ وہ اس حق کو ادا کرے۔ برخلاف شوہر کے جس کا فطری فریضہ اس کے جواب میں کوئی حق طلب نہیں کرتا۔

دنیا بھر کے مزدوروں کے لیے جو قانون ہے اس میں مزدوری کی کم سے کم مقدار میں بھی بیوی بچوں کے خرچ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یعنی ـ دنیا بھر کے قوانین میں بیوی بچوں کا نفقہ قانونی طور پر مانا جاتا ہے۔

کیا حقوق انسانی کا منشور عورت کی توہین کرتا ہے؟

حقوق انسانی کے منشور، دفعہ ۲۳، جزء ۲ میں ہے:

"جو بھی کام کرے اسے منصفانہ مزدوری اور قابلِ رضامندی حق دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے کنبے کی زندگی انسانی طریقوں سے محفوظ رہ سکے۔"

دفعہ ۲۹، جزء ۱، میں ہے:

"ہر شخص کا حق ہے کہ اس کی زندگی کا معیار، خود اس کی اور اس کے خاندان کو خوراک، مکان، طبی امداد اور دوسرے معاشرتی ضروریات کی کفالت کی جائے۔"

ان دونوں دفعات میں ضمناً یہ بات مانی گئی ہے کہ جو مرد کنبہ بنائے اسے زن و فرزند کا نفقہ برداشت کرنا ہوگا۔ اور ان کے اخراجات مرد کے ضروری اخراجات میں محسوب ہوں گے۔ منشور حقوق انسانی نے باوجودیکہ توضیح کر دی ہے کہ مرد و زن کے حقوق مساوی ہیں پھر بھی شوہر کا بیوی کو نفقہ دینا مخالفِ مساوات حقوق مرد و زن نہیں قرار دیا ہے۔ بنابریں جو لوگ ہمیشہ منشور حقوق انسانی کی تائید کرتے ہیں اور فخریہ سند پیش کرتے ہیں کہ ملک کے دونوں ایوانوں نے اس کی تائید کی ہے وہ ـ نفقہ ـ کے مسئلے کو حل شدہ اور مسلمہ مسئلہ سمجھ لیں۔ اور کیا مغرب پرست حضرات جو اسلام کے رنگ سے ہر رنگی ہوئی چیز کو رجعت پرستی اور غیر ترقی یافتہ بات کہتے ہیں، وہ اجازت دیں گے کہ "منشور حقوق انسانی" کے آستانہ محترم کی بھی توہین فرمائیں گے اور اسے بھی مرد کی مالکیت اور عورت کی مملوکیت کی دستاویز قرار دیں گے۔

اور آگے بڑھیے۔ منشور حقوق انسانی کی پچیسویں دفعہ ہے:

"ہر شخص کا حق ہے کہ بیکاری، بیماری، اعضا کی کمی، بیوگی، بڑھاپے یا اور دوسرے مقامات کہ جہاں ارادۂ انسانی سے باہر ہونے کی وجہ سے معاشی انتظام ہاتھ نہ آسکے، وہاں آبرومندانہ زندگی سے فائدہ اٹھائے۔"

اس مرحلے میں "منشور حقوق انسانی" نے اس سے قطع نظر کہ شوہر کی موت کو بیوی کے لیے ذریعۂ معاش کا خاتمہ مانا ہے۔ بیوگی کو بیکاری، بیماری اور نقص اعضا کی فہرست میں رکھا ہے یعنی خواتین کو بیکاروں اور بیماروں، بوڑھوں اور افراد ناقص الاعضا کے برابر لکھا ہے۔ کیا یہ خواتین کی بہت بڑی توہین نہیں ہے؟ طے ہے، اگر مشرق کے کسی علاقے میں کسی کتاب یا قانون کے اندر اس قسم کی تعبیر لوگوں کے ہاتھ آجاتی تو اعتراضات و احتجاجات کا ہنگامہ آسمان تک جاتا جس کی مثال ہم اپنے بعض خواتین کے بارے میں دیکھ چکے ہیں۔

ایک حقیقت پسند اور حقائق پر نظر رکھنے والا آدمی جو ہنگامہ آرائی سے نہ ڈرا ہو، وہ تو بات کے تمام پہلو دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ:

نہ قانونِ تخلیق نے مرد کو، عورت کے لیے وسیلۂ معاش بنایا ہے۔ نہ منشور حقوق انسانی نے مرد کو وسیلۂ معیشت مانا ہے اگرچہ اس نے بیوہ کو وسیلہ کھو بیٹھنے والی کہا ہے۔ نہ قانونِ اسلام نے جو بیوی کو مرد کے لیے واجب النفقہ سمجھا ہے۔ کسی نے عورت کی توہین نہیں کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قضیہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ عورت مرد کی نیاز مند پیدا ہوئی ہے اور مرد عورت کے لیے نقطۂ اعتماد ہے۔

زن و مرد کو زیادہ بہتر و مستحکم انداز میں باہم رہتے سہتے اور کہنے کے ماحول کو سعادت و خوشحالی بشر سے استوار کرنے کی خاطر قانون خلقت نے ایک دوسرے کا نیاز مند پیدا کیا اس نے اگر مرد کو مالی اعتبار سے عورت کا مرکز اعتماد بنایا تو عورت کو نفسیاتی سکون کے اعتبار سے مرد کا نقطۂ اعتماد خلق کیا۔ ان دو مختلف نیاز مندیوں کے سبب ایک کو دوسرے سے قریب اور متحد رہنے میں مدد ملتی ہے۔

نواں حصّہ :

مسئلہ میراث

- اسلام نے عورت کی میراث میں عدم توازن کو ختم کیا۔
- بیوی کے وارث ہونے کا پہلو، مہر و نفقہ کی بنیاد پر ہے، اس کی علّت و وجہ نہیں ہے۔
- اگر فقط "اقتصادی پہلو" زیر نظر ہوتا تو، زن و مرد کی میراث میں اسلام فرق کا قائل نہ ہوتا۔
- مرد کی میراث کا دوگنا ہونا اس وجہ سے ہے کہ مرد کے بجٹ پر دوسرے بوجھ بھی پڑتے ہیں۔

(خلاصۂ مطالب از مؤلفؒ)

مسئلہ میراث

قدیم دنیا میں یا تو عورت کو ترکہ بالکل نہیں دیا جاتا تھا یا ترکہ دیتے تو تھے مگر اس سے بچوں جیسا سلوک کرتے تھے۔ یعنی اسے آزادی اور قانونی حیثیت نہ دیتے تھے۔ پرانی دنیا قوانین میں کہیں لڑکی کو میراث دی جاتی تھی مگر اس کی اولاد محروم رہتی تھی، برخلاف لڑکے کے، وہ خود بھی ترکہ لیتا اور اس کی اولاد کو بھی دادا کا ترکہ لینے کا حق تھا۔ دنیا کے کچھ حصوں میں عورت کو مرد کی طرح ترکہ دیتے تھے، مگر کوئی قطعی حصہ معین نہ تھا، بلکہ قرآنی تعبیر کے مطابق نصیب مفروض۔ فرض کردہ حصہ۔ صورت یہ تھی کہ مورث کو حق تھا وہ اپنی لڑکی کے بارے میں اگر چاہے تو وصیت کردے۔

میراثِ خواتین کی تاریخ بہت طولانی ہے، محققین اور باخبر حضرات نے بڑی بڑی بحثیں لکھی اور تحریریں چھوڑی ہیں ان کی لکھی اور کہی ہوئی باتوں کا دھرانا ضروری نہیں سمجھا کہ انھیں نقل کردیا بحث، خلاصہ ذکر کردیا ہے۔

میراث سے عورت کی محرومی کے اسباب

عورتوں کی میراث سے محرومی کا اصل سبب تو یہ تھا کہ دولت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں نہ جانے پائے، قدیم عقائد کے مطابق تولید فرزند میں ماں کا حصہ کم سمجھا جاتا تھا، ماں، ایک ظرف تھی جس میں باپ کا نطفہ رہتا اور پرورش پاتا اور اولاد کی صورت بن جاتا۔ لہذا وہ لڑکے اولاد کہلاتے اور اسی کے خاندان کا جز بنتے۔ لڑکی کی اولاد، لڑکی کے خاندان کے افراد ہونے کے بجائے اس کے شوہر کے خاندان سے متعلق مانے جاتے تھے۔ لہذا، جب لڑکی وارث ہوتی تو اس کی وراثت اس کے بچوں کو ملتی اور

وہ جائداد دوسرے خاندان میں چلی جاتی۔

"ارث در حقوقِ مدنی ایران" تالیف، ڈاکٹر موسیٰ عمید مرحوم کے صفحہ آٹھ پر یہ گفتگو ہے کہ قدیم ادوار میں خاندانوں کی بنیاد مذہب بناتا تھا، فطری روابط کا اثر نہ تھا۔ آگے لکھتے ہیں:

"مذہبی سربراہی کنبوں کے اندر "پدر شاہی" تھی جو بڑے باپ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے بعد مذہب کے رسم و رواج و آداب کی ادائگی اولادِ ذکور میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی، گذشتہ زمانے کے لوگ بقاء نسل کا سبب مرد کو جانتے تھے۔ اور کنبے کا باپ جس طرح اپنے بیٹے کے لیے زندگی بخش ہوتا اسی طرح اپنے رسم و رواج و مذہبی آداب، آگ کی نگہداشت، خاص بھجن بھی اسی کے سپرد ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی وید، اور یونان و روم کے قوانین میں درج ہے کہ۔ قوتِ تولید فقط مردوں کے پاس ہے۔ اس قدیم عقیدے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خاندانوں کے مذہب مردوں سے مخصوص ہو گئے۔ اور خواتین باپ یا شوہر کے بغیر مذہب کے معاملے میں دخل نہیں دے سکتی تھیں ..... چونکہ مذہبی امور انجام دینے سے محروم تھیں لہٰذا خاندانی امتیازات سے بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ اس کے بعد والے مرحلے میں جب "وراثت" ایجاد ہوئی تو عورتیں اس حق سے محروم ہو گئیں۔"

خواتین کی وراثت سے محرومی کے اسباب و علل اس کے علاوہ بھی ہیں، ایک ان میں سپاہی و فوجی بننے کے لیے طاقت کی کمی ہے۔ جس تمدن میں پہلوانی و دلاوری کی بنیاد پر اعزاز و اختیار ملتا تھا، ایک فوجی کو ہزاروں غیر فوجیوں پر برتری دی جاتی تھی، وہاں عورت دفاعی اور فوجی کام نہ کرنے کی بنا پر وراثت سے محروم کی گئی۔

جاہلیت (دورِ قبل از اسلام) کے عرب بھی اسی بنیاد پر میراثِ زن کے خلاف تھے اور جب تک وہ مرد کی طرح ثابت قدمی نہ دکھاتی تھی اس وقت تک ترکہ نہیں دیتے تھے۔ لہٰذا جب آیتِ ارث نازل ہوئی:

للرّجال نصیب ممّا ترك الوالدان والاقربون وللنساء
نصیب مما ترك الوالدان والاقربون ممّا قلّ
او کثر نصیبا مفروضًا۔ (القرآن الکریم / سورۃ النساء / ۷)

ماں باپ اور رشتے داروں کے ترکے میں مردوں کا حصہ ہے، اور والدین
واہل قرابت کے ترکے میں عورتوں کا حصہ ہے۔ خواہ ترکہ کم ہو یا زادہ،
یہ حصہ معین شدہ ہے۔

عربوں کو بڑا تعجب ہوا۔ انھیں دنوں مشہور شاعر حسان بن ثابت کے بھائی
کا انتقال ہوا انھوں نے اپنے پسماندگاں میں بیوی اور کئی لڑکیاں چھوڑیں، اس کے چچا
زاد نے ساری جائداد پر قبضہ کر لیا۔ بیوہ اور بچیوں کو کچھ نہ دیا، بیوہ اپنی شکایت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر حاضر ہوئی، آنحضرتؐ نے سب کو طلب فرمایا۔ ان
لوگوں نے کہا کہ ہم ہیں جو شمشیر بکف ہوتے اور اپنا نیز ان عورتوں کا دفاع کرتے ہیں،
دولت بھی ہمیں ملنا چاہیے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم الٰہی سنایا
اور فرمانِ خدا نافذ کیا۔

منہ بولا لڑکا وارث ہوتا تھا

جاہلیت میں عرب کسی کو بیٹا بنا لیتے تھے اور آخر
میں وہی منہ بولا لڑکا مرنے والے کا حقیقی وارث
قرار پاتا تھا۔ تبنّیٰ کی رسم دوسری قوموں میں بھی تھی، جیسے ایران، قدیم روم ....
اس رسم کے مطابق متبنّیٰ کو وہ امتیازات حاصل ہو جاتے تھے جو حقیقی بیٹوں کو حاصل نہ ہوتے
تھے۔ مثلاً متبنّیٰ کی ایک اہمیت یہ تھی کہ وہ ترکہ حاصل کرتا تھا، یا بیٹا بنانے والا منہ بولے
بیٹے کی بیوی سے شادی نہیں کر سکتا تھا یہ بھی ایک امتیازی بات تھی، قرآن کریم نے اسے
بھی ختم کیا۔

ہم پیمان کا ترکہ (ضامن الجریرہ)

عربوں میں یہ رسم بھی تھی کہ دو اجنبی آدمی آپس میں معاہدہ کرتے تھے:۔

"میرا خون تمہارا خون ہے۔ مجھ سے مکر تم سے مکر ہے
میں تمہاری وراثت لوں گا تم میرے وارث بننا۔"

اس معاہدے کی رو سے یہ دونوں غیر آدمی ایک دوسرا کا دعا غ کرتے، حفاظت جان و مال کرتے اور ان میں جو پہلے ملتا دوسرا اس کا وارث بنتا تھا۔

بیوی، ترکہ کا حصہ تھی

کبھی کبھی عرب، مرتے والے کی بیوہ کو بھی مال و جائداد میں شمار کرتے اور میراث کا ایک حصہ سمجھ کر اس سے وہی معاملہ کرتے تھے۔ اگر مرنے والے کا دوسری بیوی سے کوئی لڑکا ہوتا تھا تو اس لڑکے کو حق تھا، وہ بیوہ کے منہ پر رومال یا چادر ڈال دیتا اور اسے اپنے قبضہ میں لے لیتا، یہ اسے اختیار تھا کہ اس سے شادی کرلے یا کسی دوسرے شخص سے اس کی شادی کرادے اور اس کا مہر خود حاصل کرے۔ یہ رسم بھی عربوں کے علاوہ دوسری قوموں میں موجود تھی۔ اسلام نے اسے بھی منسوخ کیا۔

ہندوستانی، جاپانی، رومی، یونانی اور ایرانی قوموں کے قوانین میں میراث کے مسئلے میں طبقہ بندی بہت تھی، اگر صاحبان علم کے اطلاعات ہم نقل کرنا شروع کریں تو کئی مقالے تیار ہوجائیں گے۔

ساسانی عہد کے ایران میں عورت کا وارث ہونا

سعید نفیسی مرحوم نے "تاریخ اجتماع ایران از زمان ساسانیاں تا انقراض امویاں" میں صفحہ ۲ ہم لکھا ہے:

"خاندان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ نکتہ جو ساسانی تمدن میں دکھائی دیتا ہے وہ یہ ہے کہ جب لڑکا بالغ و دانش مند ہونے لگتا تو باپ اپنی متعدد بیویوں

میں سے ایک کی اس سے شادی کر دیتا تھا۔ ایک اور نکتہ۔ ساسانی تہذیب میں عورت کو قانونی حیثیت حاصل نہ تھی۔ باپ اور شوہر کے اختیارات اس کی ملکیت کے بارے میں بہت وسیع تھے۔

- لڑکی پندرہ برس کی ہوتی اور جوانی آجاتی تو باپ یا خاندان کا سردار اسے بیاہنے کا پابند تھا۔ لیکن لڑکے کی شادی بیس سال میں ضروری سمجھتے تھے۔
- شادی میں باپ کی رضامندی شرط تھی۔
- جو لڑکی بیاہ جاتی وہ باپ یا اپنے سربراہ کی وارث نہیں ہو سکتی تھی۔
- شوہر کے انتخاب میں لڑکی کے کسی حق کو نہیں مانتے تھے۔
- بالغ ہونے کے بعد اگر باپ شادی کرنے میں کوتاہی کرتا تو لڑکی کو ناجائز شادی کا حق تھا مگر وہ باپ کی میراث سے محروم ہو جاتی تھی۔
- ایک مرد لاتعداد بیویاں بنا سکتا تھا، یونانی دستاویزات میں تو یہ بھی ملتا ہے کہ ایک ایک آدمی کی کئی کئی سو بیویاں تھیں۔
- ساسانی دور میں، زردشتی مذہبی کتابوں کے بموجب شادی کے بڑے پیچیدہ اصول تھے، اور پانچ طرح کی شادیاں عام تھیں:

۱۔ جو عورت، ماں باپ کی اجازت سے شوہر کے گھر جاتی اور اس کے یہاں بچے ہوتے تھے تو وہ بچے اس دنیا اور دوسری دنیا میں اسی کی اولاد ہوتے۔ اسے "پادشاہ زن" کہتے تھے۔

۲۔ ماں باپ کی اکلوتی بیٹی — "اوگ زن" — کہلاتی یعنی، یگانہ عورت۔ اس کے یہاں جو پہلا بچہ ہوتا وہ نانا، نانی کو دے دیا جاتا تھا کہ ان کے بیٹے کی جگہ لے، گویا وہ بچہ انہیں کے گھر سے گیا تھا اور میاں بنایا تھا۔ اس کے بعد یہ عورت بھی "پادشاہ زن" کہی جاتی تھی۔

۳۔ اگر آدمی بالغ ہونے کے بعد بن بیاہا مر جاتا تو اس کا خاندان اجنبی عورت کو جہیز دیتا اور غیر آدمی کے ساتھ بیاہ دیتا۔ اس عورت کو "سزر زن" — منہ بولی بیوی۔

کہتے تھے۔ اس کی اولاد آدھی اس مردہ آدمی کی قرار پاتی اور اس دنیا میں اس کی اولاد کہی جانے کا یقین تھا، اور آدھی اولاد زندہ شوہر کی ہوتی۔

۴۔ بیوہ اگر دوسرا شوہر کرلیتی تو اسے "چغر زن" نام دیتے۔ یعنی چاکر زن، نوکر بیوی۔ لیکن اگر پہلے شوہر سے اولاد رکھتی ہو تو۔ سذر زن۔ جانتے تھے۔

۵۔ ماں باپ کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر جانے والی عورتیں بہت پست سمجھی جاتی تھیں اور اس قسم کی بیوی کو "خودسرای زن"۔ خودسر۔ بیوی کہتے تھے۔ لے ماں باپ کی میراث نہیں ملتی تھی اور اسے "اوگ زن" کے طور پر نکاح میں لاتے تھے۔

اسلام کی نظر میں عورت کا حصۂ میراث

میراث کے سلسلے میں قوانین اسلام کے اندر گذشتہ دور میں کوئی ناہمواری موجود نہیں ہے۔ جو چیز قانون اسلام میں معترضین کے قابل اعتراض ہے وہ مرد کے مقابلے میں عورت کا "نصف سہم" ہے۔ یہاں مرد و زن کی مساوات کا دم بھرنے والے بولتے ہیں۔

لڑکا ــ دو لڑکیوں کے برابر حصہ دار ہے۔

بھائی ــ دو بہنوں کے برابر حصہ پائے گا۔

شوہر۔ کا حصہ دو بیویوں کے برابر ہوگا۔

فقط ماں باپ کا حصہ الگ ہے، یعنی اگر مرنے والا / والی اولاد چھوڑ کر جائے اور اس کے ماں باپ بھی زندہ ہوں تو والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ میت کے مال سے ملے گا اس کا سبب و علت کہ اسلام نے سہم وراثت عورت" کو، مرد کے سہم میراث سے آدھا رکھا، خاص حالات سامنے رکھنا ہوں گے۔ جیسے، عورت، مہر، نفقہ، فوجی خدمت اور قانون سزا میں جداگانہ قوانین رکھتی ہے۔ یعنی عورت کی میراث لینے میں خصوصی حیثیت (معلول) مہر و نفقہ وغیرہ کی بنیاد (علت) پر مبنی ہے۔

اسلام ــ گذشتہ مقالات میں دلائل دیے جا چکے کہ مہر و نفقہ کو رشتہ ازدواج کے

استحکام میں موثر اور کنبے کی آسائش میں ضروری عنصر اور زن و شوہر میں اتحاد کے ذرائع سمجھتا ہے ۔ اسلام کی نظر میں مہر اور نفقہ علی الخصوص نفقہ کو ختم کر دینا ، کنبے کی نیو ہلا دینے اور بیوی کو فحشا و منکرات کی طرف کھینچنے کا سبب ہے ۔ اس طرح عورت کی زندگی کا بجٹ کم ہو جاتا ہے اور مرد پر ایک بوجھ آپڑتا ہے ۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس بوجھ کا تدارک میراث سے کر دے ۔ لہٰذا ، شوہر کو بیوی کا دوگنا حصہ دیا ۔ یعنی مہر و نفقہ نے عورت کے "سہم ارث" کو کم کر دیا ۔

مغرب پرستوں کا اعتراض

کچھ مغرب پرست جب اس موضوع پر دادِ سخن دیتے ہیں اور میراث میں عورت کے حصے کو بنیاد بنا کر اسلام کے خلاف غوغا برپا کرتے ہیں ۔ مہر و نفقہ کو سامنے رکھ کر فرماتے ہیں ۔ کیا ضروری ہے کہ میراث میں عورت کا حصہ کم رکھ کر ، مہر و نفقہ سے اس کا تدارک کریں ؟ کیوں سیدھے کام کریں ۔ کیوں گردن کے پیچھے سے ہاتھ لا کر لقمہ کھائیں ہمیں پہلے عورت کا حصۂ میراث مرد کے برابر کرنا چاہیے تاکہ مہر نفقہ سے اس کا تدارک نہ ڈھونڈھنا پڑے ۔

اول تو ان ماں سے زیادہ محبت کرنے والی کھلائیوں نے علت کو معلول سمجھ رکھا ہے ۔ ان کے خیال میں مہر و نفقہ ، میراثِ خواتین کے لیے معلول ہے ، ان کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ میراث میں عورت کی حالت و حیثیت خاص معلول مہر و نفقہ ہے ۔

دوسرے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہاں جو کچھ ہے وہ مالی و اقتصادی پہلو ہے اور بس ظاہر ہے کہ اگر فقط مالی اور اقتصادی پہلو ہی زیرِ نظر ہوتا تو کوئی دلیل نہیں تھی کہ مہر و نفقہ زیر نظر رہتا یا پھر عورت کا حصہ مرد سے مختلف ہوتا ۔ جیسا کہ ہم گذشتہ مقالے میں لکھ چکے ہیں ۔ اسلام نے بہت سے پہلو سامنے رکھے ہیں ۔ طبیعی و فطری اور نفسیاتی زاویے ۔ ایک طرف ضروریات اور تولید کے پہلو سے اس کی بے اندازہ مشکلات و تکالیف ، جبکہ مرد اس مشکل سے آزاد ہے ۔ دوسری طرف ، تولید اور دولت کمانے میں مرد کی نسبت عورت میں قوت کم ہے ۔ تیسری طرف ، وہ مرد سے زیادہ سرمایہ استعمال کرتی ہے ۔

نیز، نفسیاتی اور روحانی کیفیات یعنی مرد و زن کے احساسات جدا جدا ہیں۔ مثلاً مرد ہمیشہ عورت پر روپیہ صرف کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اور سب سے آخر میں۔ معاشرتی و نفسیاتی دقیق مطالعات جو خاندانی بندھن کو مضبوط بناتے ہیں۔ اسلام نے سب باتوں کو ملحوظ رکھ کر مہر و نفقہ کو لازم قرار دیا۔ یہ ضروری ولازمی امور مرد کے اخراجات میں خاص ذمہ داریوں کے بوسائط اسباب ہیں۔ اس کے بعد اسلام نے حکم دیا کہ ذمہ داریوں کی تلافی کے لیے مرد کے حصے کو عورت کے حصے سے دگنا رکھا جائے۔ تو فقط مالی پہلو ہی نہیں ہے کہ سوال اٹھایا جائے کہ ایک جگہ عورت کا حصہ کم کر کے دوسری جگہ اس کا مداوا کرنے کی ضرورت کیا ہے۔

میراث کے مسئلہ پر زندیقوں کا اعتراض

ہم نے کہا ہے۔ اسلام کی نظر میں مہر و نفقہ علت (سبب) اور عورت کی میراث میں صورتِ حال معلول (مُسَبَّب اور نتیجہ) ہے۔ یہ بات دورِ اوّل میں بھی موضوعِ بحث رہی ہے، کوئی نئی بحث نہیں ہے جو آج سامنے آئی ہو۔

دوسری صدی ہجری میں ایک شخص ابن ابی العوجا گذرا ہے، یہ نہ خدا کو مانتا تھا نہ مذہب کا معتقد، اس دور کی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنے ملحدانہ عقائد کا پروپیگنڈا کرتا تھا، ہر جگہ پہنچا حتی کہ مسجد الحرام اور مسجد النبیؐ میں بھی علما سے بحث کرنے جاتا اور توحید و معاد اور دوسرے اصول اسلام پر جرح قدح کرتا تھا۔ اسلام پر اعتراضات میں اس کا ایک اعتراض یہ تھا:

مابال المرأة المسکینة الضعیفة تأخذ سهماً ویأخذ الرّجل سهمین۔

غریب و کمزور عورت تو ایک "سہم" (حصہ) لیتی ہے اور مرد جو اس سے زیادہ مضبوط ہے وہ دوہرا حصہ کیوں لیتا ہے۔؟

یہ بات اسلامی عدل کے خلاف ہے!

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

وجہ یہ ہے کہ اسلام نے جنگجو سپاہی کی ڈیوٹی عورت سے اٹھالی ہے اور بعض نادانستہ جرم، جن میں دیت دینا پڑتی ہے عورت کی سزا، دوسرے کی شرکت کے ساتھ معاف کر دی ہے۔ لہذا ترکے میں عورت کا حصہ مرد سے کم رکھا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے واضح بیان کے بعد معلوم ہو گیا کہ میراث میں عورت کی خاص نوعیت معلول (نتیجہ) ہے مہر و نفقہ کا شوہر پر واجب ہونے اور فوج میں بھرتی ہونے اور دیت دینے سے معافی کا۔

اس قسم کے سوال تمام ائمہ علیہم السلام سے کیے گئے اور ان حضرات نے اسی انداز میں جواب دیے ہیں۔

دسواں حصّہ :

طلاق

- ــــ طلاق میں روز افزوں اضافہ - بیسویں صدی کی بیماری۔
- ــــ آج کی دنیا ایک طرف سماجی طور طلاق کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔ دوسری طرف قانون کے زور سے اسے روکنا چاہتی ہے۔
- ــــ طلاق کے بارے میں پانچ مفروضے۔
- ــــ شادی کا تقدس کا تقاضہ کیا یہی ہے کہ طلاق کی راہ بند کر دی جائے؟
- ــــ سماجی مشکلات فقط قانون سے حل نہیں ہو سکتے۔
- ــــ طلاق، اسلام کی نظر میں سب سے زیادہ نفرت کی چیز ہے۔
- ــــ کیا یہ صحیح ہے کہ امام حسنؑ طلاق بہت دیا کرتے تھے؟
- ــــ جہاں اساسی بنیاد جذبہ ہو وہاں قانون کا جبر کچھ نہیں کر سکتا۔
- ــــ شوہر کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا ہو جائے تو کنبے کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور بیوی کی محبت کا شعلہ ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے نیم جان کر دیتا ہے۔
- ــــ اسلام، عورت کو زبردستی مرد کے سر تھوپنے کا حامی نہیں ہے۔
- ــــ یورپ نے فساد تباہی وانحراف کو بڑھاوا دینے کی خاطر، میاں

بیوی کو برابر کا حصہ دیا ہے۔

- — مرد کوہسار ہے، بیوی جوئبار، بچے پھول اور کلیاں۔
- — میاں بیوی میں صلح و صفائی "مسلح صلح" جیسی نہیں ہو سکتی۔
- — اسلام نے طلاق کے لیے کچھ رکاوٹیں رکھی ہیں۔
- — قرآن کی نظر میں کنبے کی عدالت۔
- — جس قانون نے شادی کو "باہمی رفاقت" کا روپ دیا وہی طلاق کی حقیقت "رہائی" بھی بنا سکتا ہے۔
- — طلاق کا حق اور ہے فسخ کا حق اور ہے۔
- — طلاق، فطری حق کے طور پر مرد ہی سے مخصوص ہے، لیکن معاہدے کے طور پر عورت بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔
- — عدالتی طلاق۔
- — طلاق غیر طبیعی عمل تولید کی طرح آپریشن اور عمل جراحی ہے۔
- — اسلام کے پاس کوئی ایسا قانون نہیں جسے سرطان کہا جائے۔
- — حق ملکیت کی راہیں بند کرنے کے سلسلے میں اسلام کی تدبیریں اور نمونے
- — اسلامی اصول "نگہداشت یا بجسن خوبی رہائی"

(خلاصہ مطالب از مؤلف رح)

حقِ طلاق

(۱)

خاندانی شیرازہ بکھرنے کا خطرہ، اور اس سے پیدا ہونے والے حالات کبھی اس قدر نظر انداز نہیں کیے گئے جیسے اس دور میں کیے جا رہے ہیں، اور تاریخ کے کسی عہد میں آج سے زیادہ انسان عملی طور پر، اس طرح خطرے سے دوچار نہیں ہوا۔

قانون بنانے والے، قانون جاننے والے، ماہرین نفسیات، ہر ایک یہی کوشش کر رہا ہے کہ ممکن وسائل سے شادی کی بنیاد استوار و مستحکم تر بنائیں کہ رخنہ نہ پڑنے پائے لیکن (بقول مولانا روم) ؎

از قضا سرکنگبین صفرا فزود — اتفاق سے سرکے نے صفرا بڑھا دیا
(حالانکہ وہ صفرے کا علاج ہے)

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ طلاق میں سالانہ اضافہ ہو رہا ہے اور اکثر خاندانوں پر تباہی کے سایے منڈلا رہے ہیں۔

عام طور سے جب کوئی بیماری خصوصی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے تو ذہنی اور مالی وسائل کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس سے مرنے والوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے اور کبھی کبھی وہ بیماری ختم بھی ہو جاتی ہے۔ مگر طلاق کی بیماری اس کے برعکس روز افزوں ہے۔

نئی زندگی اور طلاق میں اضافہ

پرانے زمانے میں، طلاق اور اس کے برے نتائج، اسباب و عللِ طلاق، اور اس سے بچنے

کے بارے میں بہت کم توجہ کی گئی ۔ اس کے باوجود طلاق کی اوسط کم تھی ، اور زندگی کے آشیانے کم اجڑتے تھے ۔ طے شدہ بات ہے کہ آج طلاق کے علل و اسباب بڑھتے جا رہے ہیں سماجی زندگی نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ گھریلو زندگی کے رشتے ٹوٹنے کے اسباب زیادہ پیدا ہو گئے ہیں ، اور خیر خواہوں اور دانش وروں کی سعی ابھی تک کسی منزل پر نہیں پہنچ سکی اور افسوسناک بات یہ ہے کہ آئندہ خطرہ زیادہ ہے ۔

شمارہ ایک سو پانچ ، "زنِ روز" میں نیوز ویک سے ایک مقابلہ کا ترجمہ چھپا تھا۔ عنوان ہے ۔"طلاق در امریکا" رسالہ لکھتا ہے :

"ٹیکسی حاصل کرنے میں جو آسانی ہوتی ہے وہی آسانی طلاق حاصل کرنے میں ہے ۔"

اسی مضمون میں ہے : طلاق کے بارے میں امریکیوں کے یہاں دو کہاوتیں سب سے زیادہ مشہور ہیں :

۱۔ مشکل ترین سمجھوتہ بھی جو میاں بیوی میں ہو سکے وہ طلاق سے بہتر ہے ۔

یہ جملہ ۔ تقریباً چار صدی قبل ، سر دانٹس نے کہا تھا ۔

۲۔ دوسرا عشق زیادہ دل پذیر ہوتا ہے ۔

بیسویں صدی کے نصفِ دوم میں "سامی کاہن" نے یہ جملہ کہا ہے بلکہ پہلے محاورے کے خلاف ایک نعرہ لگایا ہے ۔

نامبردہ مقالے سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری کہاوت نے امریکہ میں اثر کیا ہے ۔ مقالہ نگار کہتا ہے :

"طلاق کی سرایت نہ فقط "تازہ بیاہے"

بلکہ ان کی ماؤں اور شوہروں (پرانے بیاہے لوگوں) کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا ہے ۔ جنگ عظیم دوم کے بعد سے امریکہ میں طلاق کی تعداد اوسطاً ۴۰۰،۰۰۰ طلاق سالانہ سے کم نہیں ، چالیس فی صد طلاق دس سالہ شادی یا اس سے زیادہ میں ، اور بیس سالہ شادی میں تیرہ فی صدی کی اوسط طلاق عام ہے ۔ دو ملین (بیس لاکھ) طلاق یافتہ عورتوں کا سن

پنتالیس سال ہے۔ باسٹھ فی صد طلاق یافتہ عورتوں کے بچوں کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہوتی ہے، یہ عورتیں ایک نئی نسل کو جنم دے رہی ہیں۔"

آگے تحریر ہے:

"باوجودیکہ، طلاق کے بعد امریکی عورت اپنے تئیں آزاد سے زیادہ آزاد سمجھتی ہے، مگر مطلقہ عورتیں شادکام نہیں رہتیں چاہے جوان ہوں یا درمیانہ عمر کی عورتیں ہوں۔ اور اس بے چینی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ذہنی نفسیاتی معالجین کے پاس جاتی ہیں یا ہر وقت نشے میں دھت رہنے لگتی ہیں، یا ان میں روز افزوں خودکشی کا رجحان نظر آرہا ہے۔

چار مطلقہ عورتوں میں ایک "بیبی" اور تین خودکشی کر لیتی ہیں۔ عورتوں میں خودکشی کی تعداد باشوہر عورتوں سے تین گنا زائد ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امریکی عورت جب طلاق لے کر عدالت سے پلٹتی ہے۔ پھر سمجھتی کہ طلاق کے بعد زندگی جیسی سوچی ہے ویسی جنت تو نہ ہوگی ۔۔۔۔ قوانینِ فطرت کے بعد دنیا میں شادی مضبوط ترین انسانی رشتہ ہے۔ جس دنیا کا یہ عقیدہ ہو، وہاں اس عورت کے بارے میں کہا رائے دی جائے گی جس نے یہ رشتہ توڑا ہو؟ ممکن ہے معاشرے میں ایسی عورت قابلِ احترام ہو، پوجی بھی جائے، لوگ رشک بھی کریں لیکن اس آدمی کو تو ایک نظر نہ بھائے گی جب وہ اس عورت کو دوسرے شخص کی زندگی میں خوشی کی لہر دوڑاتے دیکھے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

یہ مقالہ ضمنی طور پر طلاق کے اسباب پر روشنی ڈالتا اور فراوانیِ طلاق کے بارے میں سوالات اٹھاتا ہے۔ فراوانیِ طلاق کا سبب، میاں بیوی میں اخلاقی اختلاف ہے یا کوئی اور بات؟

جواب دیتا ہے:

اگر اخلاقی ناسازگاری کو جدائی کا سبب مان لیں تو نوجوان جوڑے کے لیے تو ایک

بات ہو سکتی ہے مگر پرانے رشتوں کے بارے میں کیا وجہ بتائی جائے گی ؟ امریکی قوانین نے طلاق لینے والی عورتوں کو جو رعایت دی ہے اور اس کے پیش نظر جواب یہ ہے کہ :

دس یا بیس برس کی شادی کے بعد طلاق کا سبب ناچاقی یا طبیعتوں کا اختلاف نہیں، بلکہ برسوں کی پریشانیوں کو برداشت نہ کرنے کا رجحان اور نئی لذتوں کی ہوس اور دوسری کامرانیوں کی آرزو ہے۔ مانع حمل گولیوں اور جنسی انقلاب نیز عورتوں کی بڑھتی قدر و منزلت نے خواتین میں یہ رجحان عام کر دیا ہے کہ خاندانی بندھنوں سے آزادی میں لذت اور خوشی زیادہ ہے، ایک بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہے۔ زندگی ایک ساتھ گذارتی ہے، بچے پیدا ہوتے ہیں، خوشی، غمی میں ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں، اچانک بیوی کو طلاق کی فکر پیدا ہو گئی، شوہر میں ظاہری اور اقتصادی تبدیلی بھی نہیں مگر بیوی الگ ہونا چاہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ کل تک تھکا دینے والی زندگی برداشت کر رہی تھی مگر اب وہ ایک طرز کی زندگی نہیں چاہتی ...... آج کی امریکی عورت کل کی عورت سے زیادہ موقع پرست ہے اور اپنی دادی کے مقابلے میں برداشت نہ رکھنے والی عورت ہے۔"

ایران میں طلاق

طلاق میں فراوانی امریکہ ہی میں نہیں، یہ اس صدی کی وبا ہے۔ جہاں بھی یورپ کے رسم و رواج عام ہوں گے وہاں طلاق کے شماریات میں اضافہ ہو گا۔ مثلاً ہم اپنے ایران ہی کو دیکھیں، شہروں میں طلاقوں کی تعداد دیہاتوں سے زیادہ ہے اور تہران جہاں مغرب کے آداب و انداز، زیادہ اثر کر چکے ہیں، دوسرے شہروں سے آگے ہے۔

روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۱۵۱۲ میں ایران کے نکاح و طلاق کے شماریات چھپے تھے، جس میں تھا :

"رجسٹرڈ طلاقوں میں جو تھے سے زیادہ حصہ صرف تہران کا ہے۔ یعنی ستائیس فی صد طلاق تہران میں واقع ہوئے ہیں۔ حالانکہ ملک کی آبادی کے لحاظ سے

تہران کی آبادی، دس فیصد کا تناسب رکھتی ہے مجموعی طور پر تہران میں سو نکاح اور سو طلاق ہوتے ہیں۔ تہران میں شادیوں کی تعداد پورے ملک کی نسبت سے پندرہ فی صد ہے۔"

امریکہ میں طلاق کی افزائش کی ہوا:

اچھا اسے چھوڑیے، امریکہ میں طلاق کی بات آگئی تو سنیئے:

"نیوز ویک" سے نقل کیا گیا ہے کہ امریکی عورت موقع پرستی اور لذت کو کنبے کی مرکزیت و نگہداشت و استحکام پر ترجیح دیتی ہے۔ ایک قدم آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ امریکی عورت ایسی کیوں بن گئی؟ طے ہے کہ یہ امریکی عورت کی سرشت نہیں ہے۔ اس رویئے کی علت و وجہ معاشرہ ہے۔ امریکی معاشرے نے امریکی عورت کو احساس و رویہ دیا ہے۔ ہمارے مغرب پرست چاہتے ہیں کہ ایرانی خواتین کو بھی اسی راہ پر ڈال دیں جس پر امریکی عورتیں چل رہی ہیں۔ اگر ان لوگوں کی یہ آرزو پوری ہو گئی تو مسلّم ہے کہ ایرانی عورت اور خاندانی مرکزیت کا مقدر وہی بن جائے گا جو امریکی عورت اور امریکی خاندان کی قسمت ہے۔

ہفت روزہ "بامشاد" شمارہ ۶ (۴/۵/۴۴) ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا:

"دیکھیے بات کہاں تک پہنچی، کہ فرانسیسی قوم کی آواز بھی اٹھی کہ امریکیوں نے نئی شورش برپا کی ہے۔" روزنامہ فرانس سوار کا مقالہ ہے کہ دو سو سے زیادہ ریسٹورنٹ اور کیبرے، کالیفورنیا میں ایسے کھلے ہیں جہاں پیش خدمت لڑکیاں کھلے سینوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔

اسی مضمون میں تحریر ہے کہ "مونوکینی" مایوٹی جو عورتوں کے سینہ بند کھلواتے ہیں یہ صاحب سان فرانسسکو اور لاس انجلیس میں لباس کے ماہر مانے گئے ہیں۔

نیویارک میں متعدد ایسے سینماؤں کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں کی فلمیں فقط جنسی عمل اور جنسی مسائل اور عریاں تصویریں دکھاتی ہیں۔ ان فلموں کے چند نام یہ ہیں:

"وہ شوہر جو اپنی بیویوں کا باہمی تبادلہ کرتے ہیں۔"

"وہ لڑکیاں جو اخلاق کے خلاف ہیں۔"

"جو کچھ نہیں پہنتیں"

ویٹرین کی لائبریری میں شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس کی پشت پر برہنہ عورت کی تصویر نہ ہو، کلاسیکی اور ادب عالی کی تصانیف بھی اس سے خالی نہیں۔ اس قسم کی کتابیں بکثرت موجود ہیں:

"امریکی شوہروں کی جنسی حالت"

"مغربی مردوں کی جنسی حالت"

"بیس سال سے کم عمر جوانوں کی جنسی حالت"

"نئی اطلاع کی روشنی میں نئے جنسی رویے"

فرانس سوار کا مضمون نگار تعجب و پریشانی کے عالم میں خود اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔ امریکہ کہاں جانا چاہتا ہے؟

بامشاد لکھتا ہے:

"ٹھیک ہے جہاں تک جانا چاہتا ہے جائے۔۔۔ ہمارا دل تو ان مٹھی بھر ہم وطنوں کے بارے میں جلتا ہے جن کے خیال میں انھوں نے ایک مناسب ماڈل اختیار کر لیا ہے اور اس سلسلے میں انھیں اپنے سراپا کا ہوش نہیں رہا ہے۔"

معلوم یہ ہوا کہ اگر امریکی عورت دیوانی ہو گئی اور کام نکالنے اور ہرجائی بننے کو ایک کی ہو رہنے اور وفاداری پر ترجیح دیتی ہے، تو قصور اس کا نہیں، اس کے معاشرے نے خاندان کے مقدس مرکز پر کدال مار کر اسے نقصان پہنچایا ہے۔

"تعجب تو اس صدی کے بدنصیبوں پر ہے، روز بروز طلاق، اور خاندانی شیرازہ منتشر

کرنے کے معاشرتی وسائل میں اضافہ کر رہے ہیں، ایک دوسرے سے دوڑ میں آگے جا رہے ہیں. اس کے بعد غل ہے کہ طلاق کی تعداد کیوں بڑھ رہی ہے؟ یہ لوگ اسباب و عوامل طلاق کو روز افزوں کرتے جا رہے ہیں اور یہ شور بھی مچا رہے ہیں کہ قانون کی جبر بند کر کے اسے روکا جائے۔ اسی کو کہتے ہیں "کچھ دار دم ریز"

مفروضے:

ہم اصل مقصد پر بحث شروع کرتے ہیں۔ پہلے عقلی طور پر دیکھیں کہ طلاق اچھی چیز ہے یا نہیں؟ کیا طلاق کی راہ مکمل طور پر کھلی رہنا چاہئے؟ کیا خاندانوں کے شیرازوں کا لگاتار بکھرتے رہنا اچھا ہے؟ اگر طلاق اچھی چیز ہے تو پھر جو اسباب و علل طلاق میں اضافہ کا باعث ہیں انھیں باقی رہنا چاہئے ان میں کیا برائی ہے۔ یا طلاق کا سلسلہ بالکل بند کرنا چاہئے اور شادی کا رشتہ ابدی بنا دیا جائے اور جو چیز بھی اس مقدس بندھن کو ڈھیلا کرے اسے روکنا ضروری ہے۔ یا پھر کوئی تیسرا اصل تلاش کیا جائے۔ قانون کو کلیتاً میاں بیوی کے لیے یہ راستہ بند نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ کبھی کبھی طلاق لازم وضروری ہو جاتی ہے۔ مگر قانون کی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود معاشرہ کو ایسی تدبیریں کرنا ہوں گی جن کی وجہ سے میاں بیویوں میں جدائی نہ ہونے پائے۔ معاشرے کو ان اسباب و علل کا سخت مقابلہ کرنا چاہئے جن کے نتیجے میں میاں بیوی میں علحدگی اور بچوں کی بے گھری عمل میں آتی ہے۔ یہ توصاف سی بات ہے کہ اگر سماج ایسے اسباب پیدا کرتا رہے جن سے طلاق وجود میں آئے تو قانون کوئی کام اور کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

اگر یہ فیصلہ ہو جائے کہ قانونِ طلاق پر پابندی نہ لگائی جائے تو کیا صورت ہو کہ آزادی برقرار رہے۔؟ یعنی کیا یہ آزادی فقط مرد کو حاصل رہے۔ یا تنہا عورت کو یا دونوں کو حق طلاق حاصل ہو؟ پھر اگر دونوں کو حق حاصل ہو تو کیا جو تدبیر اور جو اندازِ طلاق

دونوں اختیار کر سکیں وہ ایک جیسا ہو؟ نکاح کے بندھن سے رہائی کا طریقہ ایک ہی قسم کا ہو؟ یا اچھی بات تو یہ ہے کہ میاں بیوی، دونوں کی جدائی کے لیے الگ الگ دو دروازے رکھے جائیں؟

طلاق کے لیے پانچ مفروضے بنائے جا سکتے ہیں:

۱۔ طلاق معمولی چیز ہے، طلاق کی تمام قانونی اور اخلاقی رکاوٹوں کا خاتمہ کیا جائے۔

جو لوگ کام چلانے اور مزے چکھنے کے لیے شادی کے قائل ہیں، معاشرے میں کنبہ کا احترام و تقدس نہیں مانتے، اس کے مقابلے میں ان کی سوچ یہ رہتی ہے کہ شادی کا رشتہ جتنی جلدی ہو سکے ٹوٹے اور نیا رشتہ جڑے۔ نئے میاں بیوی بنیں اور نئے مزے لوٹیں۔ وہ تو اسی مفروضہ کو پسند کریں گے۔ جو کہتے ہیں — "دوسرا ہمیشہ زیادہ مزیدار ہوتا ہے۔" وہ اسی مفروضے کی حمایت کریں گے۔ اس مفروضے میں خاندان کی بنیادی اہمیت بھی نظر انداز کی گئی ہے اور کسی ایک رشتے کے دوام سے پیدا ہونے والی مسرت وخلوص، محبت و خوش نصیبی کو بھی فراموش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ کمزور اور جلد ختم ہو جانے والا مفروضہ ہے۔

۲۔ دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ نکاح ایک مقدس عہد ہے۔ نکاح نام ہے دل و جان کی وحدت کا وہ دائمی عہد و پیمان کی حیثیت کا حامل ہے۔ اسے محفوظ و باقی رہنا چاہئے، لفظِ طلاق انسانی معاشرے کی کتاب لغت سے نکال دینا چاہئے۔ میاں بیوی شادی کرتے وقت سمجھ لیں اب موت کے علاوہ کوئی چیز دونوں میں جدائی نہیں ڈال سکتی۔

کیتھولک چرچ صدیوں سے اسی کا حامی ہے اور کسی قیمت پر اس مفروضے یا عقیدے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں۔ اس نظریے کے پرستار پوری دنیا میں روبہ زوال ہیں اور آج کل صرف اطالیا اور کیتھولک اسپانیا میں یہ قانون نافذ ہے

مگر اطالیہ والے اس قانون کے خلاف آواز اٹھاتے اور تحریکیں چلاتے رہتے ہیں کہ یہ قانون ختم ہو اور طلاق کو قانونی حیثیت مل جائے۔ اب وہ اس تکلیف دہ صورت حال کو مزید برداشت کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

تیسرے پہر کی اشاعت ڈیلی اکسپریس میں ایک مضمون چھپا تھا:

"ازدواج در ایتالیا یعنی بندگی زن"

یہ (فارسی ترجمہ) میں نے پڑھا تھا، مضمون میں درج تھا۔ موجودہ صورت حال میں طلاق نہ ہونے کی وجہ سے اطالیہ میں عملی طور پر بہت سے لوگ خلاف قانون جنسی عمل کرتے ہیں۔ اس مقالے کی تحریر کی بنیاد پر ــــ "موجودہ صورت یہ ہے کہ پانچ ملین اطالوی سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی سوائے گناہ اور ناجائز تعلقات کے اور کچھ نہیں۔"

اسی روزنامے (ڈیلی اکسپریس) تیسرے پہر کے ایڈیشن میں اخبار بگارو سے نقل کیا ہے کہ اطالیہ کے عوام میں ممنوعیت طلاق سے بڑی مشکلیں پیدا ہو گئی ہیں، بہت سے لوگ اس قانون سے تنگ آ کر وطن چھوڑ چکے ہیں آخری دنوں میں ملک کی خواتین سے پوچھا گیا تھا۔ "کیا طلاق کے قانون کا اجرا خلاف اصول مذہب ہے؟ ستانوے فی صد عورتوں نے جواب نفی میں دیا تھا۔"

چرچ اپنے عقیدے پر سختی سے قائم ہے۔ اور نکاح کے تقدس اور اس کی مضبوطی پر زور دیتا اور دلیلیں پیش کرتا ہے۔ شادی کا تقدس اور رشتے کا استحکام بجائے خود اچھی بات اور قابل قبول چیز ہے۔ بشرطیکہ میاں بیوی میں یہ بندھن عملی طور پر باقی رہ سکے حقیقتاً، کچھ ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جہاں میاں بیوی میں ہم آہنگی ممکن نہیں ہوتی اس وقت قانون کے زور سے انھیں نہیں چپکایا جا سکتا۔ ایسے میاں بیوی کا رشتہ نہیں کہا جا سکتا۔ کلیسا کے نظریے کی شکست یقینی ہے وہ دن دور نہیں کہ چرچ مجبوراً اپنے عقیدے پر نظر ثانی کرے، اس لیے ہمیں چرچ اور اس کے موجودہ عقیدے پر اس سے زیادہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳- تیسرا مفروضہ ہے۔ نکاح۔ مرد کی طرف سے فسخ ہو سکتا ہے، بندھن کھل سکتا ہے۔ عورت اسے نہیں توڑ سکتی۔ پرانی دنیا میں یہی نظریہ تھا، مگر آج مجھے گمان نہیں کہ لوگ اس کی حمایت کرتے ہوں۔ میرے نزدیک اس پر زیادہ بحث و نظر کی ضرورت نہیں ہے۔

۴- چوتھا مفروضہ یہ کہ۔ نکاح، مقدس چیز ہے، اور خاندانی مرکزیت قابل احترام ہے۔ لیکن طلاق کے دروازے شرائط اور پابندیوں کے ساتھ میاں بیوی دونوں کے لیے کھلے رہنا چاہییے اور دونوں کو اس بندگی کے دو دروازوں سے ایک ہی انداز میں نکلنے کی اجازت ہونا چاہییے۔

میاں بیوی اور عورت و مرد کے حقوق میں تشابہت کے حامی۔ جس کی تعبیر غلطی سے مساوات حقوق سے کرتے ہیں۔ اسی نقطۂ نظر کے طرفدار ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک جو پابندیاں، جو شرائط عورت پر لاگو ہوں وہی مرد پر بھی عائد ہوں، اور جو تدبیر مردوں کے رشتے توڑنے کے کام آئے وہی حل عورتوں کے لیے کارآمد ہو۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ظلم اور درجہ بندی ہے اور ناروا ہے۔

۵- پانچواں مفروضہ ہے۔ شادی مقدس عمل ہے۔ خاندانی مرکزیت محترم ہے اور طلاق قابل نفرت اور ناپسندیدہ ہے (مبغوض ہے)، معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ ایسے اسباب وعلل کا قلع قمع کرے جن کی وجہ سے طلاق واقع ہوتے ہیں، قانون کو ناکام شادیوں کے لیے الجھن نہ بننا چاہیئے۔ ایسے بندھنوں سے آزادی کے لیے مرد کا راستہ بھی کھلا ہونا چاہییے اور بیوی کے لیے بھی کوئی حق ہونا ضروری ہے، جب ناکام بندھن سے آزاد ہونے کے لیے مرد کو جو راستہ بتایا گیا ہے۔ وہ اور ہے عورت کو جو راہ دی گئی ہے وہ اس سے ہٹ کر ہے۔ اور یہ مسئلہ بھی وہ ہے جہاں زن و مرد کے حقوق تو ہیں مگر ایک جیسے نہیں ہیں۔

یہ نظریہ، اسلام ہی نے ایجاد کیا ہے اور اسلامی ملکوں میں ناقص (غیر کامل) طور پر رائج ہے اور اسی کی پیروی کی جاتی ہے۔

طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ

(۲)

ہمارے زمانے میں طلاق ایک بین الاقوامی مسئلہ بن چکا ہے، ہر شخص فریادی ہے، سب کو شکایت ہے، جن لوگوں کے قانون میں طلاق بالکل ممنوع ہے، وہ پریشاں ہیں کہ شادی نبھنے والی نہیں، مزاج ملتے نہیں، طلاق نہیں دے سکتے۔ جن کے یہاں قانون برعکس ہے، طلاق کی راہ میاں بیوی دونوں کے لیے برابر سے کشادہ ہے، وہ کثرتِ طلاق اور خاندانوں کے درہم برہم ہونے، اور ناپسندیدہ نتائج کے ہاتھوں چیخ رہے ہیں، جن لوگوں نے فقط مردوں کو حق طلاق دے رکھا ہے وہ دو زاویوں سے شکوہ کرتے ہیں:

۱۔ غیر شریفانہ طلاق، کچھ لوگ کئی برس کے بندھن اور اچھے تعلقات کے بعد اچانک نئی دلہن لانے کی ہوس دل میں محسوس کرتے اور اس بیوی کو چھوڑنے پر کمر کستے ہیں جس نے اپنی عمر، جوانی، قوت اور صحت اس کے گھر میں لٹا دی، اسے تصور بھی نہ تھا کہ اس کا نرم و گرم آشیانہ اس سے چھین لیا جائے گا، وہ ایک طلاق نامہ حاصل کرتے ہی خالی ہاتھ اپنے آشیانے سے نکال دی جائے گی۔

۲۔ بعض شوہروں کا شریفانہ انداز سے طلاق نہ دینا اور ان عورتوں کا پیچھا نہ چھوڑنا جن سے ان کا نباہ ہرگز ممکن نہیں۔

اکثر ایسے اتفاقات ہوتے ہیں کہ میاں بیوی میں خاص وجوہ سے اختلافات

بڑھتے بڑھتے، ناقابل اصلاح ہو جاتے ہیں۔ صلح وصفائی کی سعی بے نتیجہ ہو جاتی ہے، زن و شوہر میں نفرت کی خلیج حائل ہو جاتی ہے۔ دونوں عملی طور پر ایک دوسرے کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، دونوں الگ الگ زندگی گذارنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہر عقل مند کے نزدیک اس مشکل کا حل یہ ہوتا ہے کہ رشتے کو توڑ دیا جائے اور دونوں اپنا اپنا نیا شریک زندگی تلاش کریں۔ مگر بعض شوہر حریف کو سزا دینے کی خاطر ہمیشہ کے لیے ازدواجی زندگی سے محروم کر دیتے، اور طلاق نہیں دیتے، اور بدنصیب بیوی کو بے سہارا زندگی گذارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی تعبیر ہے "کالمعلقۃ" معلق زندگی۔

یہ لوگ مسلمان اور اسلام کا صرف نام ہی جانتے ہیں اور اسلام ہی کا نام لے کر من مانے کام کرتے ہیں لہٰذا جو حضرات اسلامی تعلیمات کی وسعتوں سے ناواقف ہیں ان کے دل کی گہرائیوں میں یہ شبہ بیٹھ گیا کہ کیا اسلام طلاق کو اسی طریقے پر باقی رکھنا چاہتا ہے؟

یہی لوگ اعتراض آمیز لہجے میں کہتے ہیں، کیا واقعاً اسلام نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کبھی طلاق دے کر اور کبھی طلاق نہ دے کر اپنی بیوں کو سزا دیں اور ذہنی طور پر مطمئن بھی رہیں کہ انھوں نے اپنے شرعی حق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

لوگ کہتے ہیں: یہ ظالمانہ کام نہیں ہے؟ اگر یہ بات ظلم نہیں تو پھر ظلم کسے کہتے ہیں؟ آپ تو اسلام کو ہر قسم کے ظلم کا سخت مخالف بتاتے ہیں، آپ کہتے ہیں اسلامی قوانین عدل و حق کی بنیاد پر قائم ہیں؟ اور اگر یہ کام ظلم ہے اور اسلامی قوانین بھی عدالت و حق کی بنیاد پر قائم ہیں تو ذرا ہمیں بھی بتائے کہ ان مظالم کے لیے اسلام نے کیا انتظام کیا ہے؟

ان افعال کے ظلم ہونے میں کوئی بحث کی کوئی گنجائش نہیں، ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ اسلام نے ان مسائل کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، اسلام نے اس بارے میں کچھ تدابیر بتائی ہیں۔ مگر ایک بات جسے بھولنا مناسب نہیں ہے وہ اس قسم کے ظلم وستم کی راہ بند کرنے کی

بات ہے۔ کیا ظلم کی اس صورتِ حال کا سبب فقط قانونِ طلاق ہے، اور اس قانون کو بدل دینے سے یہ ظلم ختم ہو جائے گا؟ یا ظلم کی جڑیں کہیں اور ہیں ان مقامات کی جستجو کرنا ہو گی کیونکہ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں قانون کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

معاشرتی مسائل کا حل تلاش کرنے میں اسلام اور دوسرے نظریات میں فرق ہے، بعض نظریات مشکلات کا حل قانون کو بتاتے ہیں۔ اسلام کی نظر اس نکتے پر ہے کہ قانون فقط خشک اور باہمی تعلقات میں ہمواری تک تو انسان پر اثر انداز ہو سکتا ہے، مگر جب جذبات کا مسئلہ آجائے تو پھر قانون سے کام نہیں چلتا۔ وہاں دوسرے اسباب و علل اور دوسرے تدابیر سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ہم ثابت کریں گے کہ ان مسائل میں اسلام نے قانون سے جہاں تک فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا فائدہ اٹھایا ہے اور اس بارے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

غیر شریفانہ طلاق

سب سے پہلے ہم آج کی اپنی پہلی مشکل۔ یعنی غیر شریفانہ طلاق پر گفتگو کرتے ہیں:

اسلام، طلاق کا سخت مخالف ہے، اسلام تا بحدّ امکان طلاق سے روکتا ہے، اسلام نے جدائی کی بالکل آخری تجویز طلاق قرار دی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ ہی باقی نہ تھا۔ اسلام نے لگاتار بیویاں بدلنے اور طلاق دینے والے ـــ مطلاق ـــ کو دشمن خدا کا نام دیا ہے۔

الکافی[1] میں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کے پاس پہنچے اور اس سے دریافت کیا:

اپنی بیوی کا کیا کیا؟

---

[1] الکافی ج ٦ ص ٥٤، طبع تہران، جدید

بولا : طلاق دے دی!

فرمایا : کوئی براکام اس نے کیا تھا ؟

جواب : جی نہیں، کوئی برائی تو نہیں دیکھی تھی !

قصہ ختم ہو گیا، اس نے دوسری مرتبہ شادی کر لی، رسول اللہؐ نے دریافت فرمایا: دوسری بیوی لے آئے ؟

اس نے کہا : جی ہاں !

کچھ دن بعد پھر ملاقات ہوئی تو آنحضرتؐ نے پوچھا :

اس نئی بیوی کے ساتھ کیا کیا ؟

اس نے جواب دیا: طلاق دے دی۔

آنحضرتؐ نے پوچھا : اس نے کوئی برائی کی تھی؟

— جی نہیں، کوئی برائی تو نہیں دیکھی !

یہ بات بھی گئی گذری ہو گئی اور اس نے تیسری شادی کی، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ — شادی کر لی ؟

اس نے کہا — جی ہاں، یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کچھ دنوں کے بعد حضرت نے اسے دیکھ کر پھر وہی پوچھا :

اس بیوی کے ساتھ کیا سلوک کیا ؟

— اسے بھی طلاق دے دی !

— کوئی برائی نظر آئی تھی، اس میں ؟

— جی نہیں، برائی تو کوئی نہیں تھی !

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا : اللہ، اس مرد کو دشمن رکھتا اور اس شخص پر لعنت کرتا ہے جس کی آرزو بیویاں بدلنا ہو اور اس عورت پر جس کا دل چاہتا ہو کہ شوہر بدلتی رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے کہا، ابوایوب انصاریؓ اپنی بیوی ام ایوب کو طلاق دینے والے ہیں ــ آنحضرتؐ ام ایوب کو جانتے تھے، اور جانتے تھے کہ ابوایوب کا اقدام طلاق کسی صحیح دلیل کی وجہ سے نہیں ہے۔ لہٰذا فرمایا:

ان طلاق ام ایوب لحوبٌ

طلاقِ ام ایوب، بڑا گناہ ہے۔

• پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل نے خواتین کے بارے میں اتنی مرتبہ تاکید کی جس سے مجھے گمان ہوا کہ جب تک بیوی فحش کام کا ارتکاب نہ کرے اس وقت تک طلاق مناسب نہیں۔

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا، آنحضرتؐ کا ارشاد ہے:

اللہ کے حضور اس گھر سے زیادہ کوئی محبوب گھر نہیں جہاں شادی کا رشتہ قائم ہو۔ اور اس گھر سے زیادہ مبغوض کوئی گھر نہیں جس میں طلاق کے ذریعے رشتہ توڑا جائے، امام جعفر صادقؑ نے مزید فرمایا: قرآن مجید میں طلاق کا ذکر بار بار آیا اور طلاق کے جزئیات پر قرآن نے خاص توجہ کی ہے۔ اسی کی بنا پر اللہ، جدائی سے دشمنی رکھتا ہے۔

• طبرسی نے مکارم الاخلاق میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"نکاح کرو، مگر طلاق نہ دینا، طلاق سے عرش خدا کانپ جاتا ہے۔"

• امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا، حضورِ الٰہی میں طلاق سے زیادہ مبغوض وقابلِ نفرت کوئی چیز نہیں ہے۔ اللہ، زیادہ طلاق دینے والے سے دشمنی (نفرت) کرتا ہے۔

شیعہ روایات کی خصوصیت نہیں، حضرات اہل سنت نے بھی اس طرح کی روایتیں لکھی ہیں۔ سنن ابو داؤد[1] میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ما احلّ اللہ شیئاً ابغض الیہ من الطّلاق

اللہ نے کوئی ایسی چیز حلال نہیں کی جو اسے طلاق سے زیادہ ناپسند ہو۔

مولانا روم نے مشہور داستان "موسیٰ اور چرواہے" میں اسی حدیث نبوی کی طرف اشارہ کیا ہے:

تا توانی پامنہ اندر طلاق

ابغض الاشیاء عندی الطلاق

رہنمایان مذہب کی سیرت میں یہی دیکھا ہے کہ امکان بھر طلاق سے بچتے رہے ہیں۔ اور ان کے یہاں طلاق بہت کم واقع ہوئی ہے، اور جب ایسا ہوا ہے تو کسی منطقی اور عقلی بنیاد پر ہوا ہے۔ مثلاً:

امام محمد باقر علیہ السلام نے ایک عورت سے شادی کی اور کچھ دنوں بعد طلاق دی۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا: وہ علیؑ کی دشمن تھی، میں آتش جہنم کا ٹکڑا اپنے پہلو میں نہ رکھ سکا۔ یعنی جو عورت حضرت علی علیہ السلام کی دشمن ہو، اور امام اس سے تعلقات باقی رکھیں غیر منطقی بات ہے۔ لہذا طلاق ضروری تھی۔

---

[1] دیکھئے سنن ابی داؤد — تفریع ابواب الطلاق — حدیث ۲۱۷۷ اور حدیث ۲۱۷۸

ابغض الحلال الی اللہ تعالی الطلاق — ج ۲ ص ۲۵۴

امام حسنؑ کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈا (کردارکشی کی مہم)

اس موقع پر اس بے بنیاد پروپیگنڈے کی بات بھی ضروری ہے جسے بنی عباس کے مجرمانہ ہاتھوں نے جنم دیا اور اسے پھیلایا۔

عوام میں مشہور ہوا اور کتابوں میں لکھا گیا کہ فرزند بزرگوارِ حیدرِ کرّار حضرت حسنِ مجتبیٰؑ بہت شادیاں کرتے اور بہت طلاق دیتے تھے۔ اس پروپیگنڈے کی تاریخ امام حسن علیہ السلام کے سو برس بعد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ خبر ہر جگہ پھیلائی گئی اس لیے غیروں کے ساتھ اپنوں نے بھی بے تحقیق سنی سنائی لکھتے وقت یہ حقیقت بھول گئے کہ طلاق ایک مبغوض اور برا کام ہے، یہ عیش پرست و غافل افراد کا عمل ہے۔ اس شخص سے یہ بعید ہے جس کے کردار و اعمال میں سے ایک عمل پیدل حج کرنا تھا جس نے بیس مرتبہ سے زیادہ اپنا مال و متاع فقرا میں تقسیم کیا، آدھا مال خود اٹھالیا، آدھا غربا کو دیدیا۔ بھلا اس مقام بلند اور اتنی عظیم امامت و عصمت کی حامل شخصیت سے ایسی باتوں کا کیا ربط۔

سب کو معلوم ہے کہ بنی امیہ سے بنی عباس تک انتقالِ اقتدار کے وقت سے اولاد امام حسنؑ بنی عباس سے ہم آہنگ تھی۔ لیکن اولاد امام حسینؑ جن کے سردار حضرتِ امام جعفر صادق علیہ السلام تھے، خاموش رہے اور انہوں نے بنی عباس کا ساتھ نہ دیا۔ بنی عباس نے سیاسی مجبوری سے شروع شروع میں تو بنی حسنؑ سے عاجزانہ سلوک رکھا، اور انھیں اپنے سے زیادہ موزوں و بہتر ظاہر کیا، لیکن آخر میں بے وفائی دکھائی اور بہت سے ساداتِ حسنی کو قید و قتل کے ذریعے سامنے سے ہٹا دیا۔

بنی عباس نے اپنے سیاسی منصوبے کو آگے بڑھانے کی خاطر اولاد امام حسنؑ کے خلاف پروپیگنڈا اور کردارکشی کی مہم چلائی۔ منجملہ اور باتوں کے ایک یہ کہانی گڑھی کہ بنی حسنؑ

کے جدِّ اعلیٰ اور رسول اللہؐ کے چچا، ابو طالب مسلمان نہ تھے بلکہ کافر۔ نعوذ باللہ......

لیکن آنحضرتؐ کے دوسرے چچا اور ہمارے جدِّ اعلیٰ عباسؓ مسلمان ہوئے اور مسلمان مرے لہٰذا ہم کہ آنحضرتؐ کے مسلمان چچا کی اولاد سے ہیں۔ ان بنی حسنؓ سے بہتر ہیں کہ جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ کے غیر مسلم...... کی اولاد سے ہیں۔ ہم خلافت کے واسطے زیادہ موزوں ہیں۔ بنی عباس نے اس کام کے لیے دولت استعمال کی، قصے گڑھے جس کی بنیاد پر آج بھی حضراتِ اہل سنت میں کچھ لوگ کفر ابو طالب کا فتویٰ دیتے ہیں، اگرچہ آخری دنوں کچھ اہل سنت کے محققین نے چھان بین کرکے تاریخ کے افق روشن کیے ہیں۔

حسنی خاندان کے خلاف بنی عباس نے دوسرا موضوع چھیڑا اور کہنے لگے اس خاندان کے جدِّ اعلیٰ اپنے والد حضرت علیؑ کے بعد تخت و تاج کے مالک ہوئے تو اپنے شوق (معاذ اللہ) کی وجہ سے شادی و طلاق میں الجھ گئے اور معاویہ سے جنگ کے بجائے صلح کر لی......

خوشی کی بات ہے، عصرِ اخیر کے چند محققین نے اس مسئلے کی چھان بین کی اور دروغ بے فروغ کی بنیاد معلوم کر لی۔ گمان غالب یہ ہے کہ منصور دوانیقی کے معین کردہ قاضی نے یہ افواہ اڑانے میں پہل کی۔ بقول ایک مؤرخ کے۔ اگر امام حسنؑ نے اتنی شادیاں کی تھیں تو ان کی اولاد کی تعداد اتنی کم کیوں ہے؟ امام میں کوئی کمی نہ تھی اور مانع حمل گولیوں یا اسقاط کا وہ عمل بھی اس زمانے میں رائج نہ تھا جو آج کل ہے۔

مجھے اس سادہ دل شیعہ مذہب کے راویوں پر تعجب ہے۔ یہ لوگ خود ہی روایتیں نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہار نے زیادہ طلاق دینے والے کو خدا کے نزدیک مبغوض یا ملعون بتایا ہے اور اس کے بعد ہی یہ لکھ دیا کہ امام حسنؑ طلاق بہت دیا کرتے تھے۔

ان لوگوں نے یہ نہ سوچا کہ تین ہی صورتیں ہیں، انھیں میں سے ایک صورت اختیار

کرنا ہو گی۔ یا یہ کہیں کہ طلاق میں کوئی عیب نہیں ہے اور خدا بہت طلاق دینے والے کو دشمن نہیں رکھتا۔ یا یہ مانیں کہ امام حسن علیہ السلام زیادہ طلاق نہ دیتے تھے۔ یا پھر یہ مان لیں کہ امام حسنؑ اسلامی قوانین کے معاذ اللہ پابند نہ تھے۔ یہ حضرات ایک طرف احادیثِ مبغوضیتِ طلاق کو صحیح و معتبر جانتے ہیں۔ دوسری طرف مقام مقدس امام حسنؑ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اور پھر ایک جہت میں ان کی کثرتِ طلاق کی بات نقل کرتے اور اس پر نقد و نظر کیے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

کچھ تو یہاں تک پہنچے کہ بقول ان کے حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام اپنے فرزند کے اس عمل سے ناراض تھے اور (معاذ اللہ) منبر پر لوگوں سے کہتے تھے کہ میرے بیٹے حسنؑ سے بیٹی نہ بیاہنا وہ تمہاری لڑکیوں کو طلاق دیتے ہیں، مگر لوگوں نے جواب میں کہا، یا علیؑ! ہمیں تو فخر ہو گا کہ ہماری بیٹیاں فرزند پیغمبرؐ کی بیویاں بنیں۔ ان کا دل چاہے وہ رکھیں نہ چاہیں تو طلاق دے دیں۔

ممکن ہے بعض طلاق کے ناپسندیدہ اور قابل نفرت ہونے کا علاج یہ سمجھتے ہوں کہ عورت اور اس کے خاندان کو طلاق پر راضی کر لیا جائے تو نفرت والا پہلو ختم ہو جائے نفرت طلاق اس وقت ہے جب طلاق پانے والا فریق راضی نہ ہو، جب عورت طلاق میں خوشی و اعزاز محسوس کرتی ہو وہ کچھ دن کسی ایسے مرد کے ساتھ گذارنا چاہتی ہو جو اس کے اعزاز کا باعث ہو۔ اس صورت میں طلاق میں کیا رکاوٹ رہ جاتی ہے۔

یہ بات نہیں۔ لڑکیوں کے طلاق پر باپ کی رضامندیاں، یا خود بیوی کا اپنی طلاق پر خوش ہونا۔ طلاق کے مبغوض و قابل نفرت ہونے میں کمی کا باعث نہیں۔ کیونکہ اسلام نکاح میں پائداری اور خاندان کی مرکزیت میں استواری چاہتا ہے۔ اس کی نظر میں میاں بیوی کا علیحدگی پر رضامند ہونا موثر نہیں ہے۔

اسلام نے طلاق کو قابل نفرت و مبغوض قرار دیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ عورت کی خاطر داری ہو اور اسے راضی کیا جائے۔ یوں عورت کی پسند اور خاندان کی آمادگی حاصل کر کے طلاق سے نفرت ختم کی جائے۔

امام حسنؑ علیہ السلام کے بارے میں غلط پروپیگنڈے کی بات ایک تو اس لیے چھیڑی کہ ایک تاریخی شخصیت سے جتنی جلدی ہو سکے ایک تاریخی بہتان کو رد کیا جائے دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر خدا سے غافل کچھ لوگ یہ کام شروع کر دیں اور امام حسنؑ کے بارے میں سنی سنائی بات کو سند و دلیل بنا کر پیش نہ کر دیں۔

خلاصہ ـــ اس میں کوئی شک نہیں کہ طلاق اور میاں بیوی میں جدائی اپنی جگہ پر اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے۔

اسلام نے طلاق کو حرام کیوں نہ کیا

ایک اہم سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر طلاق اس حد تک قابل بغض و نفرت ہے کہ طلاق دینے والے شخص کو اللہ، دوست نہیں رکھتا، نفرت کے قابل سمجھتا ہے تو پھر اسلام نے طلاق کو سرے سے حرام ہی کیوں نہ کر دیا؟ طلاق کو حرام قرار دینے میں اسلام کے لئے کیا رکاوٹ تھی، خاص خاص اور معین صورتوں میں جائز، باقی میں ناجائز کر دیتا؟ بالفاظ دیگر۔ کیا اسلام کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ اسلام، طلاق کے لیے کچھ شرطیں لگا دیتا کہ بس ان شرطوں کے بعد ہی طلاق کی اجازت ہے؟ اس کے بعد مجبوراً شوہر کو جانا پڑتا، جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تو عدالت کو اپنے عمل کے جواز کی دلیل بتاتا، اگر عدالت کی نظر میں دلائل کافی اور اطمینان بخش ہوتے تو طلاق کی اجازت مل جاتی ورنہ نہ ملتی۔

بنیادی طور پر جملہ یہ ہے:

"حلال چیزوں میں مبغوض ترین چیز اللہ کے حضور، طلاق ہے۔"

کیا مطلب؟ اگر طلاق حلال ہے تو قابل نفرت نہیں اور اگر قابل نفرت ہے تو حلال

نہیں۔ قابل نفرت ہونے اور حلال ہونے میں کوئی جوڑ نہیں بیٹھتا۔

ان باتوں کے علاوہ۔ کیا معاشرہ۔ یعنی وہ ادارہ جسے عدالت کہتے اور معاشرے کا نمایندہ جانتے ہیں۔ حقدار ہے کہ طلاق جیسے معاملے میں جو اسلام کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ دخل دے اور عدالت۔ معاشرہ۔ فیصلہ دے دے کہ طلاق دینے سے پرہیز کرو۔ اور معاملے کو اتنا طول دیا جائے کہ شوہر اپنے ارادے پر پچھتائے یا پھر معاشرے۔ اسی طرح اجتماع۔ پر واضح ہو جائے یہ زیر بحث رشتہ یکجائی نہیں کر سکتا اب اس رشتے کو ٹوٹنا ہی چاہیئے......

طلاق

(نظام فطرت)

(۳)

بات یہ ہو رہی تھی کہ اسلام کی نظر میں طلاق بہت زیادہ قابل نفرت و عداوت و مبغوض ہے ۔ اسلام کا رجحان ہے شادی کا بندھن مضبوط و برقرار رہے ۔ اس کے بعد میں نے سوال اٹھایا تھا کہ اگر طلاق اسی قدر مذموم و مبغوض ہے تو اسلام نے اسے ناجائز ہی کیوں نہ کر دیا ؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام جس کام کو ناپسند کرتا ہے اسے شراب خواری و قمار بازی وستم گری کی طرح حرام کر دیتا ہے ؟ پھر طلاق کو بالکل ممنوع کیوں نہ قرار دیا اور اسے روکنے کے لیے قانون وضع کیوں نہ کیا ؟ اصل نکتے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی منطق کیا ہے کہ طلاق "حلالِ مبغوض" ہے ؟ اگر حلال ہے تو اس کے مبغوض ہونے کا مطلب کیا ہے، اور اگر مبغوض ہے تو حلال کیوں ؟ اسلام ایک طرف تو طلاق دینے والے مرد کو اپنی غضب آلود نگاہوں کا نشانہ بناتا ہے ، اس سے نفرت و بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور دوسری طرف جب بھی کوئی شوہر اپنی زوجہ کو طلاق دینا چاہے تو اسے کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی ، آخر کیوں ؟

یہ سوالات بجا ہیں ، سب راز کی باتیں یہیں تو چھپی ہوئی ہیں اصلی راز اور مطلب کی بات یہ ہے کہ زوجیت ، میاں بیوی کی زندگی فطری بندھن ہے یہ کوئی رسمی معاہدہ نہیں ہے ۔ فطرت میں اس کے واسطے خاص قوانین وضع ہوئے ہیں ۔ بیع ، اجارہ ، صلح ، رہن اور وکالت جیسے معاشرتی معاہدات سے یہ رشتہ مختلف ہے اُن میں صرف

معاشرتی یک طرفہ قرارداد دباہمی معاملہ ہوتا ہے فطرت وضمیر کا دخل نہیں ہوتا۔ فطرت وغریزہ کو سامنے رکھ کر قانون نہیں بنایا گیا ہے۔ پیمانِ ازدواج میں یہ بات نہیں یہاں فریقین کی ایک فطری خواہش۔ اصطلاحی طور پر۔ ایک خاص میکانزم کے طور پر پرست ہوتی ہے اور باہمی جوڑ بٹھائے جاتے ہیں۔

اس بنا پر اگر پیمانِ ازدواج کے خصوصی ضابطے ہیں اور وہ دوسرے عہد و پیمان کے ضابطوں سے جدا ہیں تو حیرت نہ کرنا چاہیے۔

نکاح و طلاق میں قوانینِ فطرت کی نگہداشت

شہری معاشرت کا قانون، آزادی ومساوات کا قانون ہے۔ تمام معاشرتی معاہدے دو اصولوں پر قائم ہوں گے، آزادی اور مساوات، کوئی دوسرا اصول استعمال نہیں ہو سکتا۔ البتہ پیمانِ ازدواج اس کے برعکس، یہاں آزادی ومساوا کے علاوہ فطرت نے کچھ اور ضابطے بھی وضع کر رکھے ہیں، اور ان قوانین وضوابط کی پیروی ونگہداشت ضروری ہے۔ طلاق، دوسرے معاہدات سے پہلے ہی تنِ فطرت میں ایک قانون کی مالک ہے۔ آغازِ کار۔ خواستگاری۔ درمیانی عمل — نکاح۔ میں ایک خاص قسم کی نگہداریِ فطرت ضروری ہے۔ آخر کار ردعمل۔ طلاق — میں بھی اس پر نظر رکھنا لازم ہے — (ہم منگنی اور خواستگاری، مہر ونفقہ، اور خصوصی طور پر زن ومرد کے مابین فرق پر گذشتہ ابواب میں گفتگو کر چکے ہیں) — فطرت کو چھوڑنا کوئی فائدہ مند بات نہیں "الکسیس کارل" کے بقول۔ حیات وزندگی کے قوانین، ستاروں کے قانون جیسے سخت اور بے رحم ہیں، ان سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

نکاح، وحدت واتصال ہے اور طلاق، جدائی وانفصال۔ جب فطرت نے جوڑا بننے اور زن ومرد کے بندھن کا قانون یوں وضع کیا ہے کہ شرکتِ زندگی کے لیے

لہ حاشیہ ص ۳۲۱ پر ملاحظہ فرمائیے

ایک طرف سے اقدام ہو اور دوسری طرف دلبری و دل ربائی کے طور پر شرم کے ساتھ ایک قدم پیچھے ہٹنے کا عمل ہو، ایک سمت وہ جذبات رکھے جن سے دوسرے کو اپنی گرفت میں لینے کی فکر ہو، دوسری طرف ایسے جذبات کہ مقابل آنے والے کا دل چھین لے۔ جب کہ نکاح کا سنگ بنیاد، محبت و اتحاد و یکدلی کو قرار دیا گیا، باہمی معاہدہ و ہم کاری نہیں۔ جب کہ گھر کی تعمیر کا نقطۂ نظر یہ رکھا کہ جنس لطیف مرکز ہو اور جنس درشت اس مرکز کے گرد چکر لگائے، لہٰذا، جدائی اور علیحدگی اور انتشار یا اس مرکز کا خلل بھی خاص ضابطوں سے محدود کیا گیا۔

مضمون کی پندرھویں قسط میں ایک دانشور کی بات نقل کر چکا ہوں کہ "شادی کا بندھن دراصل مردوں کے لئے قبضہ کرنے کی خاطر ایک حملہ ہے اور عورتوں کے لیے دل دل فریبی و دل ربائی کی خاطر ایک پسپائی ہے۔ مرد، چونکہ فطرتاً شکاری حیوان ہے لہٰذا اس کا عمل حملہ اور جھپٹنا ہے۔ ایک مثبت عمل ہے۔ دراصل عورت، مرد کے لیے انعام ہے جو اسے لے بھاگنا چاہیے۔ شادی، ایک جنگ و پیکار ہے اور ازدواج شرکت زندگی اور اقتدار ہے۔"

وہ پیمان جس کی بنیاد محبت و یگانگت ہے، تعاون و رفاقت نہیں، یہاں جبر و پابندی کا عمل نہیں ہے۔ قانون کے زور و جبر سے افراد کو انصاف کی بنیاد پر تعاون و احترام پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور یہ معاہدہ چند سال باقی بھی رکھا جا سکتا ہے۔ مگر قانون کے جبر و زور سے دو افراد کو ایک دوسرے کی محبت، ایک دوسرے سے خلوص، ایک دوسرے پر جاں نثاری کے لیے تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ ہر ایک اپنی خوش نصیبی کو دوسرے کی خوش نصیبی سمجھے۔

اس قسم کے تعلق کو برقرار رکھنے کی خواہش کے لیے قانونی جبر کے بجائے کوئی دوسری معاشرتی و عملی تدبیر اختیار کرنا ہو گی۔

ازدواج و نکاح کی فطری ٹیکنیک، جس کی بنیاد پر اسلام نے اپنے قانون وضع کیے ہیں دراصل ان کی وجہ اور نتیجہ یہ ہے کہ عورت کنبہ کی تمعیت میں محبوب و محترم ہو بنا بریں اگر کسی وجہ سے وہ اپنے مرتبے سے نیچے آجائے اور مرد کی محبت کا شعلہ اس کی سمت سے ٹھنڈا ہو جائے اور مرد اس سے بے رخی اختیار کرلے تو گویا کنبہ کا ایک ستون گر گیا یعنی فطرت کی بنیاد پر ایک فطری معاشرہ بکھر گیا۔ اسلام نے خاص کوشش و تدابیر کے سہارے کنبہ کی زندگی کو فطری انداز میں باقی رکھنا چاہا ہے۔ یعنی عورت مقام محبوبیت و مطلوبیت میں اور مرد مقام طلب و توجہ و حاضرِ خدمت رہنے کی منزل میں باقی رہے۔

اسلام نے عورت کو ہدایت نامہ دیا، عورت کو چاہیے:

- ہمیشہ اپنے شوہر کے لیے آراستہ پیراستہ رہے۔
- اپنی ہنرمندی کے نئے سے نئے جلوے شوہر کو دکھائے۔
- شوہر کے جنسی جذبات کو بڑھائے۔
- شوہر کی باتوں کا نفی میں جواب دے کر اس کے واسطے نئی گرہ اور ذہنی و نفسیاتی الجھن نہ پیدا کرے۔

ادھر مرد سے کہا:

- اپنی زوجہ سے محبت و عطوفت رکھے۔
- اظہار عشق و توجہ کرے۔
- اپنی محبت نہ چھپائے۔

اس قسم کی متعدد تدبیریں اسلام نے اس لیے اختیار کیں تاکہ جنسی لذت اندوزی اپنے گھریلو دائرے میں محدود رہے۔ اسلام کی ہدایت کہ میاں بیوی کے باہمی سلوک رشتۂ زن و شوہر کے کیڈر سے باہر بہت پاک صاف رہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ کنبہ کا معاشرتی ڈھانچہ بکھرنے کے خطرے سے بچا رہے۔

گھریلو زندگی میں شوہر کا فطری درجہ

اسلام کی نظر میں کسی زوجہ کی انتہائی توہین کی بات ہے کہ شوہر یہ کہہ دے "میں تم سے محبت نہیں کرتا مجھے تم سے نفرت ہے۔ اور اس کے بعد قانون زور و جبر کرے اور بیوی کو گھر میں رکھنے پر مجبور کرے۔ قانون، جبراً بیوی کو شوہر کے گھر میں رکھ سکتا ہے لیکن اسے فطری درجہ محبوبیت و مرکزیت اور میاں بیوی کی پر محبت و الفت فضا میں باقی رکھ سکے، یہ ممکن نہیں ہے۔ قانون شوہر کو زوجہ کی نگہداشت، اس کے اخراجات زندگی کی ادائگی کا پابند کر سکتا ہے۔ مگر اسے ایک جاں نثار اور مرکز کے گرد گھومنے والا دائرہ اور ایک نقطہ نہیں بنا سکتا۔

بنا بریں جب محبت و الفت شوہر کا شعلہ بجھ جائے تو فطری ضابطے کے مطابق شادی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے۔ اگر محبت کا شعلہ بیوی کے دل میں ٹھنڈا پڑ جائے تو کیا ہوگا؟ کیا بیوی کے رشتۂ محبت توڑ لینے سے گھریلو زندگی باقی رہے گی یا ختم ہو جائے گی؟ اگر باقی رہے گی تو، میاں بیوی میں کیا فرق ہے کہ مرد کا رشتۂ الفت ٹوٹنا تو گھریلو زندگی کا خاتمہ بن جائے اور بیوی کے رابطۂ الفت ختم ہونے سے وہ زندگی ختم نہیں ہوتی، آخر وجہ کیا ہے! اور اگر بیوی کے رخ موڑنے اور رشتۂ الفت توڑنے سے بھی گھر کا شیرازہ بکھر جاتا ہے تو جس وقت زوجہ، شوہر سے رشتہ توڑے تو اسی وقت نکاح کا بندھن بھی ختم مان لیں اور بیوی کو حق طلاق دے دیں۔

جواب یہ ہے کہ "گھریلو زندگی، فریقین کی دل بستگی پر موقوف ہے ایک فرد پے نہیں اور زن و مرد کی نفسیاتی تحقیق سے دونوں کا اختلاف ہم گذشتہ مقالات میں ایک ماہر نفسیات کے حوالے سے بیان کر چکے ہیں۔ فطرت نے میاں بیوی کا رشتہ کچھ ایسا رکھا ہے کہ بیوی، شوہر کے سامنے جوابدہ ہے۔ بیوی کی اصلی و حقیقی محبت و الفت کو شوہر کے احترام

و توجہ کے جواب میں استوار و پائدار ہونا چاہئے۔ لہذا بیوی کا مرد سے تعلق معلول (نتیجہ) ہے شوہر کی توجہ کا اور سب کچھ مرد سے وابستہ ہے، فطرت نے فریقین کی محبت کی کنجی شوہر کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ شوہر، اگر زوجہ سے محبت کرے اور وفاداری برتے تو زوجہ بھی اسے چاہے گی اور وفاداری برتے گی۔ یقینی طور پر عورت، مرد سے زیادہ وفادار ہوتی ہے عورت کی بے وفائی مرد کی بے وفائی کا ردعمل ہے۔

فطرت نے ازدواج فسخ کرنے کی کنجی مرد کو دی ہے، یعنی مرد، اپنی بے تعلقی و بے توجہی اور بیوی سے بے وفائی کر کے، بیوی کو سرد مہر و بے تعلق بناتا ہے۔ اس کے برعکس اگر بے مہری عورت کی طرف سے ہو تو مرد کے رشتۂ الفت پر اس کا اثر نہیں ہوتا، بلکہ کبھی تو اس کے جذبۂ الفت میں قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہر حال بیوی کی بے توجہی، طرفین کی بے تعلقی نہیں بنتی۔ مرد کی توجہ میں کمی اور اس کا خاتمہ مرگ ازدواج و خاتمہ زندگانی خانوادگی ہے۔ مگر شوہر کے لیے بیوی کے جذبۂ التفات کی کمی گھریلو زندگی کو مریضِ نیم جان بناتی ہے، لیکن بہتری اور تندرستی کی امید باقی رہتی ہے۔ جس وقت بے توجہی عورت کی طرف سے ہو تو مرد کی عقلمندی و وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی سے محبت و الفت و نرمی کا مظاہرہ کرے اور اسے عشق و الفت کی طرف واپس لائے۔ مرد کے لیے اپنے روٹھے محبوب کو منانے میں کوئی سُبکی نہیں، وہ "قانون" کے زور سے اس کی نگہداشت کر کے آہستہ آہستہ رام کر سکتا ہے۔ لیکن عورت کی توہین ہے، اس کے واسطے ناقابل برداشت ہے کہ وہ اپنے حامی اور عاشق کی حفاظت میں "قانون" کے زور و جبر کو سہارا بنائے۔

البتہ یہ اس صورت میں ہے جب عورت (بیوی) کی لاتعلقی کی علت شوہر کی بداخلاقی و ظلم نہ ہو، اگر مرد ظلم شروع کر دے اور بیوی ظلم و نقصان رسانی سے تنگ آکر دامن چھڑانا چاہتی ہو تو بات کچھ اور ہے۔ ہم اس بارے میں "مسئلہ دوم" کے عنوان سے گفتگو کریں گے۔ یعنی غیر شریفانہ طور پر طلاق سے پہلو تہی۔ وہاں ہم بتائیں گے کہ مرد کو اجازت

نہیں دی جائے گی کہ وہ غلط فائدہ اٹھائے اور عورت کو نقصان رسانی وستم گری کے لیے روکے رکھے۔

خلاصہ یہ ہے ۔میاں بیوی، زن ومرد میں فرق یہ ہے کہ مرد، عورت ذات کا نیاز مند ہے اور عورت مرد کا دل چاہتی ہے، بیوی کے لیے شوہر کی حمایت اور دلی توجہ اتنی قیمتی ہے کہ اس کے بغیر شادی کا عمل عورت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

ماہر نفسیات فرانسیسی خاتون کا نظریہ

زنِ روز، شمارہ ۱۱۳ میں "ماں کے نفسیات" کے عنوان سے ایک فرانسیسی خاتون BEATRIC MABEAU (بیٹرس ماربیو) کے مضمون کا ترجمہ چھپا تھا، اس مقالے کے مندرجات سے، اس خاتون کا نفسیات میں ڈاکٹر ہونے کے علاوہ پیریس کے ایک اسپتال میں نفسیات شناس معالج ہونے کے ساتھ ساتھ تین بچوں کی ماں ہونے کا علم بھی ہوا۔

مقالے کے بعض حصوں سے حاملہ یا بچے والی عورت کی شوہر سے محبت ومہربانی کی توقع پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے، وہ لکھتی ہیں:

"جب عورت محسوس کرتی ہے کہ وہ بہت جلد ماں بننے اور اولاد والی ہونے کو ہے، اسی وقت سے وہ سوچ میں پڑجاتی ہے وہ اپنے بدن کو ٹٹولنے اور سونگھنے لگتی ہے۔ خصوصاً اگر پہلا بچہ ہو تو کریدنے کی حس بہت شدید ہوتی ہے۔ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی ذات سے بیگانہ ہوگئی۔ وہ اپنے وجود کا انکشاف چاہتی ہے۔ جیسے ہی وہ پیٹ میں ننھی جان کی چبھن محسوس کرتی ہے۔ اسی وقت وہ کان لگاتی ہے کہ اپنے جسم میں نئے آنے والے کی ہر آواز کو سنے، نیا وجود اسے خوش قسمتی اور مسرت بخشتا ہے وہ آہستہ آہستہ گوشے میں رہنے اور تنہائی میں بیٹھنے کی آرزومند ہوجاتی ہے۔ وہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کرلیتی ہے وہ اس ننھی جان سے خلوت میں دل بہلانا چاہتی ہے جو ابھی دنیا میں نہیں آئی...

حمل کے زمانے میں شوہروں پر ان کی بیویوں کی بڑی ذمہ داریاں آپڑتی ہیں مگر افسوس ہے کہ مردان ذمہ داریوں سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہوتے۔ ہونے والی ماں چاہتی ہے، شوہر لے ٹٹولے اور سمجھے اس سے محبت کرے، اس کا خیال رکھے، اس کی حمایت و مدد کرے، جب وہ اپنا پیٹ ابھرتے دیکھتی ہے، اس کے حسن کو نقصان پہنچتا ہے، استفراغ آتے ہیں، متلی ہوتی ہے، بچہ جننے کا خوف طاری ہوتا ہے تو اپنے شوہر کو سب باتوں کا ذمہ دار قرار دیتی ہے کہ اسی نے حاملہ کیا......

شوہر کو ان دنوں بیوی سے زیادہ نزدیک رہنا چاہیئے اور کنبہ کو بھی ایک غمخوار و ہمدرد باپ کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بیوی بچوں سے مشکلات شادی و غم میں بات کرے، ان کی پریشان کن باتوں کو برداشت کرے۔ حاملہ عورت کی بڑی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کے بچے کے بارے میں اس سے کوئی بات کرے، عورت کی سب سے بڑی عزت و فخر کی بات ہے اس کا صاحب اولاد ہونا۔ اس وقت اگر وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا شوہر، اس کے بہت جلد دنیا میں آنے والے بچے سے دلچسپی نہیں رکھتا۔ تو اس کا غرور و افتخار پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ حقارت اور چھوٹا پن محسوس کرنے لگتی ہے۔ وہ ماں ہونے سے بیزار اور بچہ جننے کو "احتضار" و جاں کنی خیال کرنے لگتی ہے۔

ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی زچائیں، درد زہ زیادہ محسوس کرتی ہیں.....

ماں اور اولاد کا رشتہ فقط دو افراد کا رشتہ نہیں بلکہ تین افراد کا درمیانی تعلق ہے ماں، بچہ اور باپ۔ باپ غائب ہو (بیوی کو طلاق دے چکا ہو) جب بھی ماں کی اندرونی زندگی اسی کے خیالات و تصورات سے بسر ہوتی رہتی ہے۔ شوہری "مادری" جذبات میں بھی بڑا موثر کردار ادا کرتی ہے...."

یہ تھے خیالات اس دانشمند خاتون کے جو ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ ساتھ ماں بھی تھی۔

وہ عمارت جس کی بنیاد جذبات پر ہے

اب اچھی طرح سوچیے ۔ جو مخلوق اس حد تک دوسرے مخلوق کی نیاز مند توجہ ، قلبی تعلق ، حمایت اور ہمدردی کی متلاشی ہے ۔ جو ہر مشکل صرف "اس" کی مہربانی و توجہ کے سہارے جھیل سکتی ہے ۔ اور اس کی محبت کے بغیر وہ اپنی اولاد کا صحیح مطلب بھی نہیں سمجھتی ، وہ مخلوق ، جو دوسرے کے صرف وجود سے ہی نہیں بلکہ اس کے دل ، دل کے جذبات کی طلب گار ہو ۔ کیسے ممکن ہے کہ اسے قانون کے زور سے ایسی مخلوق سے چپکا دیا جائے جس کا نام مرد ہے ؟ سخت اور اکھڑ ۔

کیا یہ دھوکا نہ ہوگا کہ ہم ایک طرف بوالھوسی اور بیویوں سے لاتعلقی کے اسباب فراہم کریں اور ہوس رانی کے نئے نئے راستے نکالیں ۔ پھر قانون کے زور سے بیویوں کو شوہروں سے چسپاں رکھنا چاہیں ؟ اسلام نے یہ کام کیا کہ شوہر عملی طور پر بیوی کو چاہے اور اس سے محبت کرے ، اسلام ، بیوی کو شوہر کے سر تھوپنے کا اہتمام نہیں کرتا ۔

مختصر یہ ہے کہ جہاں ارادت و خلوص کا قدم درمیان ہو اور جذبات پر تمام معاملات کی بنیاد ہو وہاں قانون کا جبر کیا کر سکتا ہے ۔ ممکن ہے مقام افسوس ہو مگر مقام جبر و پابندی بہر حال نہیں ہے ۔

ایک مثال ہے ۔ ہمیں علم ہے کہ نماز جماعت میں امام کی عدالت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ ماموین امام کی عدالت کا یقین رکھتے ہوں ۔ یعنی امام و ماموین کا ربط و اجتماع ، عدالت امام اور ارادت و خلوص ماموین پر قائم ہے ۔ اسی وجہ سے یہ اجتماع و تعلق جبر و پابندی قبول نہیں کر سکتا ۔ تنہا قانون اسے دوام و استحکام نہیں دے سکتا ۔ اگر ماموم اپنے امام جماعت سے رابطہ توڑلیں اور خلوص و ارادت ختم ہو جائے تو ربط و اجتماع درہم برہم ہو جائے گا ۔ اس ارادت کا خاتمہ چاہے درست ہو یا غلط ۔ فرض کر لیجیے کہ امامِ جماعت واقعاً ، عدالت و تقویٰ اور صلاحیت کے اعلیٰ درجے پر بھی فائز ہو ۔ جب بھی ماموین کو اپنی اقتدار پر مجبور نہیں کر سکتا قابل مضحکہ ہو گا کہ یہ امامِ جماعت ، کچہری میں ماموین کے خلاف درخواست دائر کرے کہ لوگ

مجھ سے ارادت کیوں نہیں رکھتے ؟ لوگ میرے معتقد کیوں نہیں ؟ اور آخری بات یہ ہے کہ لوگ میرے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے ؟ دراصل ایک امام جماعت کے مرتبے کی توہین ہے کہ عوام کو قوت و جبر سے اپنی اقتدا پر مجبور کرے۔

نمائندۂ اسمبلی اور عوام کا رابطہ بھی اسی قسم کا رابطہ ہے، یعنی انتخاب کرنے والے اور منتخب ہونے والے کا رابطہ، تعلق و عقیدہ و یقین پر استوار ہوتا ہے۔ اسی رابطہ کا دار و مدار، جذبات اور دل اور معاشرے پر موقوف ہے۔ اگر عوام کسی شخص کو ووٹ نہ دیں۔ تو ان سے جبراً ووٹ لیے نہیں جا سکتے۔ خواہ عوام کو دھوکا ہی کیوں نہ ہو اور امیدوار اپنی جگہ واقعاً اہل اور اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتا ہو۔ شرائطِ انتخاب بھی پورے موجود ہوں، کیونکہ الیکشن کی فطرت اور ووٹ دینے کا مزاج جبر کے خلاف ہے۔ یہ شخص کچہری میں اپنی صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر فریاد نہیں کر سکتا کہ جناب میں اتنا قابل ہوں لیکن عوام مجھے ووٹ نہیں دیتے۔

ایسے مراحل میں کرنے کا کام ہے، عوام کی فکری سطح ہموار و بلند کرنا اور ان کی صحیح تربیت ہے، جس کے بعد لوگ اپنی دینی ذمہ داری ادا کرتے وقت (نماز ادا کرنے کے لیے) واقعی عادل افراد پیدا کریں، ان سے ارادت رکھیں۔ باخلوص اور صحیح جذبے سے امیدواران کو ووٹ دیں۔ اس کے بعد بھی اگر رائے بدل دیں، ارادت چھوڑ دیں اور بلاوجہ کسی دوسرے کے پیچھے چل کھڑے ہوں تو افسوس کی جگہ ہے۔ جبر و زور کا دخل بیکار ہے۔

کنبہ کا فرض بھی بالکل مذہبی فریضے اور معاشرتی ذمہ داری جیسا ہے۔ لہذا اچھی بات یہی ہے کہ ہم مان لیں کہ اسلام، گھریلو زندگی کو ایک فطری معاشرہ مانتا ہے، اور اس فطری اجتماع کو خاص تکنیکی عمل سمجھتا ہے۔ اس تکنیک کی نگہداشت ضروری اور اس سے انحراف کو غلط قرار دیتا ہے۔

اسلام کا بڑا معجزہ یہ ہے کہ اس نے اس تکنیک کی نشان دہی کی جب کہ مغرب آج تک

گھریلو مشکلات پر قابو نہ پا سکا بلکہ آئے دن مشکلات میں اضافہ کر رہا ہے۔ جس کا سبب فطری تکنیک سے غفلت ہے۔ البتہ خوش قسمتی کی بات ہے، علمی تحقیقات آہستہ آہستہ یہ راستہ روشن کر رہے ہیں۔ میں چمکتے سورج کی طرح دیکھ رہا ہوں، مغربی دنیا علم کی روشنی میں، اسلام کے اصول اپنے گھریلو نظام میں قبول کریں گے۔ میں اسلام کے نورانی تعلیمات اور مستحکم اصول کو عوام کے ان رویوں سے ہم آہنگ نہیں مانتا جنہیں وہ اسلام کے نام سے اپناتے ہیں۔

گھریلو زندگی کو استوار کرنے والی چیز مساوات سے بھی اہم ہے۔

آج کی دنیا میں اہل مغرب جس کا شیدا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ہے "مساوات"۔ چودہ سو برس پہلے اسلام نے "مساوات" کے اس مسئلے کو جس طرح حل کیا ہے یہ لوگ اس سے غافل ہیں، فطرت نے فقط شہری معاشرے میں مساوات کا قانون وضع کیا ہے۔ لیکن گھریلو معاشرے میں مساوات کے علاوہ بھی قانون وضع کیے ہیں۔ اکیلی "مساوات" گھریلو تعلقات منظم کرنے کے لیے کافی نہیں، خاندانی معاشرے میں فطرت کے دوسرے قوانین کو بھی معلوم کرنا چاہیے۔

فساد میں مساوات

افسوس ہے کہ مساوات و برابری کی تکرار اور اس کی تعلیم نے اپنی اصل خوبی و خصوصیت سے ہاتھ دھو لیا ہے۔ بہت کم سوچا جاتا ہے کہ برابری سے مراد، حقوق میں برابری ہے۔ عام خیال کے مطابق بس یہ کافی ہے کہ "مساوات" کا مفہوم جہاں بھی صادق آ گیا، بات پوری ہو گئی۔ ان بے خبر لوگوں کے خیال میں، ماضی میں مرد، عورت سے جھوٹ بولتے تھے۔ آج کل عورتیں، مردوں سے جھوٹ بولتی ہیں، لہٰذا سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ کیونکہ جھوٹ بولنے میں مساوات قائم ہو گئی۔ ماضی میں دس فیصد شادیاں مردوں کے ہاتھوں طلاق تک پہنچتی تھیں۔ اب دنیا کے بعض حصوں میں چالیس فیصد طلاق دی جا رہی ہے۔ ان میں بیس فیصد عورتوں کی طرف سے ہیں لہٰذا جشن منایا جائے کہ مکمل مساوات قائم ہو گئی۔ گذشتہ زمانے میں مرد، پاک دامن و پرہیزگار نہیں تھے۔ آج عورتیں بھی خیانت کار ہو گئیں وہ بھی پاک دامنی و پرہیزگاری

چھوڑ بیٹھیں، اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ — مساوات زندہ باد — فرق مدارج مردہ باد۔
پہلے زمانے میں مرد بے رحمی و سختی کا مظاہرہ کرتے تھے، مرد، دل نواز بچوں کا باپ ہوتے ہوئے
بیوی بچوں کو چھوڑ کر نئی نئی معشوقہ تلاش کرتے پھرتے تھے، آج دیرینہ پیوند بیویاں برسوں کی
گھریلو زندگی اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ چھاڑ، مجلس رقص میں ایک مرد کی آشنائی کرکے
انتہائی قساوت و بے رحمی سے گھر اور آشیانے کو چھوڑ کر، ہوس رانی کے پیچھے روانہ ہو جاتی
ہیں — واہ، واہ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے۔ میاں بیوی ایک ترازو میں آگئے، برابری
قائم ہو گئی۔

یہ ہے — دوا کے بجائے معاشرے کے بے شمار دردوں میں اضافے۔ میاں بیوی
کے نقائص کی اصلاح اور کنبہ کی مرکزیت کو استوار کرنے کے بجائے آئے دن اسے کمزور اور
متزلزل کرنے کی فکر میں رقص اور ناچ کر شکر ہے — کچھ تو۔ مساوات کی طرف بڑھ رہے
ہیں۔ بلکہ آہستہ آہستہ بیویاں، فساد و انحراف و بے رحمی میں مردوں سے آگے جا رہی ہیں۔

● ● ●

اب واضح ہو گیا کہ اسلام نے طلاق کو مبغوض اور قابل نفرت قرار دینے کے باوجود، اس کے
سامنے قانونی رکاوٹ کیوں نہ کھڑی کی۔ یہ معلوم ہو گیا کہ "حلالِ مبغوض" کسے کہتے ہیں، اور
ایک چیز حلال ہوتے کے باوجود بے حد قابل نفرت و دشمنی کیسے ہو سکتی ہے۔

لہ عقد ازدواج

شہید مطہری، فقیہ و فلسفی ہیں، ان کی بحث، قانون مملکت اور قانون اسلام دونوں سے مربوط ہے اس لیے عام قاری کو پہلی نظر میں مطلب تک پہنچنے میں بہت سوچنا پڑے گا۔ مثلاً: "عقد ازدواج عقود لازم میں ہے"۔ "عقد ازدواج طبیعتاً لازم ہے" اس بات کو سمجھنے کے لیے عقد کے اصطلاحی معنی اور منطق یا فلسفۂ قانون اسلام میں "لازم و لزوم" کے معنی سمجھنا ہوں گے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے:

عقد: بندھن، گرہ۔ (فلسفہ کی اصطلاح میں) اطراف جسم کا جمع ہونا۔ اصطلاح فقہ میں یہ اصطلاح۔ باب معاملات و نکاح۔ میں استعمال ہوتی ہے، جس کے مطلب ہیں: ایجاب و قبول یا شرعی طور پر معتبر خاص رابطہ۔ بیع، ہبہ، وقف، نکاح جیسے امور میں ایک شخص معین قانونی کلمہ یا کلمات ادا کرتا ہے دوسرا شخص اسے قبول کا اظہار کرنے والے کلمات زبان سے کہتا ہے، اس کے بعد عقد قائم ہو جاتا ہے۔ مثلاً عقد ازدواج و نکاح میں عورت یا اس کا وکیل کہے "زوّجت . . . . " مرد یا اس کا وکیل کہے "قَبِلْتُ . . . ." وغیرہ یہ عقد صحیح و شرعی ہے۔ اس کے بعد کچھ حقوق و فرائض، کچھ آزادیاں کچھ پابندیاں ان دونوں عقد کرنے والوں پر عائد ہو جاتی ہیں۔ ایجاب و قبول کرنے والے "متعاقِدین" کہے جاتے ہیں۔

عقد کے بعد منطقی لحاظ سے متعاقدین کے درمیان عقد "التزام" کی صورت رکھتا ہے؟ اس میں بحث ہے۔ کچھ لوگ۔ ایک چیز کے مقابلے میں متعاقدین کے عقد کو التزام مانتے ہیں یعنی لزوم و التزام نہیں مانتے۔ بحث کی بنیاد یہ ہے کہ عقد مقولۂ فعل ہے اور۔ التزام مقولۂ اضافت۔ جو حضرات ان میں التزام مانتے ہیں وہ عقد کرنے والے دونوں افراد کے درمیان عقد و معاہدے کو مقولات کی بحث سے الگ کرتے اور "لزوم" پر اصرار کرتے ہیں۔ اور جو حضرات لزوم کا انکار کرتے ہیں وہ ایجاب و قبول کی ٹکنیک اور اس سے دو مفہوم حقیقی و منطقی کا اثبات کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لفظ کے تین مدلول (معنی یا مفہوم) ہوتے ہیں۔ مطابقی، تضمنی اور التزامی عقد سے مراد ہے وہ ایجاب جو قبول سے مربوط ہے۔ اور جہاں ایجاب قبول سے مربوط ہو، وہاں

یا تملیک مراد ہے یا مبادلہ۔ لہذا، تعہد (نگہداشت و پابندی) اور التزام کا ربط نہیں رہتا۔ ہاں التزام عقد کے احکام میں ہو سکتا ہے۔ عوارض میں ہو سکتا ہے مگر لزوم نہیں ہو سکتا یعنی متعاقدین کے عقد سے نہ اس کا تعلق جزء جیسا نہ اس کی جدائی محال ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے کتب استدلالی فقہ نیز۔ ڈاکٹر سید جعفر سجادی کی کتاب "فرہنگ معارف اسلامی" جلد سوم حرف ع ق د — طبع تہران - ایران۔

ؔ دیکھیے، حضرت مرجع اعظم، آیت اللہ العظمیٰ امام خمینی مدظلہ العالی "تحریر الوسیلہ" جزء ثانی، ص ۲۹۴ کتاب الطلاق، القول فی الصیغۃ۔

طلاق

(کوششِ صلح کے پس منظر میں)

(۴)

سابقہ بحث سے معلوم ہو چکا کہ اسلام طلاق اور کنبہ کے شیرازہ بکھرنے کا مخالف اور دشمن ہے۔ اسلام نے شیرازۂ خاندان کی حفاظت کے بارے میں اخلاقی و معاشرتی بندشیں بندیاں کی ہیں اس نے طلاق کو وقوع پذیر ہونے سے روکنے کی خاطر متعدد وسائل سے کام لیا ہے صرف جبر اور قانون کا ہتھیار استعمال نہیں کیا۔

قوت اور قانون کے اسلحہ کے زور سے شوہر کو طلاق سے روکا اور بیوی کو قانونا کے جبر سے شوہر کے گھر میں رکھا جائے۔ اسلام اس کا مخالف ہے۔ اس کے نزدیک گھریلو ماحول میں یہ اقدام عورت کے درجے کے شایان شان نہیں ہے، وہ گھریلو زندگی کی بنیادی رکن اور جذبات واحساسات کا سرچشمہ ہے۔ جس شخصیت کو رشتۂ ازدواج کے نرم و حسین جذبات جذب کر کے، مہر و محبت کے بادل اولاد پر برسانا ہیں وہ عورت ہے۔ شوہر کی سرد مہری، اس کے شعلہ محبت کا بجھنا، اس کے زوجہ سے متعلق جذبات کا خاتمہ گھریلو فضا سے گرمی اور روشنی کو ختم کر دیتا ہے۔ بات یہاں تک ہے کہ ماں کے مادرانہ احساسات اولاد کے بارے میں اس سے زیادہ ہوتے ہیں جتنے جذبات شوہر کے اس سے وابستہ ہوتے ہیں "بیٹرس مار بو"، کی رائے ہم گذشتہ مضمون میں لکھ چکے ہیں، ان کے بقول مادرانہ جذبات غریزہ و فطرت نہیں ہیں۔ یعنی، ماں بہرحال غیر زوال پذیر جذباتِ محبت یا کم

نہ ہونے والی مامتا اپنے بچوں کو دیتی رہے۔ بلکہ اس کے مادرانہ جذبات بڑی حد تک شوہر کی توجہ سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ بیوی کا وجود شوہر کی ذات سے جذبات و احساسات کا تاثر لیتا، اور اس کے نتائج اپنے سرچشمۂ فیاض سے اولاد کے حوالے کرتا ہے۔

مرد کوہسار اور عورت جوئبار اور اولاد سبزۂ و گل جیسے ہیں۔ چشمہ و جوئبار پہاڑ پر بارش ہوتی ہے وہ بارش کا پانی جذب کرکے، صاف و شفاف کرکے چشموں اور جوئباروں کے حوالے کرتے ہیں یہ چشمے سبزہ زاروں کو شادابی بخشتے ہیں، بارش نہ ہو، یا پہاڑ پانی جذب کرنے اور مصفا کرکے چشموں تک پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو چشمہ خشک اور گل بوٹے مرجھا جائیں گے۔

جیسے بارش خصوصاً پہاڑوں کی بارش دشت و صحرا کی زندگی کی جان ہے۔ گھریلو زندگی کی جان بھی شوہر کے محبتانہ جذبات اور بیوی کے ساتھ پیار کی رفتار ہے۔ اس سے بیوی بچوں کی زندگی میں چمک دمک، شفافیت اور خوشیوں کی لہر دوڑتی ہے۔

جب شوہر کے اپنی زوجہ سے جذباتِ الفت و محبت کی منزل و تاثیر یہ ہے اور کنبہ کی زندگی بلکہ روح پر اثر اتنا ہے تو پھر قانون کے اسلحہ اور ضابطے کے تازیانے سے مرد کو قابل استفادہ کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

اسلام، غیر شریفانہ طلاق کا سخت مخالف ہے۔ یعنی ایک مرد پیمانِ رشتۂ ازدواج پر دستخط کرنے کے بعد، کبھی تو کچھ مدت تک رفیق حیات رہنے کے بعد، ایک نوبیاہتا دلہن کے شوق میں پرانی بیوی کو چھوڑنے کا عمل ناپسند کرتا ہے۔ لیکن اسلام کی یہ رائے بھی نہیں ہے کہ اس "ناجواں مرد" کو پہلی بیوی کے گھر میں رکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ نگہداشت عائلی زندگی فطری قانون سے مختلف شے ہے۔

اگر زوجہ قانون کے زور اور پولیس کی مدد سے شوہر کے گھر میں واپس آجائے تو کنبہ

مارشل لا تو نافذ کر سکتی ہے، اس گھر کی ملکہ نہیں رہ سکتی، وہ شوہر سے جذبات لے کر جذب کرنے اور اولاد تک پہنچانے کا وسیلہ نہیں بن سکتی وہ اپنے وجدان کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی جو محبت و توجہ شوہر سے عبارت ہے پھر وہ اپنے وجدان کو سیراب و مطمئن کیونکر رکھے گی۔

اسلام نے کوششیں کی ہیں کہ ناجوانمردی اور غیر شریفانہ طلاقوں کا خاتمہ ہو جائے اور "مرد" شریفانہ انداز میں اپنی بیویوں سے سلوک رکھیں اور ان کو برداشت کریں۔ لیکن اسلام یہ نہیں چاہتا کہ قانون ساز کی حیثیت سے، بیوی پر جسے وہ مرکز شیرازہ بندی خاندان، اور وسیلۂ حصول و تقسیم جذبات جانتا ہے زور و جبر کے ذریعے غیر شریف شوہر کے ساتھ باندھے رکھے۔

اسلام نے جو کچھ کیا ہے وہ مغرب اور مغرب پرستوں کے خلاف کیا ہے، مقابل کا نقطہ اسلام نے غیر شریفانہ رویے کے اسباب، بے وفائی اور ہوس رانی سے جنگ کی اور اس پر تیار نہ ہوا کہ بیوی کو غیر شریفانہ مزاج اور بے وفا شوہر کے سر منڈھ دے۔ جبکہ مغرب اور مغرب پرست ایک طرف غیر شریفانہ عوامل کو ہر لمحہ فروغ دے رہے ہیں بے وفائی و ہوس رانی مرد کو بڑھا رہے ہیں۔ اس کے بعد یہ چاہتے ہیں کہ جبر کے ذریعے ہوس ران و بے وفا و غیر شریف شوہر سے بیوی کو اٹکائے رکھیں.....

آپ تصدیق کریں گے کہ اسلام نے غیر شریف شوہر کو، بیوی کی نگہداشت اور اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور نہیں کیا، اس نے دونوں کو آزادی دی اور اپنی تمام کوششیں، روح انسانیت اور شرافت کی بقا پر صرف کی ہیں۔ عملی طور پر اسلام اتنا تو بہر حال کر سکا کہ بہت زیادہ قابل توجہ حد تک طلاقوں میں کمی کر سکے۔ دراں حالے کہ دوسروں نے ان مسائل پر کوئی توجہ نہیں دی اور ہر قسم کی خوش نصیبی و شاد کامی زور اور نیزے کی نوک طلب کی ہیں۔ پھر بھی کامیابیاں بہت کم نصیب ہوئیں۔ ان طلاقوں سے قطع نظر جو باہمی تعلقات

کی خرابی یا (بقول رسالہ نیوز ویک) عورتوں کی لذت اندوزی کی بنا پر واقع ہوتی ہیں۔ فقط مردوں کی ہوس رانی کی بنا پر ہمارے یہاں دی جانے والی طلاقوں سے مغرب میں مردوں کی طرف سے دی جانے والی طلاقوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔

گھریلو صلح کا مزاج ہر قسم کی صلح سے جدا ہے

یقیناً، میاں بیوی میں، صلح، صفائی برقرار رہنا چاہیے مگر ایسی صلح وصفائی جو ان کے باہمی رشتے پر حکمراں ہو۔ یہ صلح وصفائی اس صلح و ہم آہنگی سے مختلف ہے جو دو شریک کار، دو ہم سایے، دو پڑوسی حکومتیں اور دو ہم سرحد سلطنتوں میں کار فرما ہوتی ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

میاں بیوی کی زندگی میں صلح صفائی کا مقابلہ کرنا ہو تو اس ہم آہنگی و لطافت سے کریں جو ماں باپ اور اولاد میں ہوتی ہے، جس کو جاں نثاری و درگذر کے ہم پلہ کہا جاتا ہے وہ ربط جو ایک دوسرے کے مقدر سے ہو، جو دوئی کی دیوار گرا دے۔ ایک کی خوشی دوسرے کی خوشی بن جائے اور ایک کی پریشانی دوسرے کی پریشانی ہو۔ برخلاف اس اتفاق و دوستی کے دو ہم کار، دو شریک یا دو ہم سایوں یا دو پڑوسی ملکوں میں ہوتی ہے۔

اس قسم کی صلح کا مطلب ہوتا ہے ایک دوسرے کے حقوق میں عدم مداخلت؛ بلکہ دو متحارب حکومتوں میں "مسلح صلح" بھی ہو جاتی ہے۔ بشرطیکہ تیسری قوت مداخلت کرے اور دونوں کی سرحدی لائن پر قبضہ کرلے، اور دونوں حکومتوں کو جنگ روکنے کا حکم دے نتیجے میں دونوں میں صلح ہو جاتی، کیونکہ سیاسی صلح کے معنی صرف عدم تصادم کے ہیں۔

گھر کی صلح، سیاسی صلح سے مختلف ہے۔ گھریلو صلح میں فقط ایک دوسرے کے حقوق پر دست درازی سے باز رہنا کافی نہیں ہے۔ گھریلو صلح میں " صلح مسلح " سے کام نہیں بنتا یہاں اس سے بڑھ کر اور کسی اہم ترین اساسی بات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی، اتحاد،

یگانگت، دل وجان کا گھل مل جانا جیسے باپ اور اولاد کی صلح وصفائی میں ہوتا ہے۔ ٹکراؤ سے بچنے کے علاوہ کوئی بڑا مرحلہ۔ افسوس ہے کہ مغرب، تاریخی اسباب، ممکن ہے جغرافیائی عوامل کی بناپر گھریلو جذبات سے بے بہرہ ہے حتیٰ کہ گھر کی فضا کے اندر بھی، وہاں، گھر کی صلح، سیاسی یا معاشرتی صلح سے جدا نہیں سمجھی جاتی، یورپ کے عوام جس طرح دو ملکوں کی سرحدوں پر صلح برقرار رکھتے ہیں اسی انداز سے عدالتی قوت کے ذریعے میاں بیوی کی سرحدات زندگی میں صلح قائم رکھنا چاہتے ہیں، انھیں یہ نہیں معلوم کہ زن و شوہر کی سرحدات زندگانی میں "سرحد" کا خاتمہ ہی بنیاد حیات ہے۔ وحدت اور تیسری قوت کو بیگانہ سمجھنے کا احساس۔

مغرب پرست، اہل یورپ کو ان کی غلط فہمیاں بتانے، ان کو گھریلو مسائل، اپنے فخر کی باتیں سمجھانے کے بجائے، خود ان کے رنگ میں رنگنے کا وہ جنوں مول لے چکے ہیں کہ سر اور پیر کا فرق یاد نہ رہا۔ لیکن یہ خود فراموشی دیر تک رہنے والی نہیں ہے، جس دن بھی مشرق نے اپنی شخصیت دریافت کرلی، جس دن بھی مغرب کا جوا اتار پھینکا، جس دن بھی آزادی کی فکر اور آزاد فلسفۂ زندگی پر بھروسہ کرلیا اسی دن یہ عیب دور ہوجائیں گے اور وہ دن قریب ہیں۔

یہاں دو باتوں کا تذکرہ ضروری ہے:

اسلام، طلاق سے باز رکھنے والی ہر تجویز کا خیر مقدم کرتا ہے۔

(۱) ممکن ہے، کچھ حضرات ہماری گذشتہ گفتگو سے یہ نتیجہ حاصل کریں کہ ہم شوہر پر طلاق کے سلسلے میں کسی رکاوٹ کے قائل وخواہشمند نہیں ہیں۔ مرد جب طلاق دینا چاہے ہر راستہ اس کے واسطے کھلا ہو۔ نہیں۔ ایسا کوئی خیال نہیں، ہم نے اسلام کے نقطۂ نظر کی توضیح میں صرف یہ بتایا ہے کہ شوہر کے سامنے قانون کا جبر رکاوٹ بناکر فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اسلام، شوہر کو طلاق

سے باز رکھنے کے لیے جو بات بھی کی جائے اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اسلام نے سوچ سمجھ کر طلاق کے لیے ایسے شرائط اور ضابطے وضع کیے ہیں جو طبعی طور سے طلاق کو التوا میں ڈال کر شوہر کو اس سے موڑ دینے والے ہیں۔

اسلام نے ایک طرف صیغۂ طلاق دو گواہ کی شرط رکھی، اور نصیحت کی ہے کہ طلاق دینے والے کو طلاق سے باز رکھیں۔ دوسری طرف دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق کو باطل قرار دیا، یعنی ان دو آدمیوں کو جن کے سامنے طلاق دے گا انھیں عدالت و تقویٰ کے ساتھ پوری سعی و کوشش کرنا ہے کہ میاں بیوی میں صلح و صفائی کرا دیں۔

آج کل، طلاق دینے والا ایسے دو عادل گواہوں کے سامنے طلاق جاری کرتا ہے، جنھوں نے میاں بیوی کو نہ دیکھا بھالا نہ جانا پہچانا، ان کے سامنے تو فقط دونوں کے نام لیے گئے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جو بجائے خود کچھ بھی ہو اسلام کے نظریے اور مقصد سے الگ ہے۔ ہمارے یہاں رسم ہے، طلاق دینے والے دو عادل ڈھونڈھ لیتے ہیں اور ان کو بٹھا کر میاں بیوی کا نام لے کر صیغۂ طلاق جاری کر دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

شوہر، احمد اور بیوی، فاطمہ، میں نے شوہر کی وکالت میں ان کی بیوی کو طلاق دی۔

احمد کون صاحب ہیں اور فاطمہ نامی خاتون کی تعریف کیا ہے؟ کیا دونوں عادل حضرات جو بطور گواہ موجود، اور صیغۂ طلاق سن رہے ہیں، ان دونوں کو دیکھ چکے ہیں؟ اگر کسی دن، شہادت طلب کرنے کا موقع آجائے اور ان سے گواہی کی تفصیل مانگی جائے تو کیا وہ بتا سکیں گے کہ، ہاں، ہمارے سامنے انھیں دو افراد کے درمیان طلاق واقع ہوئی ہے؟ یقیناً، وہ یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ گواہی کس قسم کی گواہی ہے، مجھے نہیں معلوم۔

بہر حال شوہروں کو دو عادل گواہوں کی فراہمی طلاق سے باز رکھنے کا ایک سبب ہے۔ بشرطیکہ یہ عمل صحیح طور پر انجام دیا جائے۔ اسلام نے ازدواج یعنی پیمان کے آغاز میں دو عادلوں کی حاضری کی شرط نہیں رکھی۔ وہ کارِ خیر میں تاخیر نہیں چاہتا۔ مگر طلاق، جو آخری عمل

ہے دو عادلوں کی حاضری پر موقوف کرتا اور شرط قرار دیتا ہے۔

اسلام، نکاح کے وقت ماہواری آنے کو عقد میں رکاوٹ نہیں قرار دیتا، باوجودیکہ ہمیں معلوم ہے کہ ماہواری کے زمانے میں میاں بیوی جنسی عمل نہیں کر سکتے اور اس بات کا تعلق شادی سے ہے طلاق سے نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تو جدائی کا مرحلہ ہے اس کے بعد دونوں کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہ رہے گا۔ قاعدے کے مطابق صیغۂ نکاح ماہواری کے زمانے میں جاری ہونے بلکہ جائز نہ ہونے کی ضرورت تھی کیونکہ دونوں کا پہلی مرتبہ یکجا ہونے کا مرحلہ ہوتا ہے اور ممکن ہوتا ہے کہ وقت عادت کا خیال نہ کریں۔ بخلاف طلاق کے جو علیٰحدگی کا وقت ہے اس میں ماہواری کی عادت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن اسلام چونکہ "وصل" کا حامی اور "فصل" و فراق کا مخالف ہے اس لیے زمانۂ عادت کو مانع صحتِ طلاق قرار دیتا ہے اور مانع صحت عقد نہیں مانتا، بلکہ بعض مقامات پر تو تین مہینے تک "تربّص" کو واجب قرار دیتا ہے اس کے بعد صیغۂ طلاق جاری کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔

صاف سی بات ہے، ان سب رکاوٹوں کے پیدا کرنے کا مقصد یہی ہے اتنی مدت میں ان اذیتوں، اور غیظ و غضب کا زور ٹوٹ جائے جن کی وجہ سے طلاق پر آمادگی تھی، اور دونوں میاں بیوی مفاہمت پر تیار ہوں اور پہلی جیسی زندگی گذارنے لگیں۔

مزید براں، مرد کی ناپسندیدگی کی بنا پر طلاق واقع بھی ہو جائے جب بھی "عدے" کے نام سے دوبارہ مہلت دی گئی ہے کہ وہ فیصلہ واپس لے اور بیوی کو دوبارہ آباد کرے۔

شادی اور عدہ، نیز اولاد کی نگہداشت کی صورت میں اخراجات شوہر کو ادا کرنے کا ضابطہ بجائے خود شوہر کے لیے عملی رکاوٹ ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص طلاق اور نئی شادی کی فکر میں ہے تو اسے پہلے تو زوجۂ اولیٰ کے عدے کا "نفقہ" دینا ہوگا پھر بچے اس کے پاس رکھتا ہوں تو بچوں کے اخراجات ادا کرنا پڑیں گے۔ اس کے بعد نئی بیوی کا مہر اور اس کی زندگی کے اخراجات، اس کے یہاں ہونے والے بچے اور ان کے

اخراجات کے لیے تیاری کرنا ہو گی۔

ان سب باتوں کے علاوہ بے ماں کے بچوں کی ذمہ داری، ایسا بھیانک مستقبل سامنے لاتی ہے کہ آدمی خود بخود اپنے ارادہ طلاق کے سامنے ایک دیوار دیکھتا ہے۔

ان باتوں سے بڑھ کر، چونکہ اسلام سمجھتا تھا کہ خاندان کا رشتہ اب بھی درہم برہم ہو سکتا ہے لہٰذا ایک گھریلو کچہری اور فیصلہ کن حاکم کا ضابطہ بنایا یعنی ایک بیوی کا نمائندہ ایک شوہر کا نمائندہ اپنے اپنے موکلوں سے حق فیصلہ لے کر ایک جگہ بیٹھیں اور ان کے جھگڑے کا فیصلہ کر کے دونوں میں صلح صفائی کرائیں۔

دونوں منصب انتہائی کوشش کریں گے اور دونوں کے گلے شکوے ختم کریں گے۔ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اگر صلح صفائی نہ ہو سکے اور طلاق ہی بہترین حل نکلے تو بہر حال دونوں کو الگ کر دیں۔ یہاں بھی ان آدمیوں کا ہونا بہتر ہے جن کا تعلق دونوں کے گھروں سے ہو، سورۂ النساء کی آیت نمبر ۳۵ کے الفاظ یہ ہیں:

وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکماً من اهله وحکما من اهلها۔ ان یریدا اصلاحاً یوفق الله بینهما ان الله کان علیماً خبیرا،

اور اگر تم کو دونوں میں جدائی کا ڈر ہو تو ایک منصف شوہر کے خاندان اور ایک منصف زوجہ کے خاندان کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر دونوں منصف اصلاح احوال چاہیں، اللہ ان دونوں میں موافقت و اتحاد پیدا کرے گا، بے شک اللہ علیم و خبیر ہے۔

صاحبِ تفسیر کشاف نے "حکم" کی تفسیر میں لکھا ہے:

ای رجلا مقنعا رضیا یصلح لحکومة العدل والاصلاح بینهما۔

یعنی جو شخص ثالث و منصف منتخب کیا جائے وہ معتمد ہو، اس کی بات قابل قبول اور گفتگو مضبوط و بادلیل ہو اصلاح احوال اور عادلانہ فیصلے کے لائق اور پسندیدہ آدمی ہو۔

اس کے بعد لکھا ہے۔ پہلے مرحلے میں دونوں منصفوں کو میاں بیوی کے خاندان سے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے افراد چونکہ دونوں کے نزدیکی اور باہمی قضیوں سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں اور رشتے داری کی وجہ سے اجنبی کے مقابلے میں زیادہ اصلاح کرنے کے امکانات رکھتے ہیں، نیز، میاں بیوی اپنے دل کی بات غیروں کے بجائے اپنوں سے زیادہ کہہ سکتے ہیں، وہ اپنے راز اور خانگی معاملات غیروں سے یوں نہیں کہہ سکتے۔

یہ مسئلہ کہ ثالثی کا تقرر واجب ہے یا مستحب؟ علماء میں اختلاف ہے۔ محققین کے نزدیک یہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور واجب ہے۔ شہید ثانی نے "مسالک" میں صاف صاف فتویٰ دیا ہے کہ ثالثی کا مسئلہ جس ترتیب سے بیان کیا گیا۔ واجب و ضروری ہے اور حکام کا فریضہ ہے کہ وہ ہمیشہ یہ ذمہ داری پوری کرتے رہیں۔

سید محمد رشید رضا، مؤلف تفسیر "المنار" ثالثی کمیٹی بنانا واجب ہے کہہ کر علماء اسلام کے فتووں میں اختلاف پر روشنی ڈالتے اور بتاتے ہیں کہ ثالثی واجب یا مستحب ہونے کی بحث عجیب ہے۔

> عملاً اس بات سے مسلمان، اس کے بے انتہا خصوصیات سے فائدہ ہی نہیں اٹھاتے، طلاق کا سلسلہ بدستور ہے، شقاق و اختلاف گھروں میں رہتا ہے، نص قرآن، ثالثی کے بارے میں ہوتے ہوئے ذرہ بھر اس کی طرف توجہ

---

[1] تفسیر المنار ج ۵ ص ۷۹، ضمن آیت مذکور۔

اور اس سے فائدہ اندوزی نہیں کی جاتی، ہاں، علماء اسلام اس کے وجوب و استحباب کے ارد گرد بحث میں سرگرم ضرور رہتے ہیں۔ کوئی یہ کہنے والا نہیں جو ان سے کہے کہ واجب و مستحب کیا، اس حکم کو نافذ کرنے کے سلسلے میں عملی اقدام کیوں نہیں کرتے؟ بحث مباحثہ ہی پر پورا زور کیوں لگ رہا ہے؟ اگر طے کر لیا ہے کہ اس حکم پر عمل نہ کیا جائے اور لوگ اس کے خصوصیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو واجب یا مستحب ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

شہید ثانی نے ان شرائط کے بارے میں لکھا ہے جو منصفین، میاں بیوی کی مصالحت کے ذیل میں طے کریں:

"مثلاً: منصف حضرات شوہر کو پابند کریں کہ وہ اپنی بیوی کو فلاں شہر یا فلاں گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً ۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر میں رہنے کی جگہ دے، یا یہ کہ مثلاً ۔ اپنی ماں یا دوسری بیوی کو اس گھر یا اس کے کمرے میں نہ رکھے یا مثلاً، بیوی کا مہر جو واجب الادا ہے اسے ادا کرے۔ یا بیوی سے لیے ہوئے قرضے کو فوراً واپس کرے"

غرض کہ جو اقدام بھی شوہر کو طلاق سے باز رکھنے پر کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کی نظر میں صحیح اور مطلوب ہے۔

بائیسویں مقالے میں سوال تھا۔ کیا معاشرہ یعنی وہ کمیٹی جو عدالت وغیرہ کے نام سے معاشرے کی نمائندہ ہوتی ہے، اس کا حق رکھتی ہے کہ طلاق کے معاملے میں مداخلت کر سکتی ہے؟ اس طلاق کے معاملے میں جو اسلام کی نظر میں قابل نفرت و بغض ہے، ایسا اقدام جو شوہر کو طلاق دینے کے آخری اقدام سے روک دے۔

جواب ۔ یقینا، وہ ایسا اقدام کر سکتی ہے۔ کیونکہ طلاق کے لیے ہر قسم کے حتمی فیصلے حقیقی موتِ ازدواج کی علامت نہیں ہوا کرتے۔ دوسری لفظوں میں طلاق کے

بارے تمام فیصلے لیے نہیں ہوتے جو شوہر کے شعلہ محبت کی فسردگی کی دلیل کامل ہوں اور یہ ثابت کر دیں کہ بیوی اپنے مقام و درجے سے گر گئی اور وہ فطری درجہ کھو بیٹھی جس کی وجہ سے وہ شوہر کے لیے بحیثیت بیوی کے قابل نگہداشت نہ رہی۔ بہت سے فیصلے غصے، غفلت یا غلط فہمی پر مبنی ہوتے ہیں، لہٰذا معاشرہ جس انداز اور جس ذریعے کو عملی اقدام کے لیے پسند کرے اسلام اسے خوش آمدید کہتا ہے۔

ثالثی ادارہ، معاشرے کی نمایندگی کرتے ہوئے، طلاق کی سند یا رجسٹریشن کرنے والے اداروں کو اس وقت تک قانونی توثیق سے روک سکتا ہے۔ جب تک ادارہ صلح کی تدبیروں کو عمل میں لا رہا ہو۔ جب ادارہ یہ کہدے کہ ہمیں صلح نہ ہونے کا یقین ہو گیا ہے اور میاں بیوی دونوں میں مفاہمت ممکن نہیں ہے، اس کے بعد دفتر اور متعلقہ محکمے اپنی کاروائی شروع کر سکتے ہیں۔

خاندان کے لیے بیوی کے گذشتہ خدمات۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ غیر شریفانہ طلاق، گھر کی مقدس مرکزیت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ خود عورت کے لیے بہت سے مشکلات پیدا کرتی ہے ہے جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک خاتون جو کئی برس تک خلوص و محبت کے ساتھ ایک مرد کے ساتھ اس کے گھر میں اپنے اور اس کے درمیان دوئی چھوڑ کر رہتی اور اس گھر کو آشیانۂ راحت سمجھتی ہے۔ اس گھر کو آباد و شاد رکھنے کے لیے اپنی پوری قوت و محنت صرف کرتی ہے۔ اصطلاح جدید کی بنا پر شہر کی ترقی پسند خواتین کے علاوہ عام طور پر خواتین گھر کے کام کاج کرتی اور کھانے، پہننے، گھر کا خرچ چلانے میں دکھ اٹھاتی اور کفایت شعاری سے کام لیتی ہیں، فقط بچت کی خاطر شوہروں کو خادم نوکر رکھنے سے ناراض کر دیتی ہیں۔ اپنی صحت و سلامتی، جوانی اور طاقت گھر، آشیانے اور جھونپڑے، بلکہ اپنے شوہر پر نثار کر دیتی ہیں۔ فرض کریں، ایسی بیوی کو برسوں ایک ساتھ

زندگی بسر کرنے کے بعد، نئی دولھن کے شوق میں کوئی شوہر طلاق دے مارے، اور اسی گھر میں جسے خوش وخرم رکھنے کی خاطر اس نے اپنی عمر و جوانی وسلامتی و تمناؤں کی دنیا لٹائی تھی اب دوسری بیوی لانا چاہے اور اس سے عیش پرستی و ہوس رانی دکھائے تو بتلایئے ایسے عمل کی ذمہ داری کیا اور کس پر ہے؟

یہاں اس پر بحث نہیں ہے کہ گھریلو زندگی کی مرکزیت درہم برہم ہو رہی ہے، شادی کا رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ جو آپ جواب دیدیں کہ شوہر کی غیر شریفانہ روش شادی کی موت ہے اور غیر شریف آدمی کے سر کسی عورت کا تھوپا جانا، عورت کی فطری منزلت و مقام کے شایان شان نہیں۔

یہاں زیر نظر بات ہے، آوارہ و بے آشیاں ہونے کی، اپنا سجا سجایا بسیرا رقیب کے حوالے کرنے کی، دکھ درد، زحمت و خدمت ضائع ہونے کی بات پر گفتگو ہے۔

شوہر، گھر کی مرکزیت، شعلۂ حیات خاندان کا بجھنا، جہنم میں جائے۔ آخر، ہر انسان آشیانے اور رین بسیرے کا محتاج ہے، پھر وہ بسیرا جسے اپنے ہاتھوں بنایا اور بسایا اس انس خاطر تو ہوتا ہے۔ اگر کوئی پرندہ اپنے بنائے ہوئے گھونسلے سے نکال دیا جائے تو کچھ نہ کچھ مزاحمت تو کرتا ہے۔ کیا عورت کو اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے گھر، اپنے آشیانے کے لیے مزاحمت کرے؟ کیا یہ عمل مرد کی طرف کھلی ستم گری نہیں ہے؟ اسلام نے اس دقت کے لیے کیا حل تجویز کیا ہے؟

ہمارے عقیدے میں تو اس مشکل کی طرف پوری طرح دھیان دینا چاہیے۔ اکثر غیر شریفانہ طلاق سے جو پریشانیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا زاویہ یہی ہے۔ ان مقامات پر طلاق، خاتمۂ نکاح نہیں، عورت کی ٹوٹ پھوٹ اور نابودی ہے۔

گذشتہ سوال کے ضمن میں اشارہ ہو چکا ہے کہ گھر یا آشیانے کا مسئلہ طلاق سے جدا ہے، یہ دو الگ الگ باتیں ہیں، ان دونوں کو الگ الگ ہی رکھنا ہوگا۔ اسلام

کے نقطۂ نظر اور اسلامی ضابطوں کے لحاظ سے یہ مسئلہ حل شدہ ہے۔ اس کے باوجود جو مشکلات ہیں وہ اسلامی ضابطوں سے ناواقفیت اور شوہروں کے غلط طریقے سے فائدہ اٹھانے، یا بیوں کی خوش بینی و وفاداری کے ردّ عمل سے پیدا ہوئے ہیں۔

یہ مصیبت اس وقت شروع ہوئی جب اکثر میاں بیوی یہ سمجھ بیٹھے کہ بیوی اپنے شوہر کے گھر میں جو کام کاج کرتی ہے اور اس کے جو فوائد ہوتے ہیں وہ شوہر سے متعلق ہیں۔ بلکہ گمان یہ کیا جاتا ہے کہ شوہر کا حق ہے کہ بیوی کو لونڈی یا مزدور سمجھ کر حکم دیا کرے اور بیوی پر واجب ہے کہ ان معاملات میں شوہر کی اطاعت کرے۔ درآں حالیکہ میں کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ بیوی کام کاج میں پوری طرح آزاد ہے۔ اور جو کچھ وہ کرے گی وہ خود اپنی ذات کے لیے ہوگا، مرد کو ایک مالک کی طرح بیوی کے سامنے آنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام نے عورت کو اقتصادی آزادی کے علاوہ اس کے اور اولاد کے اخراجات شوہر کے ذمہ واجب کیے ہیں۔ بیوی کو اچھی خاصی مہلت دی ہے کہ وہ آبرومند زندگی کے لیے روپیہ پیسہ اور امکانات حاصل کرے کہ اگر طلاق و جدائی کا وقت آپڑے تو شوہر سے بے نیاز اور پریشانی سے آزاد ہو۔ عورت اپنے رین بسیرے کو رونق دینے کے لیے جو کچھ جمع کرے وہ اپنی سمجھے، مرد کو اسے چھیننے کا حق نہیں ہے۔ مذکورہ پریشانیاں اس سماج میں ہوتی ہیں جہاں بیوی کو میاں کے گھر میں بہرحال کام کاج کرنے کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کی محنت کے نتائج شوہر کی ملکیت ہیں، بیوی کا اس سے کیا واسطہ۔ فکرمندی عوام کا تعلق ان کی لاعلمی اور قانون اسلام سے بے خبری سے ہے اور کچھ نہیں۔

دوسری وجہ، شوہر کا اپنی بیوی اور اس کی وفاداری سے غلط فائدے اٹھانا ہے۔ کچھ خواتین اپنے شوہروں کے یہاں قانون اسلام سے بے خبری کی بنا پر نہیں، صرف شوہروں پر بھروسہ رکھنے کی وجہ سے جاں نثاری کرتی ہیں۔ ان کا دل چاہتا ہے کہ دونوں میں من و تو، اپنا پرایا نہ رہے۔ یہ پیسہ ہمارا، یہ ان کا ہے، اچھا خیال نہیں

سمجھتیں۔ لہذا، اسلام کے دیے ہوئے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی طرف دھیان نہیں دیتیں، اچانک جو آنکھیں کھلتی ہیں تو محسوس کرتی ہیں کہ ایک بے وفا سے محبت کرکے اور جاں فدا کرکے ان مہلتوں سے فائدہ اٹھانے کا وقت ہاتھ سے کھو دیا۔

اس قسم کی خواتین کو شروع سے دھیان دینا چاہیے کہ محبت کا موقع وہ ہے جہاں "دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی" اگر بیوی مال جمع کرنے، دولت اکٹھا کرتے، آشیانہ بناتے، بسیرا سجانے میں اپنا نام نظر انداز کرتی اور اپنا حق شرعی مرد کے لیے چھوڑتی، اپنی قوت مرد کو ہدیہ دیتی ہے تو شوہر کو بھی اسی انداز سے ردّ عمل دکھانا چاہیے:

"واذا حییتم بتحیۃ فحیّوا باحسن منہا او ردّوھا"

اور جب تمہیں ہدیہ دیا جائے تو تم بھی اس سے اچھا ہدیہ دو یا اسی کو واپس کر دو۔

یعنی اگر بیوی کوئی ہدیہ پیش کرتی ہے تو لے اسی معیار ہی کا سہی کوئی ہدیہ بیوی کو بھی نذر کرنا چاہیے۔ وفادار شوہروں کا ہمیشہ یہ دستور رہا اور آج بھی ہے کہ بیوی کی مخلصانہ فداکاری کے جواب میں قیمتی ہدیے، مکان یا اثاثہ اپنی بیوی کو نذر کیا کرتے ہیں۔

بہرحال آشیانہ اجڑنے اور بے گھر ہونے کا، قانونِ طلاق سے کوئی تعلق نہیں، قانونِ طلاق کی تبدیلی اس کی اصلاح نہیں کر سکتی، اس مسئلہ کا تعلق عورت کی اقتصادی آزادی سے ہے اور اسلام نے اسے حل کر دیا ہے۔ ہمارے سماج میں یہ مشکل کچھ عورتوں کی اسلامی تعلیمات سے بے خبری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے یا پھر دوسرے گروہ کی غفلت و سادہ لوحی کا نتیجہ ہے۔ خواتین کو اگر معلوم ہو کہ اسلام نے ان کے لیے کیا مواقع انھیں دیے ہیں۔ اور شوہر پر جاں نثاری میں سادہ لوحی کا مظاہرہ نہ کریں تو مشکل خود بخود حل ہو جائے۔

طلاق

(آزادی۔ اور حق)

(۵۰)

مطالعہ کرنے والے کو یاد ہوگا، ہم نے بائیسویں فصل میں طلاق سے پیدا ہونے والے سماجی مشکلات دو پہلوؤں سے بیان کیے ہیں۔ ایک غیر شریفانہ طلاق کا رخ تو شوہر کی غیر شرافت مندی و غیر انسانی رویہ جو طلاق دلواتا ہے۔ دوسرے، کچھ شوہر کا یہ رویہ کہ بیوی کو سزا دی جائے وہ غیر شریفانہ طور پر طلاق نہیں دیتے، ان کا مقصد اس زوجہ کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے زندگی بسر کرنے کا ہوتا ہی نہیں۔

دو فصل پہلے حصہ اوّل پر بحث ہو چکی، وہاں کہا ہے کہ اسلام ہر قسم کی غیر شریفانہ طلاق کو روکنے والے انتظامات کی حمایت کرتا ہے۔ ایسے طلاق کے لیے خود اسلام نے بھی رکاوٹوں کی تدبیریں کی ہیں۔ اسلام خاندانی تعلقات میں قوت استعمال کرنے اور زور آوری کے ذریعے فائدہ اٹھانے کے خلاف ہے۔

ان معروضات سے واضح ہو گیا کہ اسلام کی نظر میں اسلام ایک "زندہ ادارہ" ہے۔ اسلام کوشش کرتا ہے کہ یہ زندہ موجود اپنی زندگی باقی رکھے، مگر جب یہ زندہ موجود، مر جائے تو اسے افسوس کی نظر سے دیکھتا اور دفن کی اجازت جاری کرتا ہے وہ اس مردے پر قانون کی مومیائی نہیں چڑھانا چاہتا تاکہ وہ حنوط شدہ لاش کو متحرک اور اٹھائے پھرا جائے۔

شوہر کو حقِ طلاق دینے کی علت و وجہ معلوم ہو گئی۔ یعنی میاں بیوی کا رشتہ

ایک فطری علاقہ مندی ہے۔ اس کی خاص ٹکنیک ہے۔ اس مشینری کو مضبوط بنانے اور اسے بیکار کرنے کی دونوں کنجیاں تخلیق نے مرد کو عطا کی ہیں۔ میاں بیوی دونوں بجائے خود تخلیق کی بنیاد پر خاص پوزیشن کی مالک ہیں۔ جن کا بدلنا یا بالکل ایک جیسا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ خاص وضع اور پوزیشن اپنی باری پر متعدد امور کی علت و سبب بنتی ہیں۔ جیسے حق طلاق۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کی علت (خاص وجہ) میاں بیوی کا خاص کردار ہے۔ محبت و عشق و رشتہ زن و شوہری ہیں۔

حقِ طلاق۔ مرد کے خاص کردار کا نتیجہ ہے، اس کا تعلق عشق سے ہے، مالکیت سے نہیں۔

اس موقع پر آپ مخالفین اسلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ اسلام نے مرد کو حقِ طلاق اس وجہ سے دیا ہے کہ وہ عورت کو ارادہ و خواہش و آرزو کا مالک نہیں جانتا، اسلام عورت کو "چیز" سمجھتا ہے "شخص" نہیں مانتا۔ اسلام شوہر کو بیوی کا مالک جانتا ہے، اسے حق دیتا ہے، جب چاہے اپنے مملوک کو آزاد کر دے۔ کیونکہ:

النّاس مسلّطون علیٰ اموالھم

لوگ اپنے مال کے مالک و مختار ہوتے ہیں۔

ہماری گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ منطقِ اسلام شوہر کی مالکیت اور بیوی کی مملوکیت پر مبنی نہیں ہے۔ اسلام کی منطق و اسلام کا فلسفہ ان نکتے والوں کی فہم سے زیادہ عمیق اور ان کی ذہنی سطح سے زیادہ بلند ہے۔ اسلام نے گھر کی تعمیری بنیاد اور اس ادارے کی اساس، اس کے نکات اور رمز وحی کے اشاروں سے معلوم کیے اور ان کا سراغ لگایا ہے۔ اب چودہ سو برس بعد علم ان کی گہرائیوں کے قریب پہنچ رہا ہے۔

طلاق، اس لیے آزادی ہے کہ شادی کی فطری حقیقت "رفاقت" ہے۔

کبھی کبھی یہ کہتے ہیں :-
طلاق میں آزادی (چھوڑنے) کا انداز کیوں ہے ؟ اسے یقیناً فیصلے کا رنگ ملنا چاہیے !

ان سے کہا جائے :

طلاق آزادی و رہائی اس لیے ہے کہ ازدواج و شادی رفاقت ہے۔ اگر آپ تمام اجناسِ نر و مادہ سے "جوڑے" کے اس قانون (فطرت) کو بدل سکیں، اور ازدواج (جوڑے پن) کی فطری ساخت کو رفاقت کے قالب سے نکال لیں، اگر آپ سے یہ ہو سکے کہ جنس نر و جنس مادہ کو۔ انسان ہو یا حیوان۔ ایک کو دوسرے جیسے اثرات دے دیں اور قانونِ فطرت بدل ڈالیں، تو پھر طلاق کو بھی "رہائی" کے قالب سے نکال دیجیے۔

ان عناصر میں سے ایک نے لکھا :

عقدِ ازدواج کو شیعہ فقہا عموماً "عقدِ لازم" شمار کرتے ہیں، بظاہر ایران کا سول لا۔ قانونِ مدنی۔ بھی "عقد لازم" ہی جانتا ہے۔ لیکن میں یہ کہنا چاہوں گا کہ فقہِ اسلامی اور قانونِ مدنیِ ایران کے مطابق عقد نکاح فقط عورت کی جہت سے لازم ہے، مرد کی نسبت سے "جائز عقد" ہے کیونکہ مرد جب چاہے مذکورہ عقد کو ختم کر دے۔"

اس کے بعد فرماتے ہیں :

"عقد ازدواج مرد کی نسبت سے جائز اور عورت کی نسبت سے لازم ہے ایک لاقانونیت کی بات ہے۔ یوں عورت کو مرد کا اسیر و قیدی بنا دیا گیا ہے۔ میں، دفعہ ۱۱۳۳، (قانونِ مدنی کشورِ شہنشاہی ایران) کے "قانون حق مرد لبطلاق"

کا مطالعہ کرتے وقت، ان ایرانی خواتین سے شرمندگی محسوس کرتا ہوں، جو اس ایٹم کی صدی میں، چاند اور ڈیماکریسی کے دور میں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ رہی (وہ اس قانون کے بارے میں کیا کہیں گی!)

پہلے تو یہ حضرات ایک واضح بات نہیں سمجھ سکے۔ طلاق، فسخ نکاح سے مختلف چیز ہے یہ کہنا کہ "عقدِ ازدواج" فطرتاً لازم (بندھن) ہے" یعنی میاں بیوی میں سے کسی کو حقِ فسخ نہیں۔ چند مقامات مستثنیٰ ہیں۔ اگر عقدِ نکاح فسخ ہو جائے تو اس کے تمام اثرات بھی ختم ہو جائیں گے۔ مثلاً۔ مہر ختم ہو جائے گا، بیوی کو مہر طلب کرنے کا حق نہ رہے گا یا پھر عدت کے دنوں کا نفقہ نہیں ہوگا۔ طلاق کی صورت اس سے مختلف ہے۔ یہاں زوجیت کا رشتہ ٹوٹنے کے بعد بھی عقد کے اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوتے۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون سے شادی کرے اور فرض کیجئے پانچ سو ہزار روپے مہر طے کرے، ایک دن میاں بیوی کی طرح رہ کر طلاق دے دے۔ اسے پورا مہر دینا ہوگا اور عدت کے دنوں کا نفقہ بھی ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ دیکھیے کہ مرد عقد کرتا اور میاں بیوی کے عمل سے پہلے بیوی کو طلاق دیتا ہے، یہاں آدھا مہر ادا کرنا ہوگا، اور چونکہ اس عورت پر عدہ واجب نہیں لہذا نفقہ طبعی طور پر واجب نہ ہوگا۔ تو یہ معلوم ہو گیا کہ طلاق سے نکاح کے تمام اثرات ختم نہیں ہوتے، درآنحالیکہ اگر مذکورہ نکاح فسخ ہو جائے تو بیوی کا حقِ مہر باقی نہیں رہتا۔ لہذا طلاق اور ہے فسخ اور ہے۔ حقِ طلاق اور عقدِ ازدواج کے لازمی ہوتے میں کوئی منافات و فرق نہیں ہے۔ اسلام کے پاس دو مدین ہیں۔ ایک فسخ اور دوسری مد طلاق ہے۔ فسخ کا حق وہاں دیا ہے، جہاں کچھ عیب میاں بیوی میں ہوں۔ حقِ فسخ شوہر کو بھی حاصل ہے، بیوی کو بھی ہے۔ بخلاف حقِ طلاق کے۔ جب گھریلو زندگی مردہ و بے جاں ہو جائے تو صرف مرد کو حق ہے وہ طلاق دے کر اس صورتِ حال کو ختم کر دے۔

اسلام نے طلاق کی مد فسخ سے الگ رکھی ہے اور طلاق کیلئے الگ ضابطے وضع کیے ہیں۔
نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فلسفۂ اسلام میں مرد کو طلاق کا اختیار اس کے لیے کوئی خصوصیت و اعزاز نہیں ہے۔

ان حضرات سے کہنا چاہیے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں، اور مصنوعی چاند کے دور سے شرمندہ نہ ہوں، بہتر یہی ہے کہ ذرا سبق لیں۔ فسخ و طلاق کا فرق سمجھ لیں۔ اسلام کے معاشرتی فلسفہ کا ادراک حاصل کریں یہ فلسفہ گہرا بھی ہے اور گھریلو معاشرے کے واسطے مفید بھی ہے اس کی واقفیت سے آپ شرمندگی کے بجائے گردن اٹھا کر ان کے سامنے سے گذر سکیں گے۔ افسوس۔ جہالت، دردِ لا دوا ہے۔

طلاق کا جرمانہ

دنیا کے کچھ قوانین میں طلاق کو روکنے کی خاطر جرمانہ بھی رکھا گیا ہے۔ آج کی دنیا میں تو ایسے قانون کا مجھے تو علم نہیں مگر روم کی مسیحی شہنشاہی میں، بغیر کسی معقول وجہ کے بیوی کو طلاق دینے کی سزا موجود تھی۔

روشن حقیقت یہی ہے کہ جرمانہ "گھریلو زندگی" کی ہلتی نیو کو مضبوط کرنے میں قانون کے زور سے بھی فائدہ رساں نہیں۔ ہاں، ایک قسم کا فائدہ اندوزی ضروری ہے

اگر حق طلاق بیوی کو تفویض ہو؟

اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ کہ یہاں تک ہماری گفتگو یہی رہی کہ "فطری حق کے طور پر" طلاق کا تعلق شوہر ہی سے ہے۔ رہی یہ بات کہ آیا شوہر مطلقاً ہمیشہ اور ہر جگہ۔ یا خاص صورت میں اپنی طرف سے بیوی کو وکیل بنا کر حق طلاق دے سکتا ہے؟ یہ بات فقہِ اسلام بھی منظور کرتی ہے اور "قانون مدنی ایران" میں بھی صاف صاف درج ہے۔ ضمناً، شوہر کو اپنی وکالت بیوی کو دینے کے بعد لے واپس لینے سے روکنے کی خاطر "وکالتِ بلا عزل" کا ضابطہ بھی رکھا ہے۔ عقد لازم میں یہ

وکالت ضمنی شرط کے طور پر دی جاتی ہے۔ اس شرط کے بعد بیوی، مطلقاً، یعنی ہر وقت اور ہر جگہ یا صرف پہلے سے معین شدہ اور طے کردہ صورتوں میں اپنے تئیں مطلقہ بنا سکتی ہے۔

مدتوں سے یہ قاعدہ چلا آرہا ہے کہ جو بیویاں اپنے شوہروں سے شروع ہی سے متردد ہوتی ہیں وہ "شرط ضمن العقد" کے طور پر حق طلاق محفوظ کر لیتی ہیں اور بوقت ضرورت اس سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔

فقہ اسلام کی رو سے، فطری طور پر حق طلاق تو نہیں رکھتی لیکن معاہدے کے طور پر یعنی "شرط ضمن عقد" کی صورت میں یہ حق حاصل کرنا ممکن ہے۔

قانون مدنی، دفعہ ۱۱۱۹ ہے:

"عقد ازدواج کے دونوں فریق، ہر وہ شرط طے کر سکتے ہیں جو عقد مذکور کے تقاضوں کے خلاف نہ ہو۔ ایسی شرط عقد ازدواج یا عقد لازم میں رکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً یہ شرط کر لی جائے کہ شوہر جب بھی دوسری شادی کرنا چاہے گا، یا اس مدت کے درمیان غائب ہو جائے گا، یا ترک نان و نفقہ کرے گا، یا بیوی کے قتل کی تدبیر کرے گا، یا ایسی بدسلوکی سے پیش آئے گا جس سے دونوں کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے تو بیوی وکیل در وکیل ہے کہ شرط پوری ہوتے ہی محکمے میں دعویٰ ثابت کرنے کے بعد اپنے تئیں مطلقہ بنا لے"

آپ نے ملاحظہ فرمایا، جو لوگ کہتے ہیں کہ فقہ اسلام اور قانون مدنی ایران میں طلاق کو ایک طرفہ حق قرار دیا گیا ہے۔ یہ حق صرف مرد کو حاصل ہے اور بیوی سے بالکل چھین لیا گیا ہے صحیح بات نہیں ہے۔

فقہ اسلامی کے نقطۂ نظر، اور قانون مدنی ایران کے زاویے سے، حق طلاق فطری طور پر نہیں مانا گیا ہے، البتہ ایک معاہداتی اور تفویض شدہ حق موجود ہے۔

اب وہ منزل آگئی ہے کہ ہم بحث کے دوسرے حصے پر گفتگو شروع کریں یعنی بعض مردوں کا غیر شریفانہ وظالمانہ انداز سے طلاق نہ دینے کا موضوع۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے اس مشکل کا حل نکالا ہے؟ واقعاً کہ بات بہت پریشانی کی ہے۔ اس مدعا پر گفتگو کا عنوان ہے "عدالتی طلاق" جسے ہم شروع کرنے سے پہلے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں کہ پہلے مسئلہ پر بات ذرا لمبی ہوگئی۔

عدالتی طلاق

عدالتی طلاق یعنی شوہر کے ذریعے کے بغیر، قاضی یا جج کے ذریعے جاری ہونے والی طلاق۔

دنیا کے اکثر قوانین میں، طلاق کا اختیار قاضی کو حاصل ہے۔ عدالت ہی طلاق دے سکتی ہے وہی زوجیت کی گرہ کھلنے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس رائے کے بموجب تمام طلاق عدالتی ہی ہیں۔ ہم گذشتہ مقالات میں روحِ ازدواج اور خاندانی مرکزیت کا مقصد اور گھریلو ماحول میں بیوی کا درجہ بیان کرتے ہوئے مذکورہ بالا رائے کی تردید کر چکے ہیں۔ ہم نے ثابت کیا ہے کہ جو طلاق اپنی فطری راہ سے منزل تک آتے ہیں وہ قاضی سے وابستہ نہیں کیے جا سکتے۔

سردست ہماری بحث یہ ہے کہ کیا اسلام کی نظر میں قاضی۔ سخت و سنگین شرائط قضاد و قاضی کے باوجود۔ کسی صورت حال میں طلاق جاری کرنے کا حق نہیں رکھتا؟ یا ایسے خصوصی حالات ہیں جہاں قاضی کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے؟ اگرچہ وہ حالات استثنائی اور بہت ہی کم کیوں نہ ہوں۔

طلاق، مرد کا طبیعی حق ہے بشرطیکہ، بیوی سے تعلقات کی رفتار فطرت کے مطابق طے ہوں۔ میاں بیوی کی فطری روابط کی رفتار کا تقاضہ اگر باہم زندگی گذارنا ہے تو اس کی بخوبی نگہداشت کرے اور اچھی طرح خیال رکھے، حقوق ادا کرے۔ حسنِ معاشرت و حسن سلوک سے پیش آئے۔ اور اگر بیوی کی رفاقت کا خیال نہیں تو حسن و خوبی سے طلاق دیدے، یعنی بے طلاق اسے نہ چھوڑے۔ اور اس وقت بھی حقوقِ

واجب کے علاوہ ایک اضافی رقم بطور شکریہ لیے پیش کرے۔

قرآن مجید کا حکم یہی ہے:

ومتّعوھنّ علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ

(البقرہ/۲۳۶)

ان کو مال ومتاع دو خوش حال شوہر اپنی حیثیت اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق۔

اس کے ساتھ ہی اس رشتے کے خاتمہ کا اعلان کردے۔

ہاں، اگر طبیعی رفتار طے نہ ہو، پھر کیا ہوگا؟ یعنی، ایک ایسا شوہر پیدا ہوجائے، جو زندگی بھی ایک ساتھ نہ گذارے، حسن سلوک بھی نہ رکھے۔ اسلام کی پسندیدہ، خوش نصیب گھرانے کی مرکزیت بھی نہ چاہے اور بیوی کا رشتہ بھی نہ توڑے تاکہ وہ اپنی راہ لے۔ یوں کہہ لیجئے کہ نہ تو فرائض شوہری پورے کرے اور بیوی کو راضی رکھنے کی کوشش کرے نہ طلاق دینے پر راضی ہو۔ یہاں کیا کرنا چاہیے؟

طلاق، فطری انداز سے ولادت کا عمل ہے، جو اپنی طبیعی رفتار سے چلتا ہے لیکن شوہر کی طرف سے وہ طلاق جس میں نہ تو شوہر اپنی ذمہ داریاں نباہے، نہ طلاق پر تیار ہو۔ ایسا عمل ہے جیسے غیر طبیعی طور بچہ ہونے کا عمل جس میں، سرجن بچے کو شکم سے باہر لائے۔

کیا بعض شادیاں سرطان ہیں، بیوی جلتی رہے اور نباہتی جائے؟

دیکھنا ہے کہ اس طرح کی طلاق اور ایسے شوہروں کے بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا اس صورت حال کے باوجود یہی حکم دیتا ہے کہ طلاق کا عمل سو فی صد، شوہر کے ہاتھ میں ہے۔ اور جب تک ایسا شوہر طلاق پر راضی نہ ہو، بیوی جلتی اور نباہتی رہے۔ اسلام ایک ہاتھ دوسرے

کے ہاتھ میں دیے دورسے اس ظالمانہ رویے کو دیکھتا رہے ؟

بہت سے حضرات کا خیال یہی ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

اسلام کی نظر میں اس مرض کی کوئی دوا نہیں ، یہ ایک قسم کا سرطان ہے ، کبھی کبھی آدمی اس کا مریض ہو جاتا ہے اس کا علاج ہی نہیں ہے ۔ بیوی دکھ جھیلے اور ساتھ دے ، آخر چلتے چلتے ٹھنڈی ہو جائے ۔

میرے نزدیک یہ طرزِ فکر اصولِ اسلام سے قطعی طور پر متضاد ہے ۔ جو دین ہمیشہ عدل کا دم بھرتا ، "قیام بقسط" یعنی انصاف کا قیام اپنا نصب العین اور تمام پیغمبروں کا اساسی دستور بتاتا ہو ۔

"لقد ارسلنا رسلنا بالبیّناتِ وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم النّاس بالقسط ...." (القرآن الکریم ۔ سورۃ الحدید ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری تاکہ وہ لوگوں میں انصاف قائم کریں ۔

اس کے بعد کیسے ممکن ہے کہ وہی دین کھلم کھلا ظلم کا علاج نہ کرے ، کیا ممکن ہے کہ اسلام اپنے قوانین اس انداز سے وضع کرے جس کا نتیجہ یہ نکلے کہ ایک بے چارہ انسان سرطان کا دکھ جھیلے اور مرجائے ؟

افسوس کی بات ہے ، کچھ حضرات اقرار کرتے اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ اسلام "دین عدل" ہے ، اپنے تئیں ، عدلیہ فرقے میں شمار کرتے ہیں وہ اس طرح کا نظریہ رکھیں ؟!

اگر یہ طے کر لیا جائے کہ ظالمانہ قانون کو "سرطان" کا نام دے اسلام کے سر تھوپ دیں تو پھر کیا حرج ہے ایک اور ستم گرانہ قانون کو "ٹٹنس" اور تیسرے کو "سل" پھر چوتھے قانون کو "اعصابی فالج" جیسے نام دے کر معاف بھی کر دیں اور قبول بھی کر لیں ۔

اگر یہی بات ہے تو "اصلِ عدل" جو اسلامی قانون سازی کا بنیادی ستون

ہے وہ کہاں برقرار رہے گا۔

کہتے ہیں ۔ سرطان ۔ میں عرض کرتا ہوں ، بہت اچھا ، سرطان ہی، تو اگر کوئی بیمار سرطان میں مبتلا ہو جائے کیا اسے اہمیت نہ دی جائے ، اس کا علاج نہ کیا جائے ، فوری اقدامات کے ذریعے بیمار کی جان نہ بچائی جائے ۔

ایک خاتون ، زندگی بھر کے لیے کسی مرد کے ساتھ رہنے پر تیار ہوتی ہے ، اس کے بعد حالات پلٹا کھاتے ہیں ، اور معاملہ یہ آپڑتا ہے کہ شوہر اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ، اور ازدواجی زندگی کی خاطر نہیں ، بلکہ اسے دوسری شادی ، اور دوسرے رفیق حیات سے محروم رکھنے کی نیت سے بہ تعبیر قرآن مجید "معلقہ" کی طرح چھوڑ دیتا ہے کہ وہ ہوا میں لٹکی رہی ۔ واقعاً ایسی خاتون سرطان کی بیمار ہے ۔ مگر یہ سرطان وسرطان ہے جس کا بہ آسانی علاج ہو سکتا ہے ۔ اور بیمار ایک معمولی سے آپریشن کے بعد قطعی طور پر مکمل شفا حاصل کر سکتا ہے ۔ یہ آپریشن اور عمل جراحی حاکمان و قاضیان شرع کر سکتے ہیں ، جو خاص شرائط اور کوالیفیکیشن کے مالک ہوں ۔

ہم گذشتہ مقالات میں ، اشارے کر چکے ہیں کہ دو مشکلوں میں سے ایک مشکل و مصیبت جس سے ہمارا معاشرہ دوچار ہے ، وہ یہی ہے چند ظالم شوہر ، طلاق سے پہلو تہی کرتے ہیں ۔ اور اس عملِ بد کے لیے دین کا نام لیتے اور ظلم ڈھاتے ہیں ، پھر ان ستم ظریفوں پر اضافہ ان کا اندازِ فکر ہے وہ بھی دین و اسلام کے نام سے کہتے ہیں :

۔ عورت کو یہ ظلم ، لاعلاج سرطان سمجھ کر برداشت کرنا چاہیے ۔ اس سوچ نے ہر اسلام دشمن پروپیگنڈے سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے ۔

باوجودیکہ یہ بحث فنی (فقہی) اور ماہرانہ پہلو رکھتی ہے ، پھر ان مقالات کے دائرے سے باہر بھی ہے ۔ مگر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں تھوڑی سی گفتگو کرتا چلوں تاکہ بدبین افراد پر یہ روشن ہو جائے کہ اسلام ان باتوں کے علاوہ کچھ اور

رکھتا ہے۔

بند راستے: مسائل ازدواج وطلاق کے بند راستوں کی طرح کچھ اور مقامات بھی ہیں جہاں راہیں بند معلوم ہوتی ہیں مثلاً "مالی مسائل" ہیں۔ تو آئیے دیکھیں "ازدواج وطلاق" کے علاوہ، اور بھی جہاں راستے بند ہیں وہاں اسلام نے کیا کیا ہے؟ کیا اس راستے کو بند ہی رہنے دیا ہے۔ یا اسے راستے کی روک نہیں بننے دیا بلکہ کوئی حل نکالا ہے۔

فرض کریں، دو شخص ترکے یا اور طرح سے ایک ناقابل تقسیم چیز کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک موتی یا ایک انگوٹھی یا موٹر یا پینٹنگ ۔۔ دونوں مل کر اس سے فائدہ اٹھانے پر تیار نہیں، کہ ایک مرتبہ ایک لے جائے، دوسری مرتبہ دوسرا استعمال کرے۔ اس پر بھی تیار نہیں کہ ایک آدمی اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے، اس کے علاوہ بھی کوئی مفاہمت نہیں ہوتی۔ ہمیں معلوم ہے اس چیز سے فائدہ اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب دوسرے کی رضا حاصل ہو۔ ایسی جگہ کیا کریں؟ اس مال کو پڑا رہنے دیں کوئی فائدہ نہ اٹھائیں اور موضوع ناقابل حل، یا، ناقابل علاج حادثہ سمجھ کر اسے چھوڑ دیں؟ یا اسلام نے کوئی حل نکالا ہے؟

درحقیقت، فقہ اسلامی نے ان مسائل کو ناقابل حل مشکل کے طور پر کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔ حقِ مالکیت اور مال پر ایسا قبضہ جو مال کو بے استفادہ بنا دے۔ اسلام، ایسے شخص کا احترام نہیں کرتا، اور ایسے تمام مقامات میں جہاں مال کو بے فائدہ بنا دیا جائے فوراً اسلامی عدالت سے مداخلت کی درخواست دی جائے۔ حاکم شرع سے رجوع کے وقت اسے معاشرتی مسئلہ سمجھا جائے یا ایک اختلافی مسئلہ سمجھ کر قاضی اجازت دے دے کہ صاحبانِ حقوق کی باہمی چپقلش کے خلاف فیصلہ یہ ہے اور صحیح حل یوں ہوگا۔ مثلاً، زیرِ بحث مال دونوں مالکوں سے لے کر، کرایے

پر دے دیا جائے اور کرایے سے حاصل شدہ رقم، ان میں تقسیم کردی جائے۔ یا وہ مال بیچ کر قیمت، مالکوں میں بانٹ دی جائے۔ بہر حال حاکم یا قاضی شرع کا یہ اعتبار "دلیٔ ممتنع" کام یہی ہے کہ وہ اس قصے کی صحیح حلی تدبیر کرے۔ حاکم شرع کو اصل مالکان کی رضا لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

ایسے مقامات پر قانونِ حق مالکیت کی پرواہ کیوں نہیں کی جاتی؟ اس لئے اسے نظر انداز کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک دوسری "اصل" (قانون کلیہ) سے کام لیتے ہیں۔ یعنی اصل یہ ہے کہ مال ضائع ہونے اور قابل استفادہ نہ ہونے سے بچایا جائے۔ مالکیت، اور مالکان مال کے قبضے کی ایک حد تک رعایت کی جائے گی وہ حد یہ ہے کہ مال و دولت منجمد اور بے فائدہ نہ ہونے پائے۔

فرض کریں، وہ مال جس پر اختلاف ہو گیا ہو۔ موتی یا تلوار جیسی چیز، کوئی اس پر تیار نہ ہو کہ اپنا حصہ دوسرے کے ہاتھ بیچ ڈالے۔ دونوں اس پر تیار ہوں کہ اس چیز کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں اور ہر حصہ دار ایک حصہ اٹھالے، جھگڑا یہاں تک پہنچ جائے کہ مال کی قیمت و اہمیت ہی ختم ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ موتی یا تلوار یا موٹر کاٹ دی جائے تو بیکار ہو جائے گی۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے؟ نہیں کیوں؟ اس واسطے کہ مال کا ضیاع ہے۔

فقہاء اسلام میں درجۂ اول کے فقیہ، علامہ حلی کہتے ہیں کہ اگر مالک ایسا اقدام کرنا چاہیں تو حاکم اسلام انھیں روکے۔ ارباب دولت و مال کی باہمی موافقت اور ایسے کام پر ان کا سمجھوتہ تسلیم نہیں ہوگا اور انھیں اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

طلاق کا بند راستہ

اب دیکھیں مسئلہ طلاق میں کیا کیا جائے۔ ایک شخص تباہی خاندان کا سر میں سودا لیے ہو۔ اسلام کے عائد کردہ حقوق و فرائض ادا نہ کرنے پر تلا ہو۔ مالی ذمہ داریوں میں نفقہ، اخلاقی

فرائض ہیں، حسن سلوک، جنسی فرائض میں ساتھ رہن سہن اور ہم خوابی سے عہدہ برآ نہیں ہوتا۔ ایک بھی حق ادا نہ کرے یا کچھ ادا کرے کچھ نہ کرے۔ بہر حال بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتا، اب کیا کرنا چاہیے؟ اسلام کی نظر میں مورد کی اہمیت کے لحاظ سے کوئی اصل نافذ ہے جس کی بدولت حاکم یا قاضی شرع مداخلت کا حق رکھتا ہے جیسے مال کے معاملے میں اسے اجازت حاصل تھی۔ یا کوئی ایسی اصل موجود نہیں؟

آیت اللہ حلی کا خیال:

میں اس موقع پر سلسلۂ گفتگو آیت اللہ حلی مقیم نجف کے حوالے کرتا ہوں، موصوف ہمارے عہد کے علماء صفِ اوّل میں ہیں۔ انھوں نے "حقوق الزوجیہ" نامی رسالے میں اظہار نظر کیا ہے۔ حقوق زوجہ اور مرد کی رکاوٹ پر ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے:

"ازدواج ایک مقدس پیمان ہے۔ عین اسی وقت دو انسانوں میں شرکت اور دو فریقوں میں معاہدہ و مفاہمت ہے اور دونوں فریقوں کی خوش نصیبی و خوش حالی کی ضمانت بھی ان مفاہمتوں کی پابندی میں ہے پھر ان کی خوش حالی سے معاشرے کی خوش حالی بھی وابستہ ہے۔

"زوجہ کے اہم حقوق ہیں نان و نفقہ و لباس، ہم خوابی و حسن معاشرت و حسنِ اخلاق۔

اگر زوجہ کے حقوق کی ادائگی میں شوہر غفلت کرے اور طلاق بھی نہ دے تو بیوی کا حق کیا ہے؟ وہ شوہر سے کیونکر مقابلہ کرے؟

یہاں دو راہیں ہیں۔ ایک تو حاکم شرع کا حق مداخلت ہے۔ وہ طلاق جاری کر کے قصہ تمام کرے دوسری بات یہ ہے کہ بیوی اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کرے اور شوہر سے کیے ہوے معاہدات کی پابندی چھوڑ دے۔

آیات و احادیث

پہلا نکتہ یعنی حاکمِ شرع کی مداخلت، دیکھنا ہوگا کہ ایسے مواقع پر کون سی "اصل" اور اس اقدام کو جائز قرار دینے والی وجہ جواز حاکمِ شرع کے واسطے کیا ہے؟

قرآن، سورۂ بقرہ میں ہے:

الطّلاق مرّتان، فامساكٌ بمعروف او تسريحٌ باحسان۔ (القرآن۔ البقرہ/۲۲۹)

حقِ طلاق (و رجوع) دو مرتبہ سے زیادہ نہیں اس کے بعد مناسب انداز میں گھر آباد رکھا جائے یا نیکی کے ساتھ رہائی دی جائے۔

اسی سورۂ بقرہ میں ہے:

واذا طلّقتم النساءَ فبلغن اجلهنّ فامسكوهنّ بمعروف او سرّحوهنّ بمعروف ولاتمسكوهنّ ضرارا لتعتدوا ومن يفعل ذٰلك فقد ظلم نفسه۔ (القرآن الكريم۔ البقرہ/۲۳۱)

اور جب بیویوں کو طلاق دو اور ان کا عدّہ تمام ہوجائے تو یا انھیں اچھی طرح آباد رکھو یا اچھے انداز میں ان کا راستہ چھوڑ دو۔ اور انھیں ایذا رسانی کے لیے پابند نہ کرو کہ ستم ڈھاؤ اور جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے اوپر ستم کرتا ہے۔

ان آیات سے ایک "اصلِ کلّی" کا استفادہ ہوا۔ یعنی ہر شوہر گھریلو زندگی میں دو میں سے ایک رویّہ پسند کرلے۔

الف ۔ تمام حقوق و فرائض بحسن و خوبی انجام دے۔ امساک بمعروف اچھے انداز میں نگہداشت۔

ب ۔ زوجیت کا رشتہ توڑ دے، بیوی کو آزادی دے۔ تسریح باحسان

نیکی کے ساتھ رہا کرنا۔

رہا تیسرا رویّہ کہ بیوی کو طلاق نہ دینا، پھر اسے آباد نہ رکھنا ربط وضبط توڑ لینا یہ نقطہ نظر اسلام میں وجود نہیں رکھتا۔ "ولا تمسکوھنّ ضراراً لتعتدوا (ان کو ضرر دینے کے لیے نہ روکو کہ ان پر ظلم کرسکو) اسی رویّے کی نفی کرتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس جملہ کا مفہوم زیادہ عام ہو۔ یعنی ان رویّوں کی بھی ممانعت ہے جہاں شوہر عمداً کوتاہیاں کرتا ہے کہ بیوی کی زندگی اجیرن ہوجائے۔ اور ان رویّوں کو بھی برا کہا گیا ہے جہاں اگر شوہر جان بوجھ کر نقصان وضرر نہ پہنچائے لیکن بیوی کا گھر میں رہنا اور ساتھ رکھنا بیوی کے لیے سراسر زیاں ہو۔

یہ آیات، نازل تو ہوئی ہیں عدّہ و رجوع و عدمِ رجوع شوہر کے بارے میں یعنی مرد کی ذمہ داری واضح کی جارہی ہے کہ طلاق کے بعد بیوی سے رجوع کسی معقول بنیاد پر ہونا چاہیے، رجوع اس لیے ہو کہ اب بیوی کو اچھی طرح رکھے گا۔ رجوع کا مقصد بیوی کی اذیت رسانی نہ ہو، مگر مطلب اسی میں منحصر نہیں ہے۔ بلکہ یہ آیات "اصل وکلیہ" بتاتی ہیں۔ اس سے ہر وقت اور ہر حال میں حقّ زوجہ واضح ہوتا ہے۔ یعنی شوہر مکمل طور پر زندگی میں دو رویوں میں سے ایک کو پسند کرلے۔ کوئی تیسرا طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔

بعض فقہا اسی مقام پر لغزش سے دوچار ہوئے ہیں وہ سمجھ بیٹھے کہ ان آیتوں کا تعلق مردوں سے ہے کہ وہ طلاقِ رجعی میں رجوع کریں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ آیتیں تمام شوہروں کو بیویوں کے متعلق فرائض کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس بات پر ہماری دلیل سیاق وسباقِ آیات کے علاوہ یہ ہے کہ ائمہ طاہرین علیہم السلام نے موضوعِ طلاق کے علاوہ بھی ان آیتوں کو استدلال میں پیش کیا ہے۔

مثلاً:

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

ایلاء کرنے والا۔ جو شوہر اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کرنے کی قسم کھالے۔ چار ماہ بعد جبراً قسم توڑے اور کفارہ دے یا بیوی کو طلاق دے۔ کیونکہ اللہ عزاسمہ نے فرمایا ہے:

"امساک بمعروف او تسریح باحسان"

امام جعفر صادق علیہ السلام کے حضور میں مسئلہ عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی نے ایک شخص کو اپنا وکیل بنا کر ایک عورت سے مہر طے کرکے نکاح پڑھنے کو کہا اس شخص نے یہ خدمت انجام دی لیکن مؤکل نے اپنی وکالت سے انکار کردیا۔ امام نے فرمایا: ٹھیک ہے اس خاتون پر کوئی پابندی نہیں ہے وہ اپنے لیے دوسرا شوہر اختیار کرے، لیکن اگر اس شخص نے واقعاً وکیل بنایا تھا اور جو عقد ہوا وہ وکالت کی بنیاد پر ہوا، تو اس شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے اور خدا کے درمیان معاملہ صاف کرے اور اس عورت کو طلاق دیدے۔ کیونکہ قرآن میں ہے: فامساک بمعروف او تسریح باحسان" ان روایات سے معلوم ہوا کہ ائمہ طاہرین آیت مذکورہ کو "اصل کلی" سمجھتے تھے اور خاص مورد میں منحصر نہیں جانتے تھے۔

جب شوہر نہ فرائض ادا کرتے نہ طلاق دے تو حاکم شرع اسے طلب کرے اور پہلے تو اسے طلاق کا حکم دے اگر وہ طلاق جاری نہ کرے تو خود حاکم شرع طلاق جاری کرے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بروایت ابو بصیر مروی ہے کہ امام نے فرمایا: جو شخص اپنی بیوی کو لباس و نفقہ نہ دے مسلمان کے امام پر واجب ہے کہ ان دونوں کو (طلاق کے ذریعے) الگ کردے۔"

درجۂ اوّل کے ایک ہم عصر فقیہ کے فرمودات کا یہ خلاصہ آپ نے ملاحظہ فرمایا مزید تفصیلات کے لیے موصوف کے درس کی تقریروں کا مجموعہ "حقوق الزوجیہ" ملاحظہ کریں۔

آپ نے غور کیا۔ "امساک بمعروف او تسریح باحسان"۔ ایک اصل اور قاعدۂ کلی ہے جسے قرآن مجید نے "حقوق زوجیت" دائرہ مقرر کرنے کے لیے وضع کیا ہے، لہٰذا مذکورہ اصل نیز "ولا تمسکوھن ضرارا لتعتدوا" کے اضافے سے کوئی حق باقی نہیں رہتا کہ خوف خدا نہ رکھنے والا شوہر اپنے غلط فائدہ اٹھائے۔ یعنی کسی خاتون کو صرف ستانے اور دوسری شادی سے روکنے کی خاطر طلاق دیے بغیر معلق رکھے اور خود بھی اس سے رشتہ نہ رکھے۔

دوسرے دلائل وشواہد

رسالہ "حقوق الزوجیہ" میں بیان شدہ دلائل کے علاوہ اور بھی شواہد و دلائل سے تائید ہوتی ہے کہ:

امساک بمعروف او تسریح باحسان

اسلام کے نزدیک ایک اصلِ کلی ہے، اسی کے دائرے میں حقوقِ زوجیت کی نگہداشت ہونا چاہیے۔ اس مفہوم آیت پر جس قدر غور کیا جائے اسی قدر مطلب روشن سے روشن تر اور دینِ مبینِ اسلام کے ضابطے مستحکم ہوتے نظر آئیں گے۔

الکافی، جلد ۵، صفحہ ۵۰۲ پر امام جعفر صادق علیہ السلام کی روایت ہے حضرت نے فرمایا:

اذا اراد الرّجل ان تزوّج المرأۃ فلیقل:
اقررت بالمیثاق الذی اخذ اللّٰہ: امساک بمعروف او تسریح باحسان

جب کوئی آدمی شادی کرنا چاہے تو کہے: اللہ نے جو مجھ سے پیمان لیا ہے میں اس کی تجدید کرتا ہوں اور وہ ہے کہ بیوی مناسب طریقے

سے رکھوں گا یا نیکی کے ساتھ طلاق دیدوں گا۔

آیت ۲۱، سورۃ النساء میں ہے:

وکیف تاخذونه وقد افضیٰ بعضکم الی بعض و اخذن منکم۔

اور تم بیویوں کو دیے ہوئے مہر (زور اور سختی کرکے) واپس کیوں لیتے ہو، حالانکہ ایک سے دوسرے کے پاس جا چکا اور دونوں ایک دوسرے سے کام بھی لے چکے، اور بیویوں نے تم سے تو سخت قول وقرار لے لیے ہیں۔

شیعہ اور سنّی مفسرین کہتے ہیں "پیمانِ استوار" وقول وقرار سے مراد امساک بمعروف اور تسریح باحسان ہے۔ یہی خدا کا پیمان ہے جو مردوں سے لیا گیا ہے۔ یعنی وہ عہد جس کے بارے میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے تاکید فرمائی کہ شادی کے وقت مرد کو اعتراف واقرار کرنا چاہیے کہ بیوی کی مہذّب انداز سے نگہداشت رکھے گا یا حسن وخوبی کے ساتھ چھوڑ دے گا۔

حج وداع کے موقعہ پر حضرت رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے وہ مشہور جملہ فرمایا جو شیعہ سنّی دونوں نقل کرتے چلے آئے ہیں:

اتقوا اللّٰہ فی النساء فانّکم اخذ تموھنّ بامانة اللّٰہ واستحللتم فروجھنّ بکلمة اللّٰہ ....

عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم نے ان کو بطور امانتِ الٰہی حاصل کیا ان کی عصمت "کلمة اللّٰہ" کے ذریعے حلال کی ....

ابن اثیر نے کتاب النہایہ میں لکھا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان "کلمة اللّٰہ" جس سے عصمتِ خواتین، مردوں پر حلال قرار پاتی ہے، سے مراد

وہ جملہ ہے جو قرآن مجید میں بایں الفاظ موجود ہے " امساک بمعروف او تسریح باحسان" ان خواتین کو دستور کے مطابق اچھی طرح رکھو یا بھلائی کر کے چھوڑ دو۔

شیخ الطائفہ کا نظریہ

شیخ ابوجعفر طوسی ؒ نے کتاب الخلاف جلد ۲ صفحہ ۸۵ ا پر لکھا ہے ۔ جب ثابت ہو جائے کہ مرد، "عنین" ہے تو بیوی کو فسخ کا اختیار ہے۔ فرماتے ہیں:

اس بات پر فقہا کا اجماع ہے .... نیز اس آیت سے استدلال بھی "امساک بمعروف او تسریح باحسان" عنین چونکہ بیوی کو اچھی طرح نہیں رکھ سکتا، لہذا اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

ان توضیحات سے بخوبی وقطعی واضح ہو گیا کہ اسلام ہرگز مرد کو زور آوری کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے حق طلاق سے ناجائز فائدہ اٹھائے اور بیوی کو قیدی بنا کر رکھے۔

جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو شخص اپنا نام قاضی رکھ لے اسے ان جیسے مسائل میں دخل دینے کا حق مل جائے گا۔ اسلام کے نزدیک قاضی کے شرائط بہت سخت اور وزنی ہیں جن پر گفتگو کی یہ جگہ نہیں ہے۔

ایک اور بات جس پر توجہ رکھنا ہو گی وہ "عدالتی طلاق" گھر کی مرکزیت پر اسلام کی خصوصی توجہ اور نگہداشت کے باوجود بڑی مستثنیٰ اور نادر و کمیاب مقامات ایسے آئیں گے جہاں قاضی طلاق دے۔ اسلام اس طلاق کا قائل نہیں جو امریکہ اور یورپ میں ہوتی ہے اور وہ اس قسم کی طلاق جائز نہیں جانتا جس کی داستانیں ہم روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ مثلاً ایک عورت نے اپنے شوہر کے بارے میں شکایت کر دی اور طلاق مانگ لی۔ صرف اس لیے کہ جس فلم کو میں پسند کرتی ہوں شوہر پسند نہیں کرتا۔ یا "فی فی" صاحب میرے پیارے کتے کو چومتا نہیں۔

اسی قسم کے مضحکہ انگیز قصے جو انسانیت کے زوال کا نمونہ ہیں۔

● ● ●
●

ناظرینِ محترم، گذشتہ چند مقالات میں جو کچھ عرض کیا ہے، اور اکیسویں مضمون میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ طلاق کے سلسلے میں پانچ نظریے ہیں:

(۱) طلاق معمولی چیز ہے اس پر سے ہر قسم کی پابندیاں اٹھالی جائیں خواہ معاشرتی بندشیں ہوں یا اخلاقی۔

(۲) ازدواج ایک ابدی بندھن ہے اور طلاق بالکل ناممکن ہے۔ (کیتھولک چرچ کی رائے)

(۳) اِزدواج مرد کی طرف سے قابلِ جدائی ہے عورت اس بندھن کو نہیں کھول سکتی۔

(۴) ازدواج شوہر کی طرف سے خاتمہ پاتا ہے اور خاص شرائط کے ساتھ بیوی بھی یہ بندھن کھول سکتی ہے۔ یہ راستہ میاں بیوی دونوں کے لیے ہے۔ دونوں اس معاملے میں یکساں و برابر ہیں۔ (دعوے داران مساوات حقوق کا نظریہ)

(۵) طلاق کا راستہ جس طرح شوہر کے لئے کھلا ہے، بیوی کے لیے بھی بند نہیں ہے۔ لیکن میاں بیوی کیلئے نکلنے کے دروازے الگ الگ ہیں۔

میں نے اپنے مضمون میں کہا ہے کہ اسلام پانچویں نظریے کا حامی ہے، پھر "شرطِ ضمنِ عقد" اور "عدالتی طلاق" کے ذیل میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اسلام کا نقطۂ نظر بتا دیا کہ طلاق فطری حق کے طور پر بیوی کو حاصل نہیں ہے۔ اس کے باوجود اس کے لیے راستہ مکمل طور پر بند بھی نہیں ہے۔ خواتین کے لیے خصوصی دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

"عدالتی طلاق" کے بارے میں اس سے زیادہ بحث کی گنجائش ہے، خصوصاً

اسلامی فرقوں کے علما و فقہا کے خیالات اور تمام اسلامی ملکوں میں عام مسلمانوں کا رویہ سامنے رکھ کر بات ہو سکتی ہے۔ مگر ہم ان مقالات میں اسی قدر کافی سمجھتے ہیں۔

گیارھواں حصّہ :

تعدّدِ ازواج

- ــــــ تاریخِ زندگیِ بشر میں بیویوں کی قسمیں۔
- ــــــ اسلام نے جاہلیت کی تین چار قسم کی بیویاں ممنوع کر دیں۔
- ــــــ جنسی کمیونزم، ایک بیوی کئی شوہر۔
- ــــــ چند شوہری نظام کیوں ناکام ہوا، اور چند ازواجی نظام رواج پا گیا؟
- ــــــ عورت کے لیے، مرد کے برخلاف خانگی زندگی، مادّی پہلو سے زیادہ روحانی ونفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔
- ــــــ تعدّدِ ازواج، عورت کا حق ہے، مرد کے حقوق میں نہیں ہے۔
- ــــــ تعدد ازدواج کے تاریخی اسباب۔
- ــــــ کیا تعدد ازواج مشرقی آب و ہوا کی پیداوار ہے؟
- ــــــ چند ازواجی ڈھانچہ مغرب میں اور چند ازواجی ڈھانچہ مشرق میں۔
- ــــــ مغرب میں عیاشی کی فراوانی نے تعدّدِ ازواج کو روکا، اس میں دینِ مسیحی کے ضوابط کا دخل نہیں ہے۔
- ــــــ تعدّدِ ازواج کے معاملے میں، مرد کبھی زور آوری دکھاتا ہے، کبھی قانونی جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے، کبھی بیوی کا حق ادا کرتا ہے۔

- —— چند ازواجی صورتِ حال میں بیوی کا حق۔
- —— شماریات بولتے ہیں۔
- —— ہمیشہ شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، شادی کے قابل لڑکوں کی تعداد سے زیادہ رہتی ہے، کیوں؟
- —— منشورِ حقوقِ انسانی نے انسان کے ایک بہت بڑے حق کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے۔
- —— بہ فتوائے اہل حل و عقد انگلستان اگر "ہودی زن" ڈاڑھی مونچھ والا ہو تو کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت نہیں ہے۔
- —— کیا مرد کی فطرت کا تقاضہ تعداد ازواج ہے؟
- —— کہتے ہیں ــ مرد، قانوناً ایک بیوی کا پابند ہے مگر عملی طور پر چند بیویاں رکھتا ہے۔
- —— خراب معاشرے نے مرد کی خیانت کے اسباب پیدا کیے ہیں، اس کی فطرت نے نہیں۔
- —— بیسویں صدی کے مرد، عورت کے بارے میں اپنی ذمہ داریاں کم کرنے اور اپنی مقصد برآری میں کامیاب ہو گئے۔
- —— بے شوہر خواتین جو بحران پیدا کرتی ہیں وہ ہر بحران سے زیادہ خطرناک ہے۔
- —— "چند ازواجی" پر اعتراضات اور خرابیاں۔
- —— اکثر مردوں کا عقیدہ: خدا ایک، بیوی ایک۔
- —— عشق اور جذبات قابلِ تقسیم و درجہ بندی نہیں ہیں۔
- —— کئی بیویاں، گھریلو زندگی کو مہر و محبت کے مرکز سے میدان جنگ

ہیں منتقل کر دیتی ہیں۔

- —— مرد، اپنی عائلی زندگی کو ایک مرتبہ بیچنے کے بعد دوبارہ کیسے فروخت کرتا ہے؟
- —— کئی بیویوں کے مسئلے میں اسلام کا کردار۔
- —— اسلام نے چند ازواجی کو محدود بھی کیا اور مشروط بھی کیا ہے۔
- —— تعدّد ازواج میں دولت اور صحت کی شرط۔
- —— تعدّد ازواج سے آج کے مرد کی نفرت کے اسباب۔
- —— تعدّد ازواج کی جگہ اس صدی میں "گناہ" نے پر کی ہے "وفا" نے نہیں۔

(خلاصہ مطالب)

تعدّد ازواج

گھریلو زندگی کی فطری شکل "ایک بیوی" سے بنتی ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں اپنائیت کی روح، یعنی خصوصی و انفرادی مالکیت کا رواج ہوتا ہے۔ جو دولت کی خاص مالکیت سے جدا شے ہے۔ ایک بیوی کے گھر میں میاں، بیوی دونوں۔ جذبات و نفسیات، توجہ اور جنسی فائدے "اپنے" اور اپنی ذات سے مخصوص سمجھتے ہیں۔

ایک بیوی والے گھر کے مقابلے میں۔ چند ازواج۔ یا اشتراکی زوجیت کا نظام ہے۔ چند ازواجی یا اشتراکی زوجیت، چند صورتوں میں فرض کی جاسکتی ہے۔

جنسی کمیونزم

ایک صورت یہ ہے کہ فریقین میں کسی فریق کا دوسرے فریق سے خصوصی تعلق نہ ہو۔ نہ مرد، کسی خاص عورت سے وابستہ ہو، نہ عورت کسی معیّن مرد کی پابند ہو۔ یہی مفروضہ وہ ہے جسے "جنسی کمیونزم" کہا جاتا ہے۔ جنسی کمیونزم، گھریلو زندگی کی نفی کے مساوی ہے۔ تاریخ، بلکہ قبل از تاریخ کے تاریخی مفروضے بھی کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کرتے جس میں انسان یکسر خاندانی زندگی سے خالی رہا ہو۔ اور جنسی کمیونزم کا رواج ہو۔ جس مدت کو اس نام سے یاد کرتے اور دعویدار بنتے ہیں کہ کچھ وحشی مردوں میں یہ نظام تھا۔ ایک وسطی دور ممکن ہے رہا ہو کہ جسے خاص گھریلو زندگی اور جنسی کمیونزم کی کڑی سمجھا جاسکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض قبائل میں، چند بھائی چند بہنوں سے مشترک طور پر شادی کرلیتے تھے، یا مردوں کا ایک گروہ، عورتوں کے ایک گروپ سے شرکت کے طور پر شادی رچاتے تھے۔

ویل ڈیورانٹ نے "تاریخ تمدن" کی پہلی جلد میں (صفحہ ۶۰ پر) لکھا ہے:

بعض علاقوں میں، گروپ کی صورت میں شادی ہوتی تھی۔ یعنی ایک قبیلے کے مردوں کا ایک گروہ، دوسرے خانداں کی لڑکیوں کے ایک گروہ سے شادی کر لیتے تھے۔ مثلاً تبت میں رسم تھی، چند بھائی، اپنی تعداد کے مطابق چند بہنوں سے رشتہ کر لیتے تھے اور کسی کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ کس لڑکی کو کس کی بیوی بننا ہے رشتۂ زن و شوہر کا یہ انداز ایک طرح کا جنسی کمیونزم ہے۔ اس مرحلے میں جو مرد جس عورت سے چاہتا ہم بستر ہو جاتا تھا۔ "سیزر" نے اس سے ملتی جلتی رسم کا انگلستان میں تذکرہ کیا ہے۔ ان حادثات کے بچے کھچے نشانات میں ایک رسم بھی ہے کہ بھائی کے مرنے کے بعد بھاوج زندہ بھائی کی بیوی شمار ہونے لگتی تھی۔ یہود اور ان جیسی قدیم قوموں میں اس کا رواج زیادہ تھا۔

افلاطون کا نظریہ:

افلاطون کی کتاب "جمہوریت" سے مطلب نکلتا اور مورخ اس کی تائید کرتے ہیں۔ وہ اس کا نظریۂ خاص ہے۔ "فلسفی حاکم اور حاکم فلسفی" اس نے ایک طبقے کے لیے "گھریلو اشتراکیت" کی تجویز رکھی ہے۔ انیسویں صدی کے چند کمیونسٹ رہنماؤں نے بھی یہی کہہ دیا۔ "فرائڈ اور محرموں سے حرمت ازدواج" کے مصنف کے بقول ۱۹۲۸ء میں بے شمار تلخ تجربوں کے بعد کچھ طاقتور کمیونسٹ ملکوں نے "ایک بیوی" کے نظام کو قانونی صورت دے دی۔

چند شوہری نظام:

ازدواجی زندگی کے ضمن میں ایک مفروضہ "چند شوہری" ہے۔ یعنی ایک عورت ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر رکھے۔ ویل ڈیورانٹ کے بقول "یہ رسم تھوڑا جیسے تبتی قبائل میں مشاہدے کے قابل ہے۔"

صحیح بخاری میں، حضرتِ عائشہ سے مروی ہے کہ جاہلی عرب میں چار طرح کی

شادیاں رائج تھیں۔

ایک قسم تو وہی ہے جو اب تک رائج ہے کہ مرد، لڑکی کے باپ سے خواستگاری کرتا ہے اور مہر کے بعد شادی ہو جاتی ہے۔ جو لڑکا پیدا ہوتا ہے وہ باپ کے معین ہونے کی وجہ سے روشن مستقبل رکھتا ہے۔

دوسری صورت یہ تھی کہ شوہر، زمانۂ ازدواج کے اندر اپنی بیوی کے لیے کسی دوسرے مرد کو تجویز کرتا تھا کہ وہ دونوں محدود عرصے تک ساتھ رہیں، اس سے وہ ایک اچھی نسل حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یعنی وہ خود کچھ عرصے کے لیے بیوی سے الگ ہو جاتا اور بیوی کو سمجھا دیتا تھا کہ تم فلاں شخص کے ساتھ رہو، جب تک وہ عورت حاملہ نہ ہوتی اس وقت تک وہ شوہر الگ رہتا، جیسے ہی بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہو جاتا فوراً اس سے ربط پیدا کر لیتا تھا۔ یہ عمل اس شخص کے لیے ہوتا جسے شوہر تولید فرزند کے لیے اپنے سے بہتر سمجھتا تھا۔ دراصل یہ کام نسل کی بہبود اور خاندان کی اصلاح کے لیے انجام پاتا تھا۔ ایک شوہر کے ہوتے ہوئے دوسرے شوہر کے ساتھ میاں بیوی جیسے روابط کا نام ــ نکاحِ استبضاع ــ تھا۔

تیسری صورت یہ تھی کہ دس آدمیوں سے کم ایک ٹولہ، ایک عورت سے ربط پیدا کرتے، جب اس کے یہاں بچہ ہوتا تو وہ اس ٹولہ کو بلاتی۔ اس عہد کے دستور کی بنا پر وہ مرد آنے سے انکار نہیں کر سکتے تھے، سب حاضر ہو جاتے۔ وہ عورت ان میں سے جس مرد کو چاہتی نومولود اس کے نام کر دیتی اور وہی اس کا قانونی باپ قرار پاتا، پھر اس مرد کو انکار کا حق نہ رہتا تھا۔

چوتھی قسم ــ ایک عورت "طوائف" تسلیم کر لی جاتی تھی، بلا استثناء ہر مرد اس سے رابطہ پیدا کر سکتا تھا۔ ان عورتوں کے مکان پر ایک جھنڈی لگی ہوتی تھی یہی ان کی پہچان تھی۔ ایسی عورتوں کے یہاں جب بچہ پیدا ہوتا اس کے بعد وہ

اپنے یہاں آنے جانے والے مردوں کو جمع کریں، کاہن اور قیافہ شناس بلائیں، وہ قیافہ اور علامات دیکھ کر اپنی رائے بتاتے تھے کہ اس بچے کو فلاں کی اولاد ہونا چاہیے۔ وہ مجبور ہو کر قیافہ شناس کا فیصلہ مانتا اور وہ اولاد قانونی و رسمی طور پر اس شخص کی اولاد قرار پاتی تھی۔

یہ جاہلیت کے ازدواجی اقسام اس وقت تک رہے جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث نہ ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے چند اقسام کے سوا سب کو ختم کر دیا۔ معلوم ہوا کہ "چند شوہری" کی رسم جاہلیتِ عرب میں جاری تھی۔ "مان ٹسکو" روحِ قوانین میں لکھتا ہے:

"ابو ظہیر حسن ایک عرب سیّاح، نویں صدی عیسوی میں ہندوستان و چین گیا تو اس نے "چند شوہری" کی رسم دیکھی اور اسے عیاشی کا ثبوت قرار دیا"۔ اسی نے لکھا ہے۔ "مالابار کے ساحلوں پر "نائیر" نامی قبیلہ رہتا ہے۔ اس قبیلے میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں، حالانکہ عورتیں کئی شوہر رکھ سکتی ہیں۔ میرے نزدیک اس قانون بنانے کی وجہ یہ ہوگی کہ نائیر قبیلے کے مرد بڑے جنگجو ہوں گے، اور اپنی اصالت کی بنا پر جنگ ان کا پیشہ ہوگی، اور جیسے ہم یورپ میں فوجیوں کو شادی سے روکتے ہیں تاکہ تاھلی زندگی ان کی پیشہ ورانہ جنگی مصروفیت کو نہ روکے، مالابار کے قبیلۂ نائیر کو بھی گھریلو رشتوں سے آزاد رکھا گیا ہوگا، وہاں کی آب و ہوا میں گرمی ایسی تھی کہ انھیں شادی سے بالکل روکنا ممکن نہ تھا، لہٰذا یہ طے کیا گیا ہوگا کہ چند آدمی مل کر ایک عورت رکھ لیا کریں۔ اس طرح گھریلو رشتہ کمزور رہے گا اور پیشہ ورانہ کام میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔"

"چند شوہری" نظام کے مشکلات

"چند شوہری نظام میں بنیادی بڑی مشکل یہ پیدا ہوگئی کہ نسب کا تعین ختم ہو گیا

یہی سبب اس رسم کے بروئے کار آنے میں رکاوٹ بنا، شاید اس دستور کی ناکامی اسی بنا پر عمل میں آئی۔ اس قسم کی ناکمل زندگی میں باپ کا بیٹے سے رشتہ عملی طور پر معین نہ ہو سکتا تھا۔ جیسے جنسی کمیونزم میں باپ بیٹے کا رشتہ عملاً غیر معین ہے۔ اور جس طرح جنسی کمیونزم اپنا راستہ نہ کھول سکا، یونہی چند شوہری رسم بھی حقیقی معاشرے میں قابل قبول نہ بن سکی۔ ہم نے گذشتہ سلسلہ مقالات میں لکھا ہے کہ آنے والی نسل کے لیے گھریلو زندگی اور آشیانے کی تعمیر ضروری ہے اس سے گذشتہ اور آیندہ نسل میں رشتہ استوار ہونا فطرتِ بشری کا ایک جبلی تقاضہ ہے۔ یہ جو کبھی کبھی یا کہیں کہیں، کچھ انسانی گروہ یا قبیلوں میں "چند شوہری" رسم ملتی ہے، وہ مرد کے جذبۂ تشکیل خاندان کی خاص ہیئت کی دلیل نہیں بن سکتی۔ اسے فطرتِ مرد کا فطری تقاضہ مان لینا صحیح نہیں ہے۔ جیسے کچھ مردوں یا چند عورتوں کا، شادی سے پرہیز اور عائلی زندگی سے علیحدگی، فطرت سے انحراف تو ہے مگر اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اسے، انسان کی فطری خانگی خواہشِ زندگی کے خلاف دلیل بنا لیا جائے۔ چند شوہری رسم، مرد کی خواہشِ انفرادیت و انحصار طلبی و اولاد دوستی ہی کے خلاف نہیں، خود عورت کی فطرت سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ نفسیاتی مطالعات و تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت مرد سے زیادہ ایک رفیق حیات چاہتی ہے۔

تعددِ ازواج

چند رفقاء زندگی کی ایک شکل "چند زنی" یا "تعددِ ازواج" ہے۔ چند بیویوں یا تعددِ ازواج کی رسم نے جنسی کمیونزم اور چند شوہری نظام سے زیادہ رواج حاصل کیا۔ یہ دستور فقط وحشی قبیلوں میں ہی نہ تھا، اسے تو متمدن قوموں نے بھی اپنایا، عرب جاہلیت، یہود، اور ساسانی عہد میں ایرانی قوم بلکہ دوسری قوموں میں بھی یہ رسم و قانون موجود تھا۔ مان ٹسکیو نے لکھا ہے۔ مالدیو قوم میں تین بیویاں رکھنے کی اجازت تھی"۔ اسی مصنف کے

بقول۔ والنٹینین (VALENTINIAN) شہنشاہ روم نے خاص حالات میں مردوں کو کئی بیویاں رکھنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن یورپ کی جغرافیائی آب و ہوا کی نامناسبت تمام رومی بادشاہوں کو اس قانون پر آمادہ نہ کر سکی، اور تھیو دوس۔ ارکیڈیس۔ اور "ہونوریس" نے اس قانون کو ختم کر دیا۔"

اسلام اور تعدد ازواج

اسلام نے "چند شوہری" کے برخلاف، چند زنی یعنی چند ازواجی نظام کو مکمل طور پر منسوخ و معطل نہیں کیا، البتہ اس میں حد بندی اور پابندی لگا دی، یعنی ایک سمت نامحدودیت کو ختم کیا دوسری طرف زیادہ سے زیادہ کی چار مقرر کر دی۔ پھر ضابطے اور شرطیں بڑھائیں نیز ہر شخص کو اجازت نہیں دی کہ متعدد بیویاں کرتا پھرے۔ آیندہ ہم گفتگو کریں گے کہ اسلام نے کیا شرائط و ضوابط بنائے اور کیوں تعدد ازواج کو ختم نہ کیا۔

حیرت ہے کہ گذشتہ صدیوں اسلام کے خلاف پروپیگنڈا ہم ملتی رہی کہ پیغمبر اسلامؐ نے تعددِ ازواج کی رسم ایجاد کی ہے۔ وہ لوگ دعوے کرتے پھرتے تھے۔ اسلام کی بنیاد تعددِ ازواج ہے۔ اسلام دنیا کی مختلف قوموں میں اتنی جلدی پذیرائی کی وجہ کئی بیویاں رکھنے کی اجازت تھی۔ یہ بھی دعوے کرتے تھے کہ مشرق کے زوال کا باعث بھی تعدد ازواج ہے۔

تاریخ تمدن، جلد ۱، صفحہ ۶۱ پر ویل ڈیورانٹ نے لکھا ہے: "وسطی صدیوں میں مذہبی عالم یہ تصور کیے ہوئے تھے کہ تعددِ ازواج پیغمبر اسلامؐ کی ایجاد ہے۔ درآں حالیکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ ابتدائی معاشروں میں ہم میں رفیق زندگی کے بارے یہی رویہ موجود تھا۔ ایسے اسباب و علل بہت ہیں کہ اس دور میں بیویوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ جیسے مرد جنگ و شکار میں مصروف

رہتے تھے لہٰذا ان کی زندگی خطرے میں ہوتی اور مردوں کی موت عورتوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ نتیجہ میں عورتوں کی تعداد میں اضافے کا حل ایک تو تعدد ازدواج تھا یا پھر بہت سی عورتوں کو بے شوہر و وارث رہنے دیا جائے۔ لیکن جن قوموں میں موت کی فراوانی ہو وہاں کوئی مناسب بات نہ تھی کہ عورتوں کی ایک نمایاں تعداد بلا شوہر رہے اور تولیدِ نسل کا عمل نہ ہو .... بلاشبہ ابتدائی دور میں تعدّدِ ازدواج ایک مناسب دستور تھا، کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی، پھر نسل کی بہبود کے لیے بھی نظامِ تعدّدِ ازدواج آج کے نظامِ یک زن سے زیادہ مفید تھی۔ سب جانتے ہیں کہ مضبوط و توانا، طاقت ور اور محتاط مرد آج کی دنیا میں مدّت بعد شادی کرتے ہیں، اس کے برخلاف گذشتہ زمانے میں طاقت ور افراد بظاہر اچھی عورتیں آسانی سے حاصل کر لیتے اور زیادہ بچے پیدا کرتے تھے۔ اسی بنا پر شروع میں متعدد قبائل بلکہ متمدن اقوام میں تعدّدِ ازدواج کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ اور ابھی کچھ دنوں سے ہمارے زمانے میں یہ رسم ہمارے مشرق سے کم ہوتی چلی گئی ہے۔ دراصل اس کے زوال میں متعدد عوامل کارفرما ہیں:

کاشتکاری کی فراوانی، اس نظام نے مردوں کی بھاری اور خطرناک زندگی کو نسبتاً پرسکون اور پائدار بنا دیا ہے۔ عورتوں کی تعداد بھی کم و بیش مردوں کے برابر آگئی ہے۔ ان حالات میں "چند زنی" کی بات یا تو ابتدائی معاشرے کی بات قرار پاگئی ہے یا پھر مٹھی بھر دولت مند افراد کے خصوصیات میں شمار ہونے لگی ہے۔ اور "زنا" کا مشغلہ منہ کا مزہ بدلنے کے لیے ہے۔"

تاریخ تمدّن، صفحہ ۵۰۷ پر گوستاولوبن نے لکھا ہے:

"یورپ میں مشرقی رسم و رواج میں تعدّدِ ازدواج سے زیادہ برے پیرائے میں اور کسی چیز کا تعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ اہلِ مغرب کا نقطہ نظر کسی رسم کے بارے

ہیں اس قدر غلط نہیں جتنا اس مسئلے میں غلط ہے، یورپی مصنف تعدّد ازدواج کو اسلام کی بنیاد جانتے اور اسلام کی ترویج، نیز مشرقی اقوام کے زوال و انحطاط کا اہم ترین سبب مانتے رہے ہیں۔ اعتراضات کی بوچھار کے ساتھ، یہاں کی خواتین سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا۔ بدنصیب عورتیں سخت اور اکھڑ خواجہ سراؤں کے ہاتھ گھروں کی چار دیواریوں میں اسیر رہتی ہیں، اگر کوئی بات گھر کے ان رکھوالوں کی مرضی کے خلاف ہو جاتی ہے تو جان کے لالے پڑ جاتے اور ممکن ہوتا ہے کہ بڑی بے رحمی سے قتل کر دی جائیں، مگر یہ ایسے تصور ہیں جن کا کوئی ثبوت یا بنیاد نہیں۔ ہماری کتاب کے مغربی قاری اگر تھوڑی دیر کے لیے تعصب کو دور کر سکیں تو انھیں تائید کرنا پڑے گی اور مشرقی تمدن کی خوبی تسلیم کریں گے کہ اس میں کئی بیویاں رکھنے کی اجازت ہے، جن گھرانوں میں یہ رسم موجود ہے ان میں اخلاقی روح ترقی پذیر ہے۔ اور عائلی رشتے مستحکم ہیں، اسی رسم کے نتیجے میں عورت کا اعزاز و اکرام مغرب سے زیادہ ہے، ہم اس دعوی پر دلیل لکھنے سے پہلے یہ بتا دیں کہ تعدّد ازدواج کا تعلق ہرگز اسلام ہی سے نہیں، اسلام سے پہلے بھی یہ رسم مشرقی اقوام میں پائی جاتی تھی۔ یہود، ایرانی، عرب وغیرہ جو قومیں اسلام لائیں انھوں نے اس بارے میں کوئی نیا فائدہ نہیں اٹھایا، آج تک دنیا میں کوئی مذہب ایسا با اقتدار وجود پذیر نہیں ہوا جو تعدّد ازدواج جیسے رسوم کو ایجاد یا منسوخ کر سکے۔ مذکورہ رسم مشرقی آب و ہوا کا نتیجہ ہے، اس کی وجہ سے کچھ نسلی خصوصیات نیز دوسرے اسباب و علل جنم لیتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا تعلق مشرق کی زندگی اور اس کے رویّوں سے ہے، نہ یہ کہ مذہب یہ رسم لایا۔ ادھر یورپ کی آب و ہوا اس رسم کے لیے سازگار نہیں اور وہاں اس کے تقاضے موجود نہیں ہیں اس کے باوجود ایک بیوی وہاں کی رسم ہے "قانونی کتابوں میں تو پڑھتے ہیں ورنہ مجھے تو باور نہیں کہ ہمارے معاشرے میں کوئی یہ کہہ سکے کہ "ایک بیوی" کا کوئی اثر ہو۔

سچ مچ مجھے حیرت ہے مجھے نہیں معلوم کہ مشرق کی متعدد جائز بیویوں کے مقابلے میں یورپ کی مکارانہ بہت سی بیویوں میں کیا کمی ہے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پہلا نظام دوسرے نظام سے بدرجہا بہتر و شائستہ ہے۔ اہل مشرق جب بڑے شہروں کی سیاحت کو آتے ہیں اور ہمارے اعتراضات یا حملوں سے دوچار ہوتے ہیں تو انھیں حیرت ہوتی اور غصہ آتا ہے.....''

ہاں، اسلام نے "تعدد ازواج" کا نظام ایجاد نہیں کیا، مگر اسے ایک سمت سے محدود کر کے اکثریت کی تعداد ضرور مقرر کی۔ دوسری سمت، بھاری شرطیں لگا دیں۔ جو قومیں مسلمان ہوئیں، ان کے یہاں عموماً یہ رسم تھیں، اسلام کے ذریعے وہ حدود و قیود کا گردن بند پہننے پر ضرور مجبور ہوئی ہیں۔

ایران میں تعدّد ازواج

کریسٹن سن کے "ایران ساسانیوں کے عہد میں" صفحہ ۳۴۶ پر لکھتا ہے:۔

"(ساسانیوں کے زمانے میں ایران کے اندر) متعدد بیوں ہی سے خانوادہ تشکیل پاتا تھا، مرد کی استطاعت کے لحاظ سے عورتوں کو رکھنے کا حق تھا۔ بظاہر غریب لوگ ایک ہی بیوی کرتے تھے۔ خاندان کا سربراہ، کنبے کی سربراہی سے بہرہ ور ہوتا تھا۔ بیوں میں محترم و محبوب خاتون تمام حقوق کی مالک ہوتی اور اس کو "زن پادشاہیہا" (بادشاہ زن) یا "زنِ ممتاز" کہتے تھے۔ اس کے کم درجہ عورت، خدمت گار" زن چگاریہا"، کہلاتی، ان دونوں درجے کی بیویوں کے حقوق جدا جدا تھے۔ بظاہر زرخرید کنیز اور قیدی عورتیں نوکر بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔ ممتاز بیویوں کے بارے میں یہ نہیں معلوم کہ ایک مرد کے یہاں محدود تھیں یا نہیں؟ لیکن متعدد قانونی حوالوں میں ایک شوہر کی دو ممتاز بیوں کا اشارہ تو ملتا ہے۔ اس درجے کی بیویاں خانہ دار معلوم ہوتی ہیں، گویا ان کے الگ الگ گھر ہوتے

تھے. شوہر، زندگی بھر زنِ ممتاز کو آذوقہ دینے کا پابند تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کرتا، لڑکا، بالغ ہونے اور لڑکی شادی ہونے تک یہی حق رکھتی تھی۔ چاکر زن قسم کی بیویوں کی اولادِ ذکور باپ کے خاندان میں قبول کی جاتی تھی۔"

"تاریخ تمدن ایران از انقراض ساسانیاں تا انقراض امویاں" میں سعید نفیسی مرحوم نے لکھا ہے:

"مرد لامحدود بیویاں رکھ سکتا تھا، بعض یونانی دستاویزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک آدمی کے گھر میں سو بیویاں بھی ہوتی تھیں۔"

مان ٹسکو نے "روح القوانین" میں "اکوٹیٹس" رومی مورخ سے نقل کیا ہے جسٹی ٹین، کچھ رومی فلسفی، مسیحوں کے ہاتھوں اذیت و تکالیف کا نشانہ بنے، یہ لوگ عیسائی مذہب قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ آخر ان لوگوں نے روم کو چھوڑ دیا اور خسرو پرویز بادشاہ کے دربار میں پناہ گیر ہوئے۔ یہاں پہنچ کر جس بات نے انھیں حیرت سے دوچار کیا، وہ یہی نہیں کہ تعدّد ازواج کی رسم پائی جاتی تھی۔ انھوں نے دوسروں کی بیویوں سے اختلاط بھی دیکھا۔"

یہ بات ذہن میں رہے کہ رومی فلاسفہ نوشیروان بادشاہ ایران کے دربار میں حاضر ہوئے تھے، خسرو پرویز کے یہاں نہیں، مان ٹسکو کے یہاں خسرو پرویز کا نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔

عربوں میں بیوں کی تعداد کا حساب و شمار ہی نہ تھا، اسلام کا اس پر بند باندھنا اور زیادہ سے زیادہ کی تعداد معین کرنا، ان عربوں کے لیے مشکل بن گیا جن کی بیویاں چار سے زیادہ تھیں، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کی دس بیویاں تھیں وہ چھ بیویوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

معلوم ہوا کہ اسلام نے تعدّد ازواج کی رسم ایجاد نہیں کی، اس کے برعکس اس رسم

پر حد و بندش عائد کی، اور یکسر ختم بھی نہیں کیا۔ آئندہ گفتگو میں ہم دیکھیں گے کہ تعدد ازواج کی وجہ افراد بشر میں کیا ہے؟ کیا اس کی علّت وجہ، مرد کی زور آوری اور عورت پر حکومت کرنے کا جذبہ ہے، یا خاص ضرورتیں تھیں جن کی وجہ سے یہ عمل ضروری ہوا؟ وہ ضرورتیں کیا تھیں؟ کیا ان کا تعلق جغرافیائی حالات سے ہے یا اور طرح کے تقاضے تھے؟ اسلام نے اس رسم کو بالکل ختم کیوں نہ کیا؟ اسلام نے تعدّد ازواج پر کیا بندشیں لگائی ہیں؟ آخر، آج مرد و زن دونوں تعدّد ازواج کے خلاف کیوں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟ اس کے پس منظر میں انسانی واخلاقی بنیاد ہے یا دوسرے اسباب وعلل کارفرما ہیں؟

یہ مطالب ہیں جن پر ہم گفتگو کریں گے۔

تعدّد ازواج کے تاریخی اسباب

①

تعدّد ازواج کے تاریخی اور سماجی علل و اسباب کیا ہیں ؟

اس رسم کو بہت سی قوموں نے قبول کیا خصوصاً مشرقی اقوام وملل نے اور کچھ قوموں نے اسے قبول نہیں کیا خصوصاً ، مغربی اقوام وملل نے اس کی وجہ کیا ہے ؟

تین قسم کے جنسی روابط ہیں ۔ چند ازداجی صورت نے کیوں رواج و قبولیت حاصل کی ، اور چند شوہری اور جنسی اشتراکیت کے نظام یا تو نافذ ورائج ہی نہ ہو سکے یا اکّا دکّا وقوع پذیر ہوئے ایسا کیوں ہے ؟

جب تک ان اسباب وعلل کی چھان بین نہ ہو ، ہم اسلام کے نظریۂ تعدد ازواج پر بحث نہیں کر سکتے اور نہ آج کے انسان کی ضرورت کے بارے میں گفتگو ممکن ہے ۔

اگر ہم ان لاتعداد مطالعات کو نظر انداز کر دیں ، جو نفسیاتی اور معاشرتی سلسلے میں کیے گئے ہیں اور بہت سے مصنفین کی طرح سطحی طور پر سوچنا کافی سمجھیں تو سماجی اور تاریخی عوامل واسباب تعدّد ازواج پر وہی مشہور "ترجیح بند" دھرانا ہوگا جو اس قسم کے مسائل میں ہمیشہ دھرایا جاتا ہے ۔ کہ

تعدّد ازواج کی علت بہت واضح و روشن ہے ۔ اس کی علت و وجہ مرد کی زور آوری اور تسلط طلبی اور عورت کی کنیزی اس کا سبب ہے ۔ اس رسم کی علت "پدر شاہی" ہے ۔ چونکہ مرد ، عورت پر بالا دستی اور حکمرانی رکھتا ہے اس لیے اپنے فائدے کے

رسم و رواج ڈھالتا اور بناتا رہتا ہے۔ "چند زنی" کی رسم بھی اس نے اپنے نفع اور عورت کے نقصان کے لیے صدیوں سے بنا رکھی ہے۔ عورت چونکہ مرد کی محکوم تھی لہٰذا وہ "چند شوہری" کی رسم اپنے نفع کی خاطر جاری نہ کر سکی۔ اب مرد کی طاقت آزمائی کا دور ختم ہو گیا ہے لہٰذا "چند زنی" کا طرۂ امتیاز چھین لیا جائے گا اور اس غلط امتیازی رویے کی جگہ زن و مرد کو برابر کے حقوق دیے جائیں گے۔

اگر ہم یوں سوچنے لگیں تو بڑی سطحی اور گھٹیا بات ہو گی۔ "چند زنی" رسم کے رواج پانے کا سبب نہ تو مرد کی زور آوری ہے نہ "چند شوہری" نظام کی ناکامی کی وجہ عورت کی محکومیت و کمزوری۔ نہ یہ حقیقت ہے کہ آجکل مرد کی زور آوری کا دور ختم ہو گیا ہے لہٰذا "تعدّد ازواج" کا دستور منسوخ ہو رہا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ "ترک تعدد ازواج" سے مرد نے واقعاً اپنا امتیاز ضائع کر دیا ہے۔ بلکہ واقعاً، مرد نے عورت کے خلاف آج ایک امتیاز مزید حاصل کر لیا ہے۔

میں "زور و قدرت" کو تاریخ بشر بدلنے والے عامل تسلیم نہیں کرتا۔ میں اس نظریہ کا منکر بھی نہیں کہ مرد نے اپنی قوت کے سہارے عورت سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ مگر میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ طاقت و اقتدار کو اکیلا عامل سمجھنا، خصوصاً گھریلو زندگی اور میاں بیوی کے رشتوں اور رویوں میں کوتاہ نظری ہے۔

اگر مذکورہ بالا نظریہ صحیح ہے تو لازمی طور پر ماننا پڑے گا کہ جب اور جہاں "چند شوہری" کی رسم عملی تھی۔ جیسے جاہلی عرب اور بقول مان ٹسکو، ملایا کے ساحلوں میں نائیر قبیلہ۔ وہاں ایک دور ایسا تھا، جب عورت کو موقع ملا، اور اس نے مرد کے خلاف اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ اس لیے "چند شوہری" نظام مردوں پر مسلط کر دیا۔ وہ دور خواتین کا "طلائی دور" ہے۔ حالانکہ جاہلیت عرب کا

دور سب کے نزدیک عورت کی زندگی کا تاریک ترین عہد تھا۔ ہم نے گذشتہ مقالے میں مان ٹسکو، کا مطالعہ نقل کیا، جس میں اس کے بقول "چند شوہری" کی رسم نائیر قبیلے میں رائج ہونے کا سبب عورت کی عزت و قوت نہیں بتائی گئی بلکہ اس رسم کے رائج کرنے کی علت یہ کہی گئی ہے کہ وہاں کے لوگ فوجیوں کو گھریلو زندگی کے بندھن سے آزاد رکھ کر ان کے فوجی جذبہ و کردار کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

اس کے علاوہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تعدد ازدواج کی وجہ "پدر شاہی" اور "پدر سالاری" ہے تو اس کا رواج مغربی اقوام میں کیوں نہ ہوا؟ کیا "پدر شاہی" نظام سرزمین مشرق سے مخصوص تھا۔ مغربی باشندے اس وقت بھی "عیسیٰ مزاج" و "مریم سرشت" تھے۔ وہ لوگ شروع ہی سے عورت کے لیے مرد کے مقابل اور مساوی حقوق جانتے مانتے تھے؟ کیا فقط سرزمین مشرق ہی میں مرد کی قوت کا سبب مرد کے نفع کا انتظام کرتا رہا، اور مغرب میں اس عامل و سبب کا رویہ عادلانہ و منصفانہ رہا ہے؟

مغربی عورت نصف صدی پہلے تک بدنصیب ترین خواتینِ عالم تھی۔ وہ اپنی ذاتی املاک و دولت میں بھی مرد کی سربراہی (قیمومیت) کی محتاج تھی۔ خود اہل مغرب کے بقول قرون وسطیٰ میں مشرقی عورت کی حالت مغربی عورت سے بہت اچھی تھی۔ گوستاد لوبن نے لکھا ہے: اسلامی تمدن کے دور میں خواتین کو بعینہ وہی درجہ و مقام حاصل تھا جو مدتِ مدید کے بعد یورپی خواتین کو حاصل ہوا یعنی عربوں کے اس دلیرانہ کردار کے بعد جس نے یورپ میں ان کے خلاف پروپیگنڈے کی بنیاد رکھی .... بہادرانہ اخلاق جس کا ایک جزء حسن خواتین سے حسن سلوک ہے۔ اہل یورپ میں مسلمانوں کے ذریعہ پہنچے، مغربی باشندوں نے مسلمانوں کی تقلید کی۔ جو مذہب، عورت کو پست درجے اور

مقامِ ذلت سے اوج، عزت و سربلندی تک لا سکتا وہ اسلام ہے، عیسائیت نہیں ہے۔ جیسے عام لوگ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ، قرونِ وسطیٰ میں ہمارے لیڈر اور بڑے رہنما عیسائی تھے اس کے باوجود احترامِ خواتین کا خیال نہ رکھتے تھے۔ قدیم تاریخ کی چھان بین سے اس بارے میں شبہے کی گنجائش نہیں رہی کہ ہمارے بزرگوں کو مسلمانوں کی تعلیم احترامِ خواتین سے پہلے ہمارے امراء و سردار عورت سے انتہائی وحشیانہ سلوک کرتے تھے"

دوسرے مصنفین نے بھی کم و بیش اس دور کے مغربی حالات کی ایسی ہی تشریح کی ہے۔ ان حالات کے ہوتے ہوئے، جب قرونِ وسطیٰ میں "پدر شاہی" و قوت و زبردستی حکومت کا عروج تھا، تعددِ ازواج کی رسم پھر رائج کیوں نہ ہوئی؟

حقیقت یہ ہے:

جہاں "چند شوہری" نظام موجود تھا، وہاں عورت کو مہلتِ اقتدار، اور جہاں نظامِ چند شوہری نہ چل سکا وہاں سبب اصلی خواتین کی کمزوری نہیں تھا۔

مشرق میں تعدد ازدواج، مرد کی بالادستی و حکومت یا مغرب میں تعدد ازدواج کا نہ پایا جانا، مرد و زن کی مساوات کا نتیجہ نہیں ہے۔

چند شوہری نظام کی ناکامی کی وجہ

چند شوہری رسم کی شکست کا سبب یہ ہے کہ یہ رسم و دستور نہ مرد کی فطرت کے مطابق ہے نہ عورت کی طبیعت سے ہم آہنگ۔ پہلی بات کہ فطرت مرد کے خلاف ہے، مطلب یہ ہے کہ مرد انحصار طلب اور بیوی کو فقط اپنا دیکھنا چاہتا ہے، چند شوہری اس تقاضے سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ رسمِ چند شوہری اطمینان پدری بر رشتہ فرزندی کی بنیاد کے خلاف ہے۔ انسان کا طبیعی و فطری تعلق اولاد سے بہت گہرا ہے۔ انسان فطرتاً توالد و تناسل چاہتا ہے۔ اس کی خواہش رہتی ہے کہ نسلِ آیندہ اور نسلِ گذشتہ سے اس کا سلسلہ معین اور اطمینان بخش ہو

وہ جاننا چاہتا ہے کہ کس بیٹے کا باپ اور کس باپ کا فرزند ہے۔ چند شوہری عورت آدمی کے اس فطری مطالبہ سے جوڑ نہیں کھاتی تھی۔ بخلاف "چند زنی" نظام کے، اس رسم میں نہ مرد کو چوٹ لگتی تھی نہ عورت ......

کہتے ہیں، تقریباً چالیس خواتین کا وفد حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا، اور پوچھنے لگا کہ اسلام نے مردوں کو کئی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت کیوں دی، اور خواتین کو چند شوہر کرنے کی اجازت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ درجہ بندی کی بات نہیں ہے؟

حضرت علی علیہ السلام نے کچھ چھوٹے پانی بھرے برتن طلب کئے اور وہ برتن ان خواتین کو دئے۔ پھر حکم دیا کہ ہر ایک اپنے ہاتھ کے برتن کا پانی سامنے رکھے ہوئے بڑے برتن میں انڈیل دے، سب نے تعمیل حکم کی، اس کے بعد فرمایا کہ اب ہر ایک اپنے اپنے انڈیلے ہوئے اصل پانی کو دو مرتبہ کوشش کر کے اپنے اپنے برتن میں نکالو۔ سب نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پانی ایک دوسرے میں مل چکا اسے مشخص و معین کرنا ناممکن ہے۔ حضرت ؑ نے فرمایا: اگر ایک عورت کئی شوہر کرے تو ہر ایک سے ہم بستر بھی ہو گی جب حمل ہو گا تو وہ کیسے مشخص و معین کر سکے گی کہ بچہ کس شوہر کی نسل سے ہے — یہ بات ہوئی مرد کے زاویے سے۔

عورت کے زاویے سے دیکھیے۔ چند شوہری سسٹم، فطرتِ زن اور اس کے منافع کے خلاف ہے۔ بیوی اپنے شوہر سے فقط جنسی آسودگی ہی نہیں چاہتی، جو یہ کہا جائے کہ جتنے زیادہ شوہر ہوں گے اتنا ہی اچھا ہے۔ بیوی ایک ایسا وجود چاہتی ہے جس کے دل کو اپنائے اسے اپنا حامی و محافظ بنائے جو اسے ہر ناپسند بات سے بچائے اور وہ خود اس پر جاں نثار کرے، محنت کرے اور اس سے دولت حاصل کرے، حاصل محنت و مشقت اس پر قربان کرے، غمخوار و ہمدرد ہو۔ ایک طوائف کو مرد جو روپیہ دیتا ہے یا وہ پیسہ جو عورت، محنت، مزدوری کر کے حاصل کرتی ہے، وہ عورت کے وسیع

اخراجات وضروریات کے لیے ناکافی ہوتا ہے ۔ اس کے اخراجات ایک مرد سے کئی گنا زائد ہوتے ہیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس آمدنی کا مقابلہ اس دولت سے کہاں ، جو دولت ایک مرد بیوی کے عشق و محبت کی بنیاد پر پیش کرتا ہے ۔ شوہر جو مال و دولت اپنی بیوی کے ضروریات کے لیے خرچ کرتا ہے وہ ایک فداکار کے انداز میں صرف کرتا ہے ۔ گھریلو زندگی کی مرکزیت اور رفیق حیات و اولاد کی محبت و کشش ، شوہر کو شوق دلاتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں کارکردگی و فداکاری کو باقی رکھے ۔

ایک عورت ، کئی شوہروں کے ہوتے ہوئے ، ایک مرد جیسی حمایت و محبت و مخلصانہ جذبات و فداکاری حاصل کر سکے ، اسی لیے "چند شوہری" سسٹم کو طوائف پیشگی کی طرح قابل نفرت سمجھا گیا ہے ۔ لہٰذا "چند شوہری" رسم نہ مرد کے رجحانات کے مطابق ہے ، نہ عورت کے جذبات و رجحانات سے ہم آہنگ ہے ۔

جنسی اشتراکیت کی شکست

جنسی اشتراکیت کی ناکامی کی علت بھی یہی ہے ، جنسی اشتراکیت میں اختصاص ختم ہو جاتا ہے نہ عورت کسی معین مرد سے اختصاص رکھتی ہے نہ مرد کسی معین عورت سے گہرا تعلق رکھتا ہے ۔ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہی تجویز افلاطون نے پیش کی تھی ، یہ بات ضرور ہے کہ اس نے طبقۂ حاکمہ کی سطح پر اسے سوچا تھا ۔ یعنی یہ دستور (اس کی زبان و اصطلاح میں) فلسفی حاکم اور حاکم فلسفیوں کے لیے ہونا چاہیے ۔ افلاطون کی یہ تجویز نہ دوسروں کے نزدیک منظوری کے لائق تھی نہ خود افلاطون اس نظریہ پر باقی رہا ، اس نے بھی رائے بدل لی ۔

ایک صدی قبل فارڈریک انجلس ، کمیونزم کے دوسرے باپ نے بھی یہی تجویز رکھی اور اس کے خلاف نظریوں اور دلیلوں کو رد کیا ، لیکن کمیونسٹ بلاک نے اسے منظور کیا ۔ کہتے ہیں کہ شوروی حکومت (روس) نے بے شمار تلخ تجربوں کے بعد عائلی اشتراکی تھیوری جو انجلس نے بنائی تھی اسے ۱۹۲۸ء میں بدل دیا ، اور کچھ قوانین

گھریلو زندگی کی فلاح و بہبود کے واسطے وضع کر کے ایک شوہر ایک بیوی کا قانون کمیونسٹ حکومت کا رسمی قانون مان لیا۔

ایک شوہر کے لئے کئی بیویاں امتیازی بات مانی جا سکتی ہے، لیکن ایک بیوی کے واسطے چند شوہر کوئی اعزاز نہ پہلے مانا گیا نہ آئندہ مانا جائے گا۔ اس فرق کا باعث یہی ہے کہ مرد، عورت کی ذات چاہتا ہے اور عورت، مرد کا دل اور اس کی فداکاری کی طلب گار ہے۔ مرد جب تک بیوی کی ذات پر اختیار رکھتا ہے اس وقت اس سے اس کا دل دے دینے سے کوئی دلچسپی نہیں، لہٰذا، ایک سے زیادہ بیویاں اگر اسے اپنا دل نہ دیں تو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ اس کے مقابلے میں بیوی، شوہر کے دل اور توجہات کو اصل سمجھتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ سے دے دیتی ہے تو سب کچھ ضائع کر دیتی ہے۔

دوسری لفظوں میں — ازدواجی زندگی میں دو عنصروں کا دخل ہوتا ہے۔ ایک مادی دوسرا روحانی — مادی عنصر ازدواج جنسی پہلو لیے ہوتا ہے جوانی میں یہ پہلو جوش و عروج پر ہوتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ کم ہو کر ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ روحانی عنصر (معنوی و نفسیاتی حصے) میں وہ نرم و لطیف جذبات اور خلوص و محبت کی حکمرانی ہوتی ہے جو کبھی تو وقت گذرنے کے ساتھ بڑی مضبوط ہو جاتی ہے۔ عورت و مرد کے درمیان جو فرق ہیں، ان میں سے ایک فرق یہی ہے کہ عورت کی نظر میں دوسرا عنصر زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مرد کے خیال میں پہلا عنصر، ورنہ کم از کم مرد کی نظر میں مادی و روحانی دونوں پہلو مساوی تو بہر حال ہوتے ہیں۔

ہم نے چودھویں مقالے میں اس موضوع پر گفتگو کے دوران ایک مغربی ماہر نفسیات خاتون کو سند میں پیش کیا تھا کہ عورت چونکہ شکم اور آغوش میں بچے کی پرورش کرتی ہے اس کے نفسیاتی حالات ہی کچھ اور ہوتے ہیں، وہ اپنے شوہر سے اس کی محبت اور خصوصی توجہ کی بے حد آرزو رکھتی ہے، ایسی محبت و توجہ جو اس کے شوہریت کے احساس کے ساتھ

اس کے زیر تربیت بچے کے باپ کی حیثیت بھی لیے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ ماں کی مامتا کا پلّا، باپ کی محبت فرزند کے پلّے سے زیادہ وزنی ہوتا ہے، باپ کی محبت میں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بچے کے وجود میں آنے کا ایک عامل ہے۔ عورت کی یہ خاص نیازمندی اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب شوہر ایک ہو۔

بنابریں "چند شوہری کا مقابلہ" "چند ازواجی" سے بہت بڑی غلطی ہے، پھر ان میں فرق کا نہ ماننا، یا دنیا کے ایک بڑے حصے میں "چند ازواجی" نظام کے رواج پانے کی علت مرد کی زور آوری قرار دینا، اور یہ کہنا کہ عورت اپنی کمزوری اور بے اختیاری کی وجہ سے "چند شوہری" "سسٹم جاری نہ کر سکی سراسر غلط ہے۔

کتابِ "انتقاد بر قوانینِ اساسی و مدنی ایران" کے صفحہ ۳۴ پر خانم منوچہریان لکھتی ہیں:

"قانون مدنی کی دفعہ ۱۰۴۹ میں ہے۔ "بیوی کی اجازت کے بغیر کوئی شخص، بھائی کی لڑکی، یا سالی کی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا ....
اگر بیوی اجازت دے دے تو اس کا شوہر بھائی کی یا سالی کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر بیوی اجازت نہ دے تو کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں۔ وہی جو مثل ہے "آنکہ عوض دارد گلہ ندارد" مرد کسی اور سے نکاح کر لے گا۔ اچھا۔ اب مسئلہ کو الٹ کر دیکھیں پھر کیا ہو گا؟ مثلاً، یہ کہیں۔ بیوی اپنے شوہر کے بھائی کے لڑکے یا بہن کے لڑکے سے شوہر کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتی (جب تک وہ اس شخص کی بیوی ہے)۔ یہ بات سن کر خدائی رگ پھڑکتی، خون جوش مارتا اور آدمی چیخنے لگتا ہے، یہ تجویز خلافِ انسانیت ہے۔ عورت کی فطرت و مزاج کے خلاف ہے۔ جواب میں دینا چاہیئے کہ یہ تجویز دراصل اصل (کلیہ)

کنیزی زوجہ کے خلاف ہے۔ جیسے ایک مال کا ایک مالک ہوتا ہے اور اگر متعدد مالک ہوں بھی نفع اور محصول ایک ہی حاصل کرتا ہے۔ قانونِ مملکت کے واضح اور ضمنی مطالب کی بنا پر بیوی بھی اموال کے ذیل میں آتی ہے، لہذا اسے بھی ایک سے زیادہ مالک نہ رکھنا چاہیے۔"

.....

اسی کتاب کے صفحے ۲۷ پر لکھا ہے:

"ہم یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ جیسے مرد کو چار بیویوں کے رکھنے کا حق ہے، عورت بھی انسان ہے وہ بھی مرد کے برابر ہے۔ اسے بھی مرد جیسے حقوق کا مالک ہونا چاہیے۔ اس صغریٰ، کبریٰ کا نتیجہ مردوں کے لیے بڑا وحشتناک ہے۔ اسی وجہ سے ان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز ہو جاتی ہے، چہرے بھڑک اٹھتے ہیں، آنکھیں آگ برسانے لگتی ہیں، گلے پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگتے ہیں۔ عورت ایک شوہر سے زیادہ مرد کیوں چاہتی ہے؟ ہم اس کے جواب میں نرمی و سرد مہری سے کہتے ہیں۔ مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیوں کرتا ہے؟

ہم فسادِ اخلاق کا پروپیگنڈا نہیں چاہتے۔ ہم خواتین کی عفت و آبرو کو حقیر نہیں جانتے۔ البتہ۔ مردوں کو یہ ضرور سمجھانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے عورت کے بارے میں جو خیالات و نظریات قائم کر لیے ہیں وہ غیر مستحکم بنیاد پر قائم ہیں۔ مرد بھی اکائی ہے، عورت بھی اکائی ہے۔ اس لیے زن و مرد برابر ہیں۔ اگر مردوں کو مردانگی کی بنیاد پر چار عورتوں سے شادی کا حق دیا گیا ہے تو عورت کو بھی یہی حق ملنا چاہیے۔ فرض کیجیے کہ عورت عقل کے زاویے سے بہ نسبت مرد کے عقل میں زیادہ توانا نہ ہو، جب بھی یہ یقین رکھنا چاہیے کہ روحانی تجلی اور نفسیاتی کیفیت عورت

میں مرد سے کم نہیں ہے۔"

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مذکورہ بالا بیانات میں "چند زنی" اور "چند شوہری" نظام میں کوئی فرق نہیں بتایا جا سکا ہے۔ بس ایک ہی بات دھرائی ہے۔ چونکہ مرد زور آور تھا لہٰذا ذاتی نفع کے لیے "چند بیویوں" کی رسم چلالی، عورت آزاد نہ تھی، لہٰذا وہ اپنی کنیزی کے خلاف "چند شوہری" کو رواج نہ دے سکی۔ ہاں مذکورہ بیان میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے "چند زنی" کے رواج اور "چند شوہری" کی ناکامی کا باعث، مرد کی مالکیت اور عورت کی مملوکیت تھی، مرد مالک سمجھا جاتا تھا اس لیے اسے ایک سے زیادہ عورتیں یعنی متعدد اموال رکھنے کا حق تھا۔ عورت مملوک تھی اور مملوک کو ایک مالک سے زیادہ مالک بنانے کا حق نہیں لہٰذا وہ چند شوہری نعمت سے محروم رہ گئی۔

اتفاقاً، مقالہ نگار خاتون کی رائے کے برخلاف "چند شوہری نظام" کا ناکام ہونا دلیل ہے کہ مرد عورت کو مال، نہیں سمجھتا تھا۔ کیونکہ مال میں شرکت، چند آدمیوں کا ایک مال مل کر خریدنے اور سب کا مل جل کر ملکیتی مال سے فائدہ اٹھانے کی رسم پوری دنیا میں جاری ہے۔ اگر مرد، خواتین کو مال سمجھتے تو اس میں شرکت جائز سمجھتے اور سب مل جل کر فائدہ اٹھاتے۔ دنیا میں کہاں کا قانون یہ ہے کہ ایک مال کا مالک ایک سے زیادہ نہ ہو؟ اس کا جواب دیں، پھر ہم سمجھیں گے کہ ایک شوہری کا فلسفہ ملکیت ہے۔

کہتے ہیں: مرد اکائی ہے۔ عورت اکائی ہے۔ لہٰذا دونوں کے حقوق برابر ہونا ضروری ہے۔ مرد چند عورتوں سے فائدہ اٹھائے اور عورت چند مردوں سے فائدہ نہ اٹھائے، کیوں؟

میں کہتا ہوں: آپ کی غلط فہمی یہی ہے کہ تعدد ازدواج کو آپ حقوق مرد میں

شمار کرتی ہیں اور تعدد شوہران حقوق زوجہ میں ۔ حالانکہ تعدد زوجات حقوق زن سے متعلق ہے اور تعدد شوہراں نہ مرد کے حقوق میں ہے نہ عورت کے حقوق سے اس کا کوئی تعلق ہے یہ بات مرد کے مقاصد و منافع کے بھی خلاف ہے اور عورت کے مقاصد و منافع کے بھی حق میں اچھی نہیں ۔ ہم آگے چل کر ثابت کریں گے کہ "قانون تعدد ازواج" اسلام نے عورت کے حقوق کو زندہ و ثابت رکھنے کے لیے منظور کیا ہے اگر اسلام مرد کی حمایت کرنا چاہتا تو وہی اقدام کرتا جو یورپ والوں نے کیا ہے وہاں قانون نے مردوں کو دوسروں کی عورتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا۔ اس نے پہلی بیوی کے علاوہ سب سے بہرہ اٹھالیا، پھر ستم یہ کہ اولاد بلکہ خود اس عورت کے قانونی حقوق بھی تسلیم نہیں کیے ۔

"چند شوہری، عورت کے لیے کوئی فائدہ رسان حق نہیں تھا جو اس سے یہ چھین لیا گیا۔ کہتی ہیں۔ ہم مردوں کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ خواتین کے بارے میں ان کے نظریات خود ان کے پندار کے مطابق مضبوط و ناقابل تبدیلی نہیں ۔

اتفاق دیکھیے کہ ہم بھی یہی چاہتے ہیں ۔ آیندہ مقالات میں تعدد ازواج کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کریں گے" پھر اس مصنف اور دیگر انصاف پسند صاحبان نظر سے التماس ہے کہ ان مقالات کو دیکھیں اور بتائیں کہ کیا اسلام کا نقطۂ نظر کسی تغیر ناپذیر اصل پر مبنی ہے ، یا نہیں ؟ میں ایک شریفانہ وعدہ کرتا ہوں اگر کوئی شخص اس نظریے میں کوئی عیب نکال کر دکھائے تو میں حقوق خواتین کے بارے میں اپنی پوری بحث کو نظر انداز کردوں گا۔

تعدّد ازواج کے تاریخی اسباب

(جغرافیائی علل)

(۲)

"چند ازواجی" رسم کے رواج پانے کے لیے، یہ عامل کافی نہیں کہ مرد ہوس پیشہ ہے اور بے چون وچرا اس کو تسلّط حاصل ہے۔ یقیناً اس کے علاوہ کچھ اور علل و اسباب بھی موثر ہوں گے، ورنہ عیاش مرد کے لیے آسان اور بے دردسری کا راستہ، پھر رائج بازار کی آزاد طوائفوں سے حاصل ہو سکتی تھی، دوست، ساتھی، معشوقہ اور آزادی کی آزادی، ایک پسندیدہ عورت کو بیوی بناتا، اس کے مشکوک بچے کی ذمہ داری سنبھال لیتا۔

بنابریں، جن معاشروں میں "چند ازواجی" رائج تھی وہاں یا تو عیاش وہوس پیشہ افراد کے لیے اخلاقی رکاوٹیں تھیں، یا سماج نے ہوس رانی اور تنوع طلبی کا جرمانہ یہ رکھا تھا کہ قانونی بیوی قبول کرے، اور اس کی اولاد کو اپنی اولاد ماننے اور سب کی دیکھ بھال کرے۔ یا پھر کچھ اور اسباب و وجوہ ہوں گے خواہ وہ جغرافیائی ہوں یا اقتصادی یا سماجی، بہرحال ہوس رانی و تنوع طلبی کا عمل دخل نہیں تھا۔

جغرافیائی عوامل

مان ٹسکو۔ اور۔ گوستاولوبن تو جغرافیائی عوامل ہی پر زور دیتے ہیں۔ ان مفکرین کے خیال میں مشرق کی آب وہوا کا تقاضا ہی تھا کہ ایک مرد کئی بیویاں کرے۔ مشرقی علاقوں میں عورت جلدی بالغ ہوتی ہے اور جلدی بوڑھی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مرد کو دوسری اور تیسری

شادی کی ضرورت پڑتی ہے۔ مزید یہ کہ مشرقی آب و ہوا مرد کی جنسی قوت کے لحاظ سے کچھ ایسی ہے کہ ایک بیوی اسے کافی نہیں ہوتی۔

گوستاولوبن، تاریخ تمدن اسلام و عرب، (ترجمہ فارسی) صفحہ ۵۰۹ پر لکھا ہے۔
"مذکورہ رسم (تعدد ازدواج) فقط مشرق کی آب و ہوا کا نتیجہ تھی۔ آب و ہوا کی وجہ سے نسلی اور طرز زندگی کے خصوصیات دوسروں سے الگ ہوئے۔ یہ نہیں کہ مذہب یہ رسم لایا تھا۔ آب و ہوا، اور قومی خصوصیات ہی وہ عوامل ہیں جو روزمرہ سے زیادہ مضبوط اور اثر انگیز ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم اس بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے۔ مشرقی عورت کی اصل فطرت و طبیعت اور اس کی ساخت، نیز بچے کی پرورش اور بیماریاں جیسے عوارض انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ جلدی ہی مرد سے دوری اختیار کریں موسم، اور قومی خمیر کچھ ایسا ہے کہ مرد اس وقتی علیحدگی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا، لہٰذا تعدد ازدواج لازمی صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

مان ٹسکو، روح القوانین (فارسی ترجمہ) صفحہ ۴۳۰ پر لکھتا ہے:
"جن ممالک میں گرم آب و ہوا ہے۔ وہاں لڑکیاں عموماً، آٹھ نو برس کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہیں۔ اور شادی کے بعد حمل آجاتا ہے۔ یعنی گرم علاقوں میں شادی اور حمل یکے بعد دیگرے ہونے والے عمل ہیں۔"

پیبر یڈو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سوانح میں کہتا ہے:
"آنحضرتؐ نے باون سال کی عمر میں خدیجہ رضوان اللہ علیہا سے عقد کیا اور آٹھ سال کی عمر میں ہم خوابی کی، اسی لیے گرم سرزمین کی خواتین بیس برس میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جب وہ چاہتی ہیں کہ عقل کمال حاصل کریں تو بڑھاپے میں مبتلا ہو چکی ہیں ۔ ۔ ۔ جن ممالک میں موسم معتدل ہوتا ہے، وہاں خواتین کا حسن دیر تک باقی رہتا ہے

دیر میں بالغ ہوتی ہیں۔ جب شادی کرتی ہیں تو زیادتی سن وسال کی وجہ سے تجربہ کار ہوتی ہیں۔ اولاد ہونے کے بعد ان کی عمر ادر آگے جاتی ہے اور میاں بیوی تقریباً ہم سن ہوجاتے ہیں، دونوں کا بڑھاپا ایک ساتھ آتا ہے، دونوں میں برابری برقرار ہوتی ہے، مرد کو دوسری عورت کی ضرورت پیش نہیں پڑتی ......"

اس وجہ سے یورپ میں "تعدد ازدواج کی ممانعت کا قانون اور ایشیا میں اس کا جواز موسم کا "تقاضا ہے ....

یہ توجیہہ کسی حیثیت سے درست نہیں۔ پہلے تو یہی دیکھئے کہ " تعدد ازدواج" کی رسم مشرق کے گرم خطوں میں ہی رائج نہیں۔ معتدل موسم کے علاقوں میں ایران کو لیجئے، یہاں قبل از اسلام بھی یہ رسم جاری تھی۔ مان ٹسکو کا یہ کہنا ــــ گرم خطوں میں عورت بیس برس میں بوڑھی ہوجاتی ہے، ایک بے حقیقت خرافات ہے۔ اور اس سے زیادہ لاف زنی ــــ پیر دیڈو ــــ نے کی، کہ پیغمبر اسلام ؐ نے پانچ برس کی عمر میں حضرت خدیجہ رضؓ سے عقد کیا۔ اور آٹھ برس کی عمر میں ہم خواب ہوئے۔ سب کو معلوم کہ آنحضرت ؐ نے اپنی پچیس برس کی عمر اور حضرت خدیجہ کی چالیس برس کے سن سے زیادہ میں شادی کی تھی۔

دوسرے، اگر عورت کا جلدی بوڑھا ہونا، اور مرد کی جنسی طاقت کا ہیجان، ہی اس رسم کا سبب ہوتا تو مشرقی اقوام نے مغربی علاقوں کے وسطی دور اور جدید زمانے کے رواج کیوں نہ اپنائے، یعنی تعدد ازدواج کے بجائے، رنڈی بازی اور عیاشی کیوں نہ اختیار کی، کیونکہ بقول گوستاو لوبن، ایک بیوی کا فقرہ تو مغرب کے قانونی کتب میں تو ہے لیکن سماج میں اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔

نیز بقول اسی مصنف کے۔ مشرقی علاقوں میں تعدد ازدواج قانونی صورت میں

تو ہے ہی ، رسمی طور پر یہ آبرومندانہ معاہدہ قبول کیا جاتا ہے اور ان بیویوں کی اولاد
کو ان کا باپ بخوشی اپنی فرزندی میں لے تا ہے ۔ مغرب میں متعدد رفقاءِ حیات
مکارانہ و غیر قانونی طور پر پائی جاتی ہیں ۔ یعنی معشوقہ سازی و رفیقہ بازی کے انداز
میں باہمی معاہدے اور پدری ذمہ داری اولاد سے آزاد ۔

یورپ میں چند ازدواجی رسم کی صورت حال : میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تھوڑی تفصیل مغرب میں " چند ازدواجی "
رسم کے بارے میں لکھتا چلوں ، وہاں قرون وسطی میں کیا ردیہ تھا ۔ مغرب ہی کے
ایک محقق کا بیان ناظرین ملاحظہ کریں ۔ اور وہ لوگ بھی سنیں جو ایشیا کو " تعدد
ازدواج " اور کبھی " حرم سرائی " نظام کے نام سے قابل تنقید اور مشرق کی شرمندگی
کی بات سمجھتے سمجھاتے ہیں ۔ یہ معلوم رہے کہ ایشیا میں بہت سے عیب اور متعدد
رسوائیوں کی باتیں ہوں گی ، اس کے باوجود جو ماجرا یورپ میں گذرتا ہے وہ ہزار درجہ
فضیلت و شرافت مندانہ ہے ۔

" ویل ڈیورانٹ " تاریخ تمدن ، جلد ۷ ، میں " سستی اخلاق " کے نام سے
ایک فصل قائم کر کے ، اٹلی کی عہد رنسانس میں عام اخلاقی رذیلوں کی تفصیل لکھتا ہے ۔
" اخلاق و روابط جنسی " کے ذیل میں جو کچھ ہے اس کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے ۔

ویل ڈیورانٹ ، بطور تمہید کچھ باتیں یوں کرتا ہے ، جیسے معذرت خواہی کر رہا
ہو ۔ کہتا ہے :-

" غیر مذہبی عوام کی اخلاقی حالات اور جنسی تعلقات کے بارے میں یاد
کرادوں کہ مرد ، ذاتی طور پر چند ازدواجی فطرت کا مالک ہے ، اور فقط
طاقت ور ترین اخلاقی پابندیاں ، غربت اور محنت کی ایک خاص حد اور
بیوی کی مناسب دیکھ بھال مرد کو ایک بیوی برداشت کرنے پر مجبور کر سکتی ہے "

اس کے بعد وہ اصل مدعا پر آتا ہے:

"معلوم نہیں، رنسانس کے عہد تک، قرون وسطیٰ میں شوہر دار خواتین سے زنا کم تھی، اور جس طرح قرون وسطیٰ میں پہلوانی کے پردے میں زنا خوبصورت عمل قرار دیا گیا تھا، اسی طرح رنسانس کے دور میں یہی عمل طالب علم لڑکیوں کے واسطے، دل کشی، اور نسوانی جادوگری کے نام سے عام تھا.....

اونچے خاندانوں کی لڑکیاں، بڑی حد تک خاندان سے باہر کے مردوں سے الگ اور چھپا کر رکھی جاتی تھیں۔ شادی سے پہلے ان کو پاک دامنی کی تعلیم دی جاتی تھی، کبھی اس تعلیم کے دور رس نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں ایک واقعہ ہے کہ ایک جوان خاتون نے ناموس لوٹنے کے بعد دریا میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ مگر یہ مثال اکیلی تھی۔ کیونکہ اس کی موت کے بعد پادری کو اس کا مجسمہ بنانے کی فکر ہوئی۔

شادی سے پہلے کے قصے قابل توجہ تھے۔ رنسانس کے اٹلی میں ہر شہر کے اندر ناجائز بچوں کے وجود کی دلیل زنا کے علاوہ کیا ہو سکتی تھی۔ ناجائز اولاد کا کسی گھر میں نہ ہونا عزت کی بات تھی مگر حرامی اولاد کا وجود کوئی رسوائی کا سبب بھی نہ تھا۔ عام رواج کے مطابق شادی کے وقت ہی مرد اپنی بیوی کو ناجائز اولاد گھر میں لانے کی تشویق کرتا تھا۔ تاکہ دوسرے گھر کے بچوں کے ساتھ وہ بھی پرورش پائے۔ حرام زادہ ہونے سے کسی کی عزت کم نہ ہوتی تھی۔ اور سماج کی طرف سے جو داغ لگایا جاتا تھا، اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ مزید براں اس لڑکے کا جائز ہونا بھی مشکل نہ تھا، چرچ کے ممبروں کو رشوت دیکر سند حاصل کی جا سکتی تھی۔ اگر جائز اولاد نہ ہوتی تو باصلاحیت ناجائز لڑکا تخت و تاج شاہی کا وارث بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی مثال فرینٹ اول (FERRANTE) نیپلز (NAPLES) کے بادشاہ، الفانسو اول

(LEO - ڈی ایسٹ ، لیونی لو - یا - کا جانشین ہوا (ALFONSO - 1
(NICCOLO III)
(NELLO D'ESTE ، فیرارا (FERRARA) کے حکمران نکولو سوم
کا جانشین ہوا تھا۔ ۱۴۵۹ء میں جب پیوس دوم (II - PIUS) فیرارا آیا تو
سات شاہزادوں نے اس کا استقبال کیا ، یہ ساتوں شاہزادے ہلال زادے
نہ تھے ۔ رانسانس کے عہد میں حلال زادوں اور حرام زادوں میں بڑی رقابت اور
کشمکش رہی .... رہی ہم جنسی تعلقات کی بات تو یونان قدیم کی ایک
رسم کا جبری احیا ہوا ......

سان برنارڈینو (SAN.BRNARDINO) نے یہ شرمناک عمل اتنا دیکھا
کہ شہر کی قسمت کو سدوم اور عمورہ کی سرنوشت کہہ کر ڈرایا۔ اریٹی نیو (ARE -
TINO) نے بھی روم میں اس بداخلاقی کا مشاہدہ اسی فراوانی سے کیا .....

دوسری فحاشیوں کے سلسلے میں بھی یہی باتیں کی جا سکتی ہیں۔ "این فسورا"
(INFESSURA) کو پوپ نشین روم میں اپنے شماریات کی اہمیت بڑھانے کے شوق
نے کہا ۔ ۱۴۹۰ء میں ۹۰ ہزار کی رومی آبادی تھی اور ۶۸۰۰ طوائفوں کے
نام درج دفتر تھے ۔ اور اس تعداد میں چھپ کر اور بغیر لائسنس کی طوائفوں کا
شمار نہیں ہے ۔ وینس کے شماریات ۱۵۰۹ء کے مطابق ۱۱۶۵۴ فاحشہ
عورتیں تھیں ، جبکہ شہر کی آبادی تین لاکھ تھی ...... پندرھویں صدی میں
جو لڑکی پندرہ برس کی عمر تک شوہر کے گھر نہ جا سکتی تھی وہ ننگ خاندان سمجھی
جاتی تھی ۔ سولھویں صدی میں "رسوائی کی عمر" سترہ سال تک کر دی گئی ، تاکہ
لڑکی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے ۔ جن مردوں کو عیاشی کی تمام تر سہولتیں حاصل تھیں ، وہ
صرف اس وقت شادی پر مائل ہوتے تھے جب لڑکی اپنے ساتھ قابلِ کشش
جہیز لائے .... قرونِ وسطیٰ کے قوانین ازدواج کے مطابق ، شادی کے دوران

دونوں کے تعلقات دیکھے جاتے تھے کہ میاں بیوی میں محبت پختہ ہو جائے، خوشی اور غمی، خوشحالی و تنگی میں ایک دوسرے کے ساتھی اور غمخوار رہیں، عام طور پر یہ آرزو پوری بھی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود شادی شدہ عورتوں سے بدکاری کا رواج تھا اونچے درجے کے آدمیوں میں شادیاں ڈپلومیٹک اور سیاسی و اقتصادی اتحاد کیلئے ہوتی تھیں، بہت سے شوہر، کسی محبوب داشتہ سے تعلق اپنا حق جانتے تھے۔ بیوی کو ناگوار بھی ہوتا تو انھیں لب بند رکھنے پر مجبور ہوتی تھی۔

متوسط طبقے میں کچھ لوگ تفریحی بدکاری کو جائز سمجھتے تھے۔ میکیاولی اور اس کے دوست اپنی بیوفائیوں کی داستانوں سے رنجیدہ نہیں ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر جب بیوی اپنے شوہر کی تقلید میں شوہر ہی سے انتقام لیتی تھی تو عموماً شوہر اس کے اقدامات سے چشم پوشی کرتے اور غیرت کی ٹوپی ذرا اور اونچی کر لیتے تھے۔

جی، یہ تھی عوامی زندگی ان حضرات کی جو تعدد ازدواج کو مشرق کا ناقابل معافی جرم سمجھتے تھے اور کبھی کبھی اس علاقے کے موسم کو بقول ان کے، اس غیر انسانی عمل کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔ مگر ان کا علاقہ، ان کا موسم اور ان کا ماحول انھیں بیوی سے بے وفائی اور ایک بیوی سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

ضمناً، یہ نکتہ بھی بن کہا نہ رہ جائے کہ قانونی (شرعی) طور پر کئی بیویاں رکھنے نہ رکھنے کا دستور اہل یورپ ہیں، اچھے برے سے بحث کئے بغیر اصل دین عیسوی سے غیر متعلق ہے۔ دین مسیحؑ میں کئی بیویاں نہ رکھنے کا کوئی حکم ہے ہی نہیں۔ بلکہ حضرت مسیحؑ توراۃ کے ضابطوں کی تائید کرتے ہیں اور توراۃ میں کئی بیویوں کو قانوناً تسلیم کیا گیا ہے۔ بنا بریں ہمیں تو یہ کہنا چاہئے کہ دراصل دین مسیحؑ میں کئی بیویاں جائز قرار دی گئی ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پرانے مسیحی کئی کئی بیویاں رکھتے تھے۔ لہٰذا یورپ والوں کا کئی بیویوں کے قانونی نظام سے الگ رہنا ایک یا متعدد اسباب پر

مبنی ہوگا، مذہب تو علت نہیں ہے۔

ماہواری :

کچھ لوگوں نے تعدد ازواج کا سبب تبایا ہے کہ ماہانہ بیماری، اور مدت ماہواری میں مرد کو لذت اندوزی سے روکنے کا احساس، پھر بچہ جننے سے تھکن اور علیحدگی کی خواہش، بچہ کی خوراک و پرورش کا مسئلہ، ایک بیوی سے زیادہ تقاضا کرتا ہے۔

ویل ڈیورانٹ کے بقول:

"ابتدائی معاشرتوں میں بیوی جلدی بوڑھی ہوجاتی ہے اور مرد سے دوسری شادی کی خواہش کرتی ہے تاکہ اپنے بچوں کے کھانے پینے کا انتظام کر سکے اور تولید اولاد میں درمیانی فاصلہ بڑھا سکے اور مرد کے شوق تولید اور جنسی عمل میں رکاوٹ نہ بنے، عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ پہلی بیوی، اپنے شوہر سے دوسری شادی کی فرمائش اس لئے بھی کرتی تھی کہ اس کا کام ہلکا ہو، اور نئی خاتون سے بچے ہوں۔ جس سے فائدہ اور سرمایہ بڑھے۔"

بلاشبہ، عورتوں کی ماہانہ بیماری، اور بچہ جننے سے تھکن، کی بنا پر جنسی عمل میں دونوں دو الگ سمتوں میں واقع ہوتے ہیں، اس بنیاد پر مرد کو کچھ نہ کچھ دوسری عورت کا خیال آتا ہے لیکن دونوں مذکورہ علتیں مستقل سبب تعدد ازواج نہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ اخلاقی یا سماجی رکاوٹ موجود ہو جو مرد کو اس کی آرزو پورا کرنے اور معشوق بنانے یا آزاد زن پرستی کا عمل نہ کرنے دے۔

خواتین کی زچگی کا سن محدود ہوتا ہے

بعض حضرات کے خیال میں مرد کے برخلاف خواتین کی تولیدی قوت ایک خاص

عمر تک رہتی ہے۔ پھر وہ "یائسہ" ہو جاتی ہے، یہ بھی تعدد ازدواج کی وجہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بیوی اس وقت "یائسہ" ہو جب یا تو شوہر کے لئے اولاد کافی نہ پیدا ہوئی یا وہ بچے فوت ہو چکے ہوں۔

مرد کا رجحان فرزند طلبی، اور بیوی کو طلاق نہ دینے کا خیال سبب ہوتا ہے کہ دوسری یا تیسری بیوی گھر میں لائے، جیسے پہلی بیوی کا ناقابل تولید ہونا شوہر کے لئے دوسری بیوی کا محرک ہے۔

اقتصادی اسباب

تعدد ازدواج کے اقتصادی اسباب و عوامل کا بھی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں، اس زمانے کے برعکس پرانے زمانے میں زن و فرزند کی کثرت اقتصادی طور پر مرد کے لئے نفع بخش چیز تھی۔ مرد، اپنے بیوی بچوں سے غلاموں کی طرح بیگار لیتا تھا، کبھی اپنے بچوں کو بیچتا بھی تھا۔ بہت سے افراد کی غلامی، جنگی قیدی ہونے کی بناء پر نہیں بلکہ ان کے باپوں نے انھیں بازار میں لے جا کر بیچا تھا۔

تعدد ازواج کی یہ توجیہ ممکن ہے صحیح ہو، کیونکہ فقط یہی ایک طریقہ ہے کہ مرد قانونی بیوی کے ذریعے کثرت اولاد سے فائدہ اٹھائے، محبوباؤں کی تلاش اور رنڈی بازی سے مرد یہ خصوصیت حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس سبب کو ہر ایسے معاشرے میں موثر نہیں مانا جا سکتا، جہاں کثرت ازدواج کی رسم موجود ہو، یعنی یہ سبب عام سبب نہیں ہے۔

فرض کریں کہ شروع شروع میں اقوام و قبائل اسی وجہ سے متعدد شادیاں کرتے تھے، لیکن سب قومیں ایسی نہ تھیں۔ پرانی دنیا میں کئی بیویاں رکھنے کی رسم اس طبقات میں رائج تھی۔ جو شان و شوکت، شخصیت و امتیاز کے ساتھ زندگی گذارنے

والے تھے۔ بادشاہ، امیر، سردار، مذہبی رہنما اور خاص تاجر جیسے لوگ۔
معلوم ہے کہ یہ طبقات بیویوں اور اولاد کی فراوانی سے کوئی اقتصادی فائدہ حاصل نہیں کرتے تھے۔

تعداد و خاندان ایک سبب

کثرتِ اولاد، اور خاندان کی نفری بجائے خود ایک اور عامل تھا کہ کئی شادیاں کی جائیں۔ زن و مرد کو دو مختلف جہتوں اور دو فرقِ مراتب رکھنے والی ایک بات یہ بھی ہے کہ ایک عورت جس تعداد میں بچے پیدا کر سکتی ہے، وہ محدود اور گنتی کے ہیں، خواہ ایک شوہری نظام ہو یا چند شوہری۔ لیکن مرد کی قوتِ تولید، زیر اختیار عورتوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ ممکن ہے ایک مرد سینکڑوں عورتوں سے ہزاروں بچے پیدا کروا سکے۔

آج کی دنیا کے برخلاف، پرانے زمانے میں ایک اور اہم عامل یہ تھا کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔ لڑکیوں کی شرح پیدائش لڑکوں سے زیادہ نہ اس وقت تھی نہ اب ہے۔ اگر اتفاقاً کچھ علاقوں میں لڑکیوں کی شرح پیدائش زیادہ ہو بھی تو دوسرے علاقے میں اس کے برعکس ہے وہاں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہو گی۔ ایک چیز ضرور ہے اور وہ ہے مردوں کی شرح اموات کا عورتوں سے زیادہ ہونا۔ مردوں کی شرح اموات ہمیشہ ایک سبب رہا ہے کہ اگر ایک بیوی کے دستور پر قائم رہا جائے تو عورتوں کی بڑی تعداد، قانونی شوہر، گھر، زندگی اور جائز اولاد سے محروم رہے گی۔

ابتدائی زمانے کے معاشرے میں ایسا ہی تھا، بحث کی بات ہی نہیں، ہم ویل ڈیورانٹ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ:

سماج کی پہلی منزل میں جنگ و شکار کی وجہ سے مردوں کی زندگی خطرے میں رہتی تھی۔ اور مرد، عورتوں سے زیادہ مرتے تھے۔ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی سبب سے یا کئی بیویوں کا نظام رواج پاتا یا عورتیں بے شوہر کے رہتیں۔

تحقیق

تاریخی لحاظ سے جن عوامل و اسباب کو "تعدد ازدواج" کی اساس مانا جا سکتا ہے وہ یہی ہیں جو ہم نے بیان کیے۔ لیکن جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ان عوامل و اسباب میں کچھ علتیں حقیقی نہیں، تعدد ازدواج کے ذیل میں ان کا تذکرہ بلاوجہ کیا جاتا ہے، جیسے موسم۔ اس کے علاوہ مزید تین قسموں کے علل و اسباب کا مزید جائزہ لیجیے۔

پہلی قسم ان علل و اسباب کی ہے، جن کے اثر سے مرد تعدد ازدواج کی طرف مائل ہونا ممکن ہے، یعنی مرد کے لئے وجہ جواز تو کوئی نہیں، مگر زور و ظلم و استعداد کا پہلو قوی ہے۔ اقتصادی عامل بھی اسی قسم کا ہے، اور ہم اس پر توجہ دلا چکے ہیں۔

دوسرے علل کا قانونی زاویہ سے مطالعہ کرنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ وہاں کوئی وجہ جواز مرد یا معاشرے کے واسطے موجود ہو۔ مثلاً بیوی کا بانجھ ہونا یا اس کا "یائسہ" (ماہواری بند ہونے کی عمر کی عورت ہونا) دوسری طرف شوہر کا محتاج فرزند یا قبیلے اور ملک کا طالب کثرت آبادی ہونا۔ یہاں کلیہ کے طور پر زن و مرد کی فکری عوامل کو اس زاویے سے دیکھا جائے گا کہ جنسی آسودگی یا تولید نسل کی بنیاد پر دونوں کی نوعیت غیر مساوی ہے۔ اسی پہلو کو تعدد ازدواج کے لئے وجہ جواز قرار دیا جا سکتا ہے۔

تیسرے علل کا وہ حصہ ہے، جسے تیسری نوع میں اس وقت شمار کیا جا سکے گا

جب یہ فرض کرلیں کہ وہ گذشتہ صدیوں میں موجود بھی تھے، یا آج وہ علل موجود ہیں ان میں سے بعض اسباب تو اتنے مؤثر ہیں کہ نہ صرف وہ تعدد ازدواج کا جواز مہیا کرتے ہیں بلکہ اس سے تو مرد پر عورت کا ایک واجب الادا حق عائد ہوتا ہے، اور فقط عورت ہی نہیں، معاشرے اور سماج کی ذمہ داری بھی یہی ہو گی کہ مرد کئی شادیاں کرے، اس کی علت عورتوں کی عددی اکثریت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ فرض کریں گذشتہ دور یا موجود زمانے میں شادی کے قابل لڑکیاں، شادی کے قابل لڑکوں سے زیادہ ہوں اور ایک شادی ہی قانونی قرار دی جائے۔ تو بن بیاہی اور گھریلو زندگی سے محروم خواتین کا ایک طبقہ سماج میں موجود ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ تعدد ازدواج، محروم عورتوں کی طرف سے ایک "حق" اور مردوں اور گھریلو عورتوں کے کاندھے پر ایک قانونی پابندی آپڑے گی، کہ بن بیاہی اور عائلی زندگی سے محروم عورتوں کو آباد کریں تاکہ وہ بھی خانگی زندگی حاصل کرسکیں۔

گھریلو زندگی سب سے زیادہ انسان کا فطری حق ہے۔ کسی بشر کو کسی نام اور کسی عنوان سے اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ خانگی زندگی ایک حق ہے جو، ہر فرد اپنے معاشرے میں پیدا کرتا ہے اور معاشرہ کوئی ایسا اقدام نہیں کرسکتا جس کے نتیجے میں سماج کا کوئی گروہ اس حق سے محروم رہ جائے۔ اس حق کی نظیر، روزگار، روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم و تربیت اور آزادی، ہر بشر کا اولین حق اور حقیقی حق ہے۔ یہ حق کسی نام و عنوان سے چھینا نہیں جاسکتا۔ عائلی زندگی بھی ایک فطری حق ہے اور جب شادی کے قابل عورتوں کی تعداد شادی کے لائق مردوں کی نفری سے زیادہ ہو تو "صرف ایک بیوی" کا قانون، مذکورہ فطری حق کے خلاف ہے لہٰذا یہ قانون بھی حقوق فطری بشر کے خلاف ہوگا۔

* * *

ماضی کے بارے میں تو یہ سب کچھ ہو گیا، سوال یہ ہے کہ آج کیا کہا جائے؟ کیا آج بھی ان اسباب کا وجود ہے جن کی بنا پر کئی بیویاں رکھنے کا جواز نکلتا ہے اور وہ علت بھی موجود ہے جو تعدد ازدواج کو بطور "حق" فرض کرتی ہے۔ یا آج ان چیزوں کا وجود نہیں ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر یہ مؤثر اسباب موجود ہیں تو پہلی بیوی کا حق کیا ہوگا؟ ان سوالوں کے جواب آئندہ فصل میں آرہے ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

"ایک بیوی کئی شوہر" کی رسم ختم و ناکام ہونے، نیز "ایک شوہر کئی بیویوں" کی کامیابی کے اسباب و علل پر گفتگو ہو چکی۔ ہم نے "تعدّد ازواج" کی رسم شروع ہونے پر متعدد اسباب بیان کیے اور ان پر روشنی ڈالی۔ اس کا ایک سبب جنس مرد کے نفسیات میں حکومت و استبداد کا جذبہ ہے۔ ایک وجہ زن و مرد میں فطری ساخت کا فرق ہے، دونوں میں سن و سال کے لحاظ سے تولید نسل کی صلاحیت، اور تولید فرزند کی تعداد میں امکانات کا اختلاف بھی "تعدّد ازواج" کا جواز بن سکتا ہے۔

لیکن جو خاص "علت" پوری تاریخ میں اثر انداز رہی ہے وہ ہے تعدّد ازواج، عورت کا مرد پر ایک "حق" اور براہ راست مرد کا ایک "فرض" ہے۔ اور وہ علت ہے، قابل نکاح خواتین کی عددی کثرت اور شادی کے قابل مردوں کی کمی ہے۔

ہم طول کلام سے بچنے کے لیے ان علتوں پر بحث چھوڑ رہے ہیں جو اگرچہ وجوب "چند زنی" کے لیے کافی نہیں مگر مرد کے لیے "وجہ جواز" ضرور ہیں۔ ہم اپنی گفتگو اس علت" پر محدود کرتے ہیں کہ اگر وہ علت موجود ہو تو تعدّد ازواج، عورتوں کے طبقے کا "حق" ضرور بنتا ہے۔

مذکورہ دعوے کے ثبوت سے پہلے دو باتیں بطور تمہید واضح ہونا ضروری ہیں:

۱۔ حتمی و یقینی شماریات کی رو سے یہ ثابت ہونا چاہیئے کہ قابل شادی عورتوں کی تعداد، شادی کے قابل مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

۲۔ اگر ایسی سند مل جائے تو حقوق انسانی کی رو سے محروم خواتین کا ایک حق، مردوں اور خانگی عورتوں کے ذمے عائد ہو جائے گا۔

پہلی بات: خوش قسمتی ہے، آج کی دنیا کے پاس، اس بارے بڑی حد تک صحیح شماریات موجود ہیں۔ دنیا بھر کے ممالک چند سال بعد مردم شماری کرتے ہیں۔ مردم شماری کی مہم ترقی یافتہ ملکوں میں بڑے اہتمام سے انجام دی جاتی ہے۔ اس طرح مرد و زن کی الگ تعداد ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس سے مختلف برسوں میں عورت و مرد کی اوسط تعداد بھی دریافت ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بھی علم میں آجاتا ہے کہ ۲۰ سے ۲۴ سال کے لڑکوں کی تعداد کیا ہے اور اسی عمر کی لڑکیاں کتنی ہیں؟ ہر عمر کے افراد معلوم ہو سکتے ہیں۔ ادارہ اقوام متحدہ، اپنے سال مردم شماری میں ان اعداد و شمار کی اشاعت کرتا ہے۔ غالباً اب تک سولہ رپورٹیں شائع ہو چکی ہیں۔

۱۹۶۴ء کی مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۶۵ء میں چھپی تھی۔ اس نکتہ پر توجہ دلانا ضروری ہے کہ ثبوت مدعا کے لیے، ہر ملک کے مردوں کی تعداد اور عورتوں کی مجموعی تعداد کیا ہے، یہی جاننا کافی نہیں ہے۔ مفید و لازم تو یہ معلوم کرنا ہے کہ شادی کے "قابل لڑکوں اور شادی کے قابل لڑکیوں کی اوسط کیا ہے؟ کیونکہ قابل شادی مردوں اور شادی کے قابل عورتوں کی تعداد ان کے مجموعی اوسط سے عموماً مختلف ہو گی۔ اس کے سبب دو ہیں:

۱۔ لڑکیوں کے بلوغ کا زمانہ، لڑکوں کے زمانۂ بلوغ سے پہلے آتا ہے، جب ہی تو دنیا بھر کے قوانین میں لڑکیوں کا قانونی سن لڑکوں کے قانونی سن سے کم ہے عملی طور پر دنیا کی اکثریت میں شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے سے کم از کم پانچ سال چھوٹی ہوتی ہے اور شوہر اوسطاً بیوی سے پانچ برس بڑے ہوتے ہیں۔

۲۔ سب سے اہم اور بنیادی علت یہ ہے کہ اگرچہ لڑکیوں کی پیدائش، لڑکوں کی پیدائش سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے، چند علاقوں میں تو لڑکوں کی پیدائش

کی شرح زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمیشہ جنس ذکور کی موت کا اوسط جنس اناث سے زیادہ ہے، اس سے شادی کی عمروں میں فرق پڑ جاتا ہے اور کبھی تو بہت زیادہ فرق نظر آنے لگتا ہے یوں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد، شادی کے قابل مردوں سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے لہٰذا ممکن ہے، ایک ملک میں ذکور کی تعداد اناث کی مجموعی تعداد سے مساوی یا زیادہ ہو، لیکن شادی کے قابل درجے میں، یعنی شادی کے قانونی عمر تک پہنچتے پہنچتے صورت حال برعکس ہو جائے

مردم شماری کی رپورٹ ۱۹۶۴ء جو اقوام متحدہ کا اس بارے میں آخری نشریہ ہے، (جب زیر نظر بحث لکھی گئی تھی) اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔

مثلاً اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق کوریا کی مجموعی آبادی ۲۶،۲۷۷،۶۳۵ تھی ان میں مردوں کی تعداد ۱۳،۱۴۵،۲۸۹ تھی اور خواتین کی تعداد تھی ۱۳،۱۳۲،۳۴۶۔ یعنی کل آبادی میں سے ۱۲۹۴۳ مرد، عورتوں سے زیادہ تھے۔ اس تعداد میں ایک سال سے کم عمر کے بچے، ایک سال سے ۴ برس تک اور پانچ برس سے نو برس تک اور بارہ برس سے چودہ، پندرہ سے انیس برس تک کی عمر کے بچے بھی شریک ہیں۔

شماریات بتاتے ہیں کہ ان عمروں میں ذکور کی تعداد اناث سے زیادہ ہے۔ لیکن بیس برس سے چوبیس برس تک کے ٹوٹل میں یہ نسبت بدل جاتی ہے۔ اس سن میں ۱،۰۸۳،۳۶۴ ذکور اور ۱۱۱۰۰۵۱ عورتیں۔ اور اس کے بعد قانونی شادی کے لئے زن و مرد کی عمروں کا حساب کریں تو عورتیں، مردوں سے زیادہ نکلتی ہیں۔

جمہوری کوریا کے شماریات استثنائی ہیں، وہاں مردوں کی مجموعی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے۔ اس کے برخلاف اکثر ممالک میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے، یہ زیادتی، شادی کی عمر کے حساب سے بھی برقرار رہتی ہے۔

روس کی مجموعی آبادی ۲۱۶،۱۵۱،۰۰۰ ہے، اس میں مرد ۹۷،۸۴۰،۰۰۰ عورتیں ۱۱۸،۲۶۱،۰۰۰ ہیں، یہ فرق شادی سے پہلے کی عمر تک ہے، شادی کی عمر، یعنی بیس سال

سے چوبیس سال، اور پچیس سال سے انتیس، تیس سے چونتیس تا نیز اسی برس سے چوراسی سال تک یہی نسبت برقرار رہتی ہے۔

انگلستان، فرانس، مغربی جرمنی، مشرقی جرمنی، چیکوسلوا کیہ، پولینڈ، رومانیہ، ہنگری، امریکہ اور جاپان میں یہی تناسب ہے۔ بعض علاقے ایسے ہیں جہاں اختلاف ہے مثلاً مشرقی و مغربی جرمنی میں فرق تناسب زیادہ نمایاں ہے۔

ہندوستان میں، عام طور پر اور عمر ازدواج میں خاص طور پر مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے۔ البتہ پچاس برس اور اس کے اوپر عورتیں زیادہ، مرد کم ہوجاتے ہیں۔ بظاہر عورتوں کی کمی کا سبب ہندوستان کی وہ قدیم رسم ہے کہ جس میں بیوہ کو معاشرے سے ختم کر دیا جاتا ہے۔

گذشتہ سال ایران کی مردم شماری میں یہ بات سامنے آئی کہ ایران استثنائی ملک ہے جہاں مردوں کی تعداد عورتوں سے زیادہ ہے اس رپورٹ کے مطابق ایران کی مجموعی آبادی ۲۵،۷۸۱،۰۹۰ ہے۔ اس میں سے مردوں کی تعداد ۱۳،۳۳۷،۳۳۴ ہے اور عورتیں ۱۲،۴۴۳،۷۵۶ ہیں۔ ٹوٹل میں ۸۹۳،۵۷۸ مرد، عورتوں سے زیادہ ہیں۔

مجھے یاد ہے، اُن دنوں، تعدّد ازواج پر بحث کرنے والوں نے لکھا تھا۔ دیکھیے، تعدّد ازواج کے حامیوں کے دعوے کے برخلاف، ہمارے ملک میں مردوں کی تعداد، عورتوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ اس بنا پر قانونِ تعدّد ازواج کو ختم کر دینا چاہیے۔

مجھے ان دنوں تعجب ہوا تھا کہ یہ لکھنے والے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ پہلے تو قانونِ تعدّد ازدواج ایران ہی سے مخصوص نہیں۔ دوسرے یہ کہ موضوع سے مربوط و مفید بات تو یہ ہے کہ آیا شادی کے قابل مرد، ان عورتوں سے زیادہ ہیں جو شادی کے لائق ہیں، یا کم ہیں؟ فقط یہ کہنا کہ مردوں کی تعداد، عورتوں سے زیادہ ہے، زیر نظر مقصد کے لیے کافی نہیں ہے۔ ابھی دیکھا ہے کہ جمہوری کوریا اور دوسرے ممالک میں بھی مرد زیادہ ہیں۔

لیکن شادی کے قابل افراد کی نسبت سے مردم شماری کی رپورٹ دیکھی تو عورتوں کی تعداد زیادہ نکلی۔ ایران جیسے ممالک کی مردم شماری کے قابل اعتبار نہ ہونے سے قطع نظر، اگر صرف ایران میں عورتوں کے رجحانِ پسر زائی کو پیشِ نظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ ایرانی عورت مردم شماری کے آدمیوں کے جواب میں لڑکی پیدا ہونے کی جگہ، یہی کہیں گی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہوا ہے اور وہ لڑکا ہی لکھوائیں گی۔ یہی بات، مردم شماری کی رپورٹ سے اعتماد اٹھانے کے لیے کافی ہے۔ ملک میں ہر جگہ منگنیوں اور رشتہ مانگنے کی رسم جس کثرت سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے، کیونکہ تعدّدِ ازدواج کی رسم اس ملک کے شہروں اور دیہاتوں حتیٰ کہ قبائل میں بھی عام تھی اور اب بھی ہے کبھی کسی نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہاں خواتین کم ہیں۔ کبھی عورت کی بلیک مارکیٹ نہیں ہوئی، اس کے برعکس ہمیشہ رشتے کی خواہش کے چرچے عام رہے۔ لڑکیاں، بیوہ خواتین، یا کسی وجہ سے شادی سے محروم جوان عورتیں مجرّد مردوں سے زیادہ موجود ہیں۔ بدصورت و غریب مرد بھی شادی کی طلب گاری کے لیے نکلے ہیں تو ناکام نہیں ہوئے، مگر لڑکیوں کی صورت اس کے برعکس ہے اور بے چاری لڑکیاں مجبوراً بے شوہر کے رہ گئی ہیں۔ یہ بات اتنی عام اور ہر جگہ ہوتی ہے کہ ہر رپورٹ اور شماریات سے زیادہ یقینی ہے۔

"اشی لے مونٹیگیو" نے "زن جنسِ برتر" میں ایک بے معنی بحث "عورت کا آرائش پسند ہونا سماجی مطالبہ کا نتیجہ ہے" اور اسی ضمن میں اس نے کہا۔ "پوری دنیا میں، ہمیشہ شادی کے قابل عورتوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔"

سنہ ۱۹۵۰ء کی مردم شماری سے نشاندہی ہوتی ہے کہ امریکہ میں شادی کے قابل عورتوں کی تعداد اندازاً دس لاکھ، تیس ہزار اور چار سو ہے، یہ تعداد مردوں سے زائد ہے۔

(زن روز شمارہ ۶۹ صفحہ ۱۱)

برٹینڈرسل نے شادی و اخلاق پر جو کتاب لکھی ہے، اس میں بحث میں صفحہ ۱۱۵ پر لکھا ہے:-

"آج کے انگلستان میں بیس لاکھ سے زیادہ ایسی خواتین ہیں جو مردوں سے زیادہ ہیں اور روزمرہ کے مطابق ان کو ہمیشہ بے اولاد رہنا ہے۔ اور یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔"

چند سال پہلے ایرانی اخبارات میں یہ خبر پڑھی تھی کہ جرمن میں جنگ عظیم دوم کے نتیجے میں بے شوہر عورتوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ "قانونی شوہر اور گھریلو زندگی سے محرومی کے سبب ان عورتوں نے حکومت سے "یک شوہری" قانون کے خاتمے کا مطالبہ کیا تاکہ ایک شوہر کئی کئی شادیاں کر سکے۔ حکومت نے اسلامی دانشگاہ "الازہر" سے سرکاری طور پر کوئی فارمولا طلب کیا۔ پھر ہم نے دریافت کیا تو اطلاع ملی کہ چرچ نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ دراصل کلیسا کی نظر میں خواتین کی محرومی یا بدکاری کی فراوانی صرف اس لئے قابل قبول ہے کہ تعدد ازدواج ایک مشرقی و اسلامی فارمولا ہے اور اسے کسی حالت میں قبول نہ کرنا چاہئے۔

شادی کے قابل عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں عددی کثرت کے علل و اسباب

کیا علت ہے؟ کیا وجہ ہے کہ لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہونے کے باوجود شادی کے لائق عورتیں مردوں سے زیادہ ہیں؟

اس کی علت و وجہ ظاہر ہے۔ مردوں کی شرح اموات عورتوں کی شرح اموات سے زیادہ ہے۔ جانی نقصانات کا زمانہ عموماً وہ عمر ہے جب مرد شادی کے قابل ہوتا ہے یا اس کے قریب، ناگہانی حادثات پر غور کریں۔ اور حوادث پر نظر ڈالیں جنگ۔ غرق۔ بلندیوں سے گرنا۔ عمارتوں میں دبنا۔ ٹکر یا ایکسیڈنٹ۔ جیسے حادثات جنس ذکور سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔

بہت کم ایسے حادثات میں عورت دکھائی دیتی ہے۔ انسان کا انسان سے مقابلہ جو

یا انسان کا فطرت سے تصادم ہر جگہ نقصان مرد کا ہوتا ہے۔ فقط جنگ ہی کا مطالعہ کریں تو اوّل تاریخ بشریت سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں جب کسی نہ کسی علاقے میں جنگ نہ ہو اور مرد کو جانی نقصان نہ اٹھانا پڑیں۔ یہی بات مکمل جواب ہے کہ شادی کی عمر میں زن و مرد کا توازن کیوں باقی نہیں رہتا۔

صنعتی عہد میں جنگی نقصانات کا تناسب اس جنگ سے کئی سو گنا بڑھ گیا ہے جو زرعی اور شکاری دور میں ہوتی تھی۔ آخری دونوں عظیم جنگوں میں جنس ذکور کا جانی نقصان تقریباً سات کروڑ افراد تک پہنچا تھا۔ یہ تعداد کئی صدیوں پہلی بے شمار لڑائیوں کے برابر ہوگی اب ان آخری برسوں میں ہونے والی لڑائیوں ہی کو دیکھئے جو مشرق بعید، مشرق وسطی، افریقہ میں ہو رہی ہیں۔ وہاں جو کچھ گذر رہا ہے اس سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہوگی۔

ویل ڈیورانٹ کہتا ہے:۔

"تعدد ازدواج کی رسم کے زوال میں چند عوامل کا دخل ہے۔ کاشتکاری کی زندگی جس میں سکون و قرار رہے، اس سے مردوں کی زندگی میں اضطراب و خطرات و خلفشار کم ہو گیا۔ اسی وجہ سے مرد و زن تقریباً مساوی ہو گئے۔"

ویل ڈیورانٹ کے قلم سے عجیب بات دیکھی، یعنی اگر مردوں کا جانی نقصان فقط فطرت سے ٹکراتے کی بنا پر تھا، جب تو شکاری زندگی اور کاشتکاری زندگی میں فرق تھا۔ کیونکہ جنس ذکور کا نمایاں اتلاف جنگ سے ہوتا ہے۔ اور یہ صورت کاشتکاری زندگی میں شکاری زندگی سے کم نہ تھا، دوسرے یہ کہ مرد، ہمیشہ عورت کو اپنی نگہداشت میں رکھتا رہا اور جان جوکھوں کے کام خود انجام دیتا رہا ہے، بنا بریں عہد کاشتکاری میں بھی اسی طرح غیر متوازن تھا، جیسے دور شکار میں تھا۔

ویل ڈیورانٹ، مشینی دور کی بات صنعتی عہد کا نام نہیں لیتا، حالانکہ یہ عہد مردوں کی جان ضائع کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے اور توازن کو نمایاں طور پر سامنے لاتا ہے۔

بیماریوں سے خواتین کی قوتِ مدافعت

مرد کے جانی اتلاف، عورت کے جانی نقصان سے زیادہ ہونے، ایک سبب،

نئے علوم کی ترقی کے نتیجے میں دریافت ہوا ہے وہ موضوع یہ ہے کہ بیماریوں سے مرد کا مقابلہ عورت سے کمزور ہے، لہٰذا بیماریوں میں مرد زیادہ مرتے ہیں اور خواتین کم۔

دی ماہ، ۱۳۳۵ھ ش (۱۹۵۶ء/۱۹۵۷ء) کے روزنامہ "اطلاعات" (تہران) میں تھا:

"ادارۂ شماریات فرانس کے مطابق، فرانس میں لڑکوں کی شرح پیدائش لڑکیوں سے زیادہ ہوتے، یعنی سو لڑکیوں کے مقابل ایک سو پانچ لڑکے پیدا ہوتے کے باوجود، عورتوں کی تعداد سترہ لاکھ پینسٹھ ہزار (۱۷۶۵۰۰۰) نفر مردوں سے زیادہ ہے۔ اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ خواتین مردوں سے زیادہ بیماریوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔"

رسالۂ سخن، جلد ۶، شمارہ ۱۱ میں ایک مقالہ چھپا ہے ـــ

"زن در سیاست و اجتماع" یہ مضمون، یونیسکو کے باتصویر ماہنامے کے ایک مقالے کا ترجمہ ہے، ڈاکٹر زہرا خانلری نے "اشلی مونتاک" سے نقل کیا ہے:

"علمی نقطۂ نظر سے عورت کی فطرت مرد کی فطرت پر فوقیت رکھتی ہے۔ X کروموزوم (CHROMOSOME) جنس مادہ میں، کروموزوم Y جنس نر سے زیادہ طاقت ور ہیں۔ اسی وجہ سے عورتوں کی عمر مردوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ خواتین کی اوسط عمر مردوں سے زیادہ ہے، عورت عام طور پر مرد سے زیادہ تندرست ہوتی ہے، بہت سی بیماریاں وہ مردوں سے زیادہ مقابلہ کر کے جھیل جاتی ہے۔ علاج کا اثر بھی جلدی قبول کرتی ہے۔ عورت ایک گونگی اور مرد پانچ گونگے، زنگوں کی ایک نابینا عورت کے مقابلے، زنگوں کے سولہ اندھے مرد، دیکھے گئے ہیں۔ نزف الدم "HAEMORRHAGE" ہیمرج کی تکلیف، تقریباً مردوں کو ہی

ہوتی ہے۔ حادثات سے مقابلہ کرنے میں عورت زیادہ مضبوط ہے۔ آخری
جنگ عظیم میں ہر جگہ دیکھا گیا ہے کہ ایک جیسے حالات میں، مرد سے بہتر عورتوں
نے مقابلہ کیا ہے۔ محاصرہ۔ قید۔ قیدیوں کے کیمپ میں مردوں سے زیادہ
...... قریب قریب ہر ملک میں مردوں کی خودکشی عورتوں سے تگنی ہے۔

..........."

"زن جنس برتر" میں، اشلی مونتاگ کا نظریہ اس سے زیادہ واضح ہوا ہے۔ جناب
حسام الدین امامی کا ترجمہ شمارہ ۸۷، رسالہ زن روز" میں چھپ چکا ہے۔
بیماریوں کا زیادہ دلیری سے مقابلہ کرنے کی نسوانی قوت کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے
کہ ایک دن مرد قوت حاصل کر کے عورت سے انتقام لے۔ اور اسے خطرناک اور
بھاری کاموں میں لگا دے جس سے وہ موت سے دوچار ہو، خصوصاً اسے میدان
جنگ میں لے جا کر اس کے تن نازنین کو گولیوں کا نشانہ بنوا دے یوں اس کو ان کاموں
کا مزہ چکھائے۔ اس کے بعد بھی بیماریوں سے مقابلے کی قوت مدافعت کی وجہ سے جنس
زن و مرد کا توازن محفوظ نہ رہے گا۔
یہ سب باتیں، پہلی تمہید اور پہلے مقدمے سے متعلق تھیں، یعنی شادی کے قابل عورتوں
کی نسبت مردوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ واقعاً، یہ بات حقیقت رکھتی ہے،
اور اس کی علت بھی واضح ہو گئی۔ اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ علت یا اسباب آغاز تاریخ بشر
سے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔

کئی بیویوں کی صورت میں عورت کا حق

رہی تمہید کی دوسری بات۔ یعنی، شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی
اور شادی کے قابل مردوں کی کمی سے طبقۂ خواتین کا ایک "حق" پیدا ہوتا ہے۔ یہ حق
شادی شدہ عورت و مرد کے ذمے ہے:

انسانی حقوق میں عائلی زندگی کے فطری و حقیقی حق ہونے میں تو کوئی جائے حرف زدن نہیں ہے۔ زن و مرد میں سے ہر ایک کا عائلی زندگی بسر کرنا، ایک حق ہے۔ مرد ہے تو بیوی، عورت ہے تو شوہر و اولاد سے بہرہ ور ہونا ایسا ہی حق ہے جیسے مکان، تعلیم و علاج و معالجہ، امن و آزادی کے حقوق ہیں۔

سماج کو اس معاملے کسی رکاوٹ ڈالنے کا حق نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان حقوق کو فراہم کرے۔

ہمارے نزدیک "منشور حقوق انسانی" میں ایک بہت بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں "حق شادی" پر دھیان نہیں دیا گیا ہے۔ حق آزادی حق امن مؤثر قومی عدالتوں سے رجوع کا حق، حق قومیت، حق ترک قومیت، ہر مذہب و قوم سے شادی کرنے کا حق، مالکیت کا حق، اتحادی ادارے بنانے کا حق، سکون و راحت کا حق، تعلیم و پرورش کے حق، تو یاد رکھے ہیں۔ لیکن "عائلی زندگی کے حق کا تذکرہ چھوڑ دیا ہے۔ یعنی خاندانی مرکزیت بنانے کا حق اور اس کے قانون بات ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہ حق عورت کی جہت سے بہت اہمیت رکھتا ہے، عورت کو مرد سے زیادہ گھریلو مرکزیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقالہ نمبر ۲۷ میں کہہ چکا ہوں، شادی، مرد کے لیے مادی لحاظ سے اور عورت کے واسطے جذباتی و نفسیاتی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مرد اگر گھر کو چھوڑ دے تو عیاشی و یاربازی کے ذریعہ آدھے ضروریات پورے کر سکتا ہے۔ مگر خاندان اور "گھر" کی اہمیت عورت کے لیۓ ان باتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر ہے۔ عورت اگر عائلی فضا کھو بیٹھے تو عیاشی و یاربازی سے اپنے مادی و نفسیاتی ضروریات سے تھوڑا بہت بھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔

عائلی زندگی کے حق کا مطلب مرد کے نزدیک ایک فطری خواہش کی آسودگی، ایک ہمسر، شریک زندگی اور یکدل ساتھی اور قانونی اولاد رکھنے کا حق ہے۔ لیکن عائلی

زندگی رکھنے کا مطلب، عورت کی اصطلاح میں نام ہے۔ مذکورہ باتوں کے علاوہ ایک حامی و سرپرست رکھنے کا، جذبات کی حمایت رکھنے کا۔

ان دو تمہیدوں (مقدموں) کے اثبات کے بعد:

۱۔ عورتوں کا عددی تناسب مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

۲۔ عائلی زندگی انسانی فطرت کا ایک حق ہے۔

نتیجہ۔ اگر ایک بیوی ہی کو شادی کی قانونی صورت دی جائے تو عورتوں کا بہت بڑا گروہ اپنے انسانی فطری حق "عائلی زندگی" سے محروم رہے گا۔ خاص شرائط کے ساتھ، تعدد ازواج کا قانون ہی اس فطری حق کا احیا کر سکتا ہے۔

روشن فکر مسلمان خواتین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی حقیقی شخصیت کو پہچانیں۔ اور خواتین کے برحق حقوق، اخلاق، نسل بشر کی حمایت کے عنوان سے انسان کے سب سے اہم فطری حق کے بارے میں، حقوق انسانی کے کمیشن کو "یو، این، او" میں قرارداد پیش کریں، جس میں ان منطقی شرائط کے ساتھ تعدد ازدواج کے جواز پر حقوق بشری میں سے ایک حق تسلیم کرنے پر زور دیا جائے، مطالبہ کریں کہ وہ اس تجویز کو قانونی طور پر تسلیم کرے۔ یہ خدمت، خواتین اور اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ فقط یہ بہانہ کہ مشرقی فارمولے کی اہل مغرب پیروی کریں، کوئی گناہ کی بات تو نہیں ہے۔

رسل کا نظریہ

ہم نے گذشتہ صفحات میں "برٹرینڈ رسل" کے بارے میں اشارہ کیا ہے کہ موصوف اس نکتے کو دھیان میں رکھتے تھے کہ اگر فقط "ایک بیوی" کے طریقِ کار کو قانونی حیثیت دی جائے، تو اس سے عورتوں کا ایک بڑا گروہ قانونی شادی سے محروم رہے گا۔ لہٰذا انھوں نے راہِ حل نکالی، مگر کیا راہِ حل؟ بڑی سادہ تجویز کہ اس قسم کی عورتوں کو اجازت دی جائے کہ وہ فرزند سے محروم نہ رہیں، وہ مردوں کا شکار کر کے بے پدر اولاد کو جنم دیں، اور حاملہ ہونے یا گود میں بچہ ہونے

کی حالت میں ان کو مالی امداد کی جو ضرورت پیش آتی ہے اور عام طور پر ایک باپ جو نفقہ دیتا ہے، حکومت اس کی ذمہ دار بنے اور اس زاویے سے باپ کی جانشین ہو کر ایسی عورتوں کی امداد کرے۔

اس کے بعد رسل نے کہا:

"آج کے انگلستان میں مردوں سے دو ملین (بیس لاکھ) عورتیں زائد ہیں۔ رسم "یک زوجہ" کی وجہ سے یہ عورتیں ہمیشہ بے اولاد رہیں گی۔ یہ ان کی بڑی محرومی ہے۔"

پھر لکھتا ہے:

مکمل شادی ایک بیوی پر مبنی ہے مگر یہ قانون اس مفروضے پر ہے کہ زن و مرد میں تقریباً یکسانیت ہے۔ مگر جہاں برابری نہ ہو وہاں بڑی زیادتی (قساوت) ہوگی کہ ریاضی کلیے کے مطابق دوسرے افراد مجرد رہیں۔ پھر اگر ہم قوم میں افرادی کثرت کی ضرورت بھی محسوس کریں تو یہ طریق کار خصوصی قساوت و سخت دلی سے بڑھ کر عام صورت میں جائز قرار نہیں دی جا سکتی۔"

یہ تھا بیسویں صدی کے ایک فلسفی کا حل جو اس نے ایک معاشرتی مسئلے کی الجھن کے لئے پیش کیا، اور وہ تھا اس مشکل کا حل جو اسلام نے تجویز کیا۔ اسلام کہتا ہے — کہ یہ مشکل یوں حل کرو کہ ایک شخص جس میں مالی، اخلاقی اور جسمانی صلاحیتیں ہوں اور وہ ایک بیوی سے زیادہ بیویوں کی کفالت کر سکتا ہو تو وہ دوسری قانونی و شرعی بیوی قبول کر لے، مگر پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے درمیان کسی قسم کا امتیاز روا نہ رکھے۔ پہلی بیوی بھی ایک معاشرتی ذمہ دار سمجھ کر، اپنے حق اور اپنی فداکاری کے ذریعے شرکت کو تسلیم کرے، گویا ایک خاص قسم کا سوشلزم جو سوشلزم کے تمام اقسام میں سب سے اہم ہے، قبول کرے۔ مگر بیسویں صدی کا یہ فلسفی کہتا ہے: محروم عورتیں دوسروں کے شوہروں پر ڈاکہ ماریں

انہیں چرائیں، بے پدر بچے جنیں اور حکومت سے کفالت حاصل کریں۔ بیسویں صدی کے اس فیلسوف کی نظر میں عورت کی ضرورتِ خانہ داری صرف تین زاویوں سے ہے۔

۱۔ جنسی زاویہ جو عیاری، دل ربائی کے ذریعے عورت حاصل کر سکتی ہے۔

۲۔ اولاد کے زاویہ سے بھی چوری، جس سے بچہ ہاتھ آئے۔

۳۔ اقتصادی زاویے سے، دولت ملنا چاہیئے۔ اس فیلسوف کی نظر میں جس چیز کی ضرورت نہیں ہے وہ شوہر کے مخلصانہ جذبات ہیں، اور اس کی یہ ضرورت کہ ایک مرد (شوہر) اسے اپنی حمایت کے دامن میں لے، اسے فقط جنسی نظر سے نہ دیکھے۔ اس فلسفی کے نزدیک ایک بات اور غیر اہم ہے اور وہ ہے نومولود کی حالتِ زار، یہ بچہ اس نے جنا ہے۔ یہ بچہ اسے پریشان کرتا ہے۔ ہر بچہ، بلکہ ہر انسان چاہتا ہے کہ وہ اپنے باپ اور اپنی ماں کے حوالے سے جانا پہچانا جائے، ہر بچہ چاہتا ہے کہ ماں باپ کی سچی محبت اور ماحتا پائے تجربہ گواہ ہے کہ جس ماں کا بچہ کوئی معین باپ نہ رکھتا ہو، اس ماں کے دل میں اس بچے کی محبت کا چشمہ نہیں پھوٹتا جسے بچے کے باپ کی توجہ نصیب نہ ہو۔ وہ ایسے بچے سے بہت کم پیار کرتی ہے۔ محبت کی یہ کمی کہاں سے پوری کی جائے؟ کیا حکومت اس کمی کو پورا کر سکتی ہے؟

جناب رسل صاحب کو افسوس ہے، اگر ان کی تجویز نے قانونی شکل حاصل نہ کی تو بہت سی بے شوہر عورتیں بے اولاد رہ جائیں گی۔ لیکن خود رسل صاحب بہتر جانتے ہیں کہ انگلستان کی بے شوہر عورتیں ایسے قانون کا انتظار نہیں کر سکتی تھیں انھوں نے عملی طور پر خود ہی تنہائی، بے شوہری و بے اولادی کا حل نکال لیا ہے۔

"دس انگریزوں میں ایک ....."

اخبار اطلاعات، تہران، ۲۵ ۹ ۳۸، (دسمبر ۱۹۵۹ء) میں ایک سرخی تھی۔

۔" دس انگریزوں میں سے ایک حرام زادہ ہے"۔ نیچے تھا ۔ " لندن، رائٹر، ۱۶ر دسمبر، فرانسیسی نیوز ایجنسی نے خبر دی ہے کہ ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ اسکاٹ، میڈیکل آفیسر، لندن نے اپنی تیار کردہ رپورٹ میں خاطر نشان کیا ہے کی گذشتہ سال لندن میں جو بچے پیدا ہوئے ہیں، ان میں سے ہر دس میں سے ایک ناجائز ہے۔ ڈاکٹر اسکاٹ نے زور دیکر کہا ہے کہ ناجائز بچوں کی شرح پیدائش مسلسل بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۵۷ء میں، ۳۸۲۸ ۳ سے بڑھ کر ایک سال میں ۵۲۴۳۳ تک پہنچ گئی ہے۔"

انگریز قوم نے جناب رسل کی تجویز پر قانون بننے سے پہلے اپنا مسئلہ حل کر لیا ہے

تعدد ازواج ممنوع اور ہم جنس بازی کی اجازت

حکومت انگلستان نے جناب رسل کی رائے کے بالکل برعکس کام کیا اور بجائے بے شوہر عورتوں کی مشکل حل کرنے کے، اس کے مرد حریفوں کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا۔ اسی طرح انھیں پہلے سے زیادہ محروم بنانے کی سعی کی حکومت نے "ہم جنس بازی" کا قانون منظور کر لیا، ۱۴ر ۴ / ۴۶ ھ شمسی مطابق ۵ / ۷ / ۱۹۶۶ء کے اطلاعات نے خبر دی۔

" لندن، برطانیہ کے دار العوام نے آٹھ گھنٹے کی طویل بحث کے بعد " ہم جنس بازی کے مسودۂ قانون کی منظوری دیکر، قرار داد کا متن دار الامرا کو بھیج دیا۔"

۲۴ / ۴ / ۴۶ ھ ہجری شمسی مطابق ۱۵ / ۷ / ۱۹۶۶ء یعنی دس روز بعد اطلاع دی:

ہاؤس آف لارڈز نے اپنی دوسری نشست میں " ہم جنس بازی" کے مسودۂ قانون کی منظوری دیدی۔ اس مسودہ کو پہلے، انگلستان کا دار العوام منظور کر چکا تھا۔ اس کے بعد یہ قانون ملکہ الزبتھ کے پاس جائے گا اور وہ بہت جلد دستخط کریں گی۔"

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ انگلستان میں تعدد ازواج ممنوع ہے لیکن۔ " ہم جنس بازی" صحیح ہے۔

ان عوام کی نظر میں اگر ایک مرد اپنی بیوی کی "سوت" عورت لے آئے تو قانوناً درست نہیں ہے، اس نے غیر انسانی کام کیا۔ لیکن اگر وہی نوعیت عورت کے بجائے لڑکے سے بدل جائے تو شریفانہ، انسانی، اور بیسویں صدی کے مطابق کام ہو گا۔ دوسری لفظوں میں انگلستان کے ارباب حل وعقد کے نزدیک اگر شوہر کے گھر میں اس کی بیوی کا شریک خانہ ڈاڑھی مونچھ والا ہو تو "چند ازواجی" (چند ہمسری) میں کوئی عیب نہیں۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ یورپ نے جنسی اور گھریلو جھگڑے حل کر لیے، اب ہمیں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تو انھوں نے یہ مسائل اس طرح حل کئے ہیں جیسے آپ دیکھ رہے ہیں۔

یہ باتیں میرے لیے باعث تعجب نہیں ہیں۔

تعجب وافسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے عوام اپنی منطق اپنے ہاتھ سے دے بیٹھے؟ ہمارے جوان، اور تعلیم یافتہ لوگ واقعات کے تجزیہ وتحلیل سے کیونکر ہاتھ دھو بیٹھے؟ انھوں نے اپنی شخصیت کیوں گم کر دی ہے؟ ہاتھ کے قیمتی پتھر کو دنیا کی اس طرف کے لوگوں کے اخروٹ کہنے سے کیوں پھینک دیتے ہیں؟ کیوں بات مان لیتے ہیں۔ اور اگر غیر کے ہاتھ میں اخروٹ ہو اور ان سے کہا جائے کہ یہ قیمتی جوہر ہے تو اسے کیوں مان لیتے ہیں؟

کیا چند ازواجی مرد کی فطرت ہے؟

یقیناً آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ یورپ کے ماہرین نفسیات و فلاسفۂ معاشرت کا نظریہ یہ ہے کہ مرد چند ازواجی فطرت لے کر پیدا ہوا ہے اور یک ازواجی خلاف فطرت انسانی ہے، ویل ڈیورانٹ "لذاتِ فلسفہ" میں صفحہ ۹۱ پر اس دور کی جنسی اخلاقی آوارگی پر تفصیلی بحث کے بعد لکھتا ہے:

"بلاشبہ ان میں سے بہت سی باتیں اصلاح ناپذیر ہیں اس کا سبب تنوع پسندی (ہر روز نئی چیز) اور فطرت ایک بیوی پر اکتفا نہیں کرتی۔"

آگے چل کر لکھتا ہے:

"مرد، فطرت میں ذاتی طور پر چند ازواجی واقع ہوا ہے۔ ایک بیوی پر اسے پابند کرنے والی مضبوط چیز ہے، اخلاقی پابندیاں، سخت محنت اور غربت کا معین معیار اور پہلی بیوی کی سخت نگہداشت۔"

"زنِ روز" کے شمارہ ۱۱۲ میں ایک مضمون تھا:

"کیا مرد فطرتاً خیانت کار ہے؟"

اس میں درج ہے کہ ایک جرمن پروفیسر آشمید (SCHMIDT) کہتا ہے:

"...... پوری تاریخ میں مرد ہمیشہ خیانت کار رہا ہے اور عورت خیانت میں اس کے پیچھے پیچھے، قرونِ وسطیٰ میں بھی مسلسل ایسے شواہد ملتے ہیں کہ نوے فی صد جوانوں نے بار بار رفیقۂ حیات بدلی ہے۔ اور پچاس فی صد مردوں

نے اپنی بیویوں سے خیانت کی ہے۔ رابرٹ کینسی (DR. ROBERT KINSEY)
مشہور امریکی محقق تھا، اس نے ایک رپورٹ جو "کینسی رپورٹ" سے شہرت پائی، میں لکھا ہے:
امریکہ کے زن و مرد نے بے وفائی و خیانت میں تمام قوموں کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ رکھے
ہیں۔ کینسی اپنی رپورٹ کے دوسرے حصے میں لکھتا ہے: عورت، مرد کے برخلاف، عشق و
لذت میں تنوع جوئی (ہر روز نئی یاری) سے بیزار ہے، اسی وجہ سے بعض اوقات مرد کے رویے سے نہیں دبتی، لیکن مرد
تنوع کو ایک قسم کی مہم سمجھتا ہے اور آسانی سے راستہ سے کٹ جاتا ہے۔ ان کی نظر میں اہم ترین چیز ہے جسمانی لذت
اسکے جذباتی لذت دلچسپی کیلئے، نہ روحانی ہے۔ روحانی و جذباتی باتوں کا اظہار اس وقت تک کرتا ہے جب تک جسمانی چسکا نہیں لیتا
ایک مشہور فرانسیسی نے مجھ سے کہا: مرد کا پالی گیمسٹ (POLYGAMIST) ہونا، اور اس کی تنوع پسندی
و تعدد خواہی اور عورت مونوگیمسٹ (MONOGAMIST) ہونا، یعنی انحصار طلبی
اور ایک پر اکتفا کرنے کا جذبہ صاف اور سامنے کی بات ہے۔ کیونکہ مرد میں ملینوں خلیے جرم
کے پیدا ہوتے ہیں (SPERMATOZOA) جب کہ عورت میں آمادگی کے وقت تخمدان (رحم)
میں صرف ایک تخم (PREGNANT) ہی پیدا ہوتا ہے۔ کینسی کے مفروضے سے قطع نظر،
ہم خود اپنی ذات سے پوچھیں، کیا مرد کے لیے وفاداری مشکل ہے؟

فرانسیسی، ہنری ڈی مونتھرلان (HENRI DE MONTHERLAN) نے
اس سوال کے جواب میں لکھا ہے:

"مرد کے لیے وفادار ہونا مشکل ہی نہیں، بلکہ غیر ممکن ہے۔ ایک عورت ایک
مرد کے لئے پیدا ہوئی ہے اور ایک مرد، زندگی اور تمام عورتوں کے لئے
۔ مرد اگر اندھیرے میں اڑتا اور اپنی بیوی سے خیانت کرتا ہے تو خود کوئی
غلطی نہیں کرتا۔ کوتاہی اس کی خلقت و فطرت کی ہے جس نے اس کے اندر
خیانت کو جنم دیا ہے۔"

اس رسالے کے شمارہ نمبر ۱۲۰ میں ایک مضمون ہے۔ "فرانسیسی عشق اور شادی کا اسٹائل"

اس ذیل میں تحریر ہے:

"فرانسیسی میاں بیویوں نے، آپس میں "بے وفائی کا مسئلہ" حل کر لیا، انھوں نے اس بارے میں قاعدہ و قانون، حد و حدود مان لئے ہیں۔ اگر شوہر اس "قانون کی سرحد سے آگے بڑھتا ہے تو اندھیرے کی طرف اس کی پیش قدمی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ کیا اصولاً، ایک مرد، دو سال عائلی زندگی بسر کرنے کے بعد وفادار رہ سکتا ہے؟ یقیناً نہیں رہ سکتا۔ یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے لیکن خواتین کے معاملے میں ایک حد تک فرق ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ اس فرق سے باخبر ہیں۔ فرانس میں اگر کوئی شوہر خیانت کرتا ہے تو اس کی بیوی ناراضگی محسوس نہیں کرتی، غصہ نہیں آتا، وہ اپنے دل کو سمجھاتی ہے۔ اس نے دوسری سے فقط جسمانی لمس کیا ہے، روح اور جذبات اسے نہیں دیے، روح اور جذبات میری ملکیت ہیں:"

چند برس پہلے، بیالوجی کے پروفیسر ڈاکٹر رسل لی (DR. RUSSELL LEE) کا اس بارے میں نظریہ روزنامہ "کیھان" میں چھپا تھا اور ایرانی لکھنے والوں نے کچھ عرصے تک اس پر بحث جاری رکھی تھی۔ ڈاکٹر رسل لی کے نزدیک مرد کا ایک عورت پر قانع رہنا، نسل سے خیانت کرنا ہے، فقط مقدار ہی نہیں، کیفیت کے لحاظ سے بھی برا ہے۔ کیونکہ ایک عورت پر اکتفا کرنے سے اس کی نسل کمزور ہوتی ہے۔ کئی بیویوں کی وجہ سے نسل قوی اور طاقتور پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے خیال میں مرد کی فطرت کا یہ تعارف ہے کسی طرح صحیح نہیں ہے، ان مفکروں کے نظریہ کی پیداوار ان کے معاشرتی ماحول کے سبب ہے۔ مرد کی حقیقت فطرت ایسی نہیں ہے۔

ہم ہرگز مدعی نہیں ہیں کہ عورت و مرد بیالوجی (زیست شناسی) کے زاویے سے مشابہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ہم تو اس کے برعکس یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ زیست شناسی اور نفسیات

کے زاویے سے مرد و عورت میں فرق ہے۔ اس اختلاف میں تخلیق کا ایک مقصد ہے۔ اس بنا پر زن و مرد کے انسانی حقوق کی یکسانیت کو دونوں کے تمام حقوق کی اکائی قرار دینے کا بہانہ بنانا غلط ہے۔ "ایک شوہر زوجہ کی رسم میں بھی نفسیاتی اعتبار سے زن و مرد کے نفسیات الگ الگ اور قطعاً مختلف ہوتے ہیں۔ عورت فطرتاً یک شوہر پسند ہے، "چند شوہری" رسم اس کی نفسیات کے خلاف ہے، ایک شوہر سے بیوی کی رنگارنگ تمناؤں کی وابستگی کا "چند شوہری نظام سے کوئی ربط نہیں۔ لیکن مرد "ایک بیوی" کی رسم سے طبعاً ہم آہنگ نہیں ہے، بایں معنی کہ چند ازدواجی زندگی اس کے نفسیات سے اختلاف نہیں رکھتی۔

ہم اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں رکھتے کہ مرد کے نفسیات "ایک بیوی" کی رسم سے ہم آہنگ نہیں۔ ہم اس نظریے کے منکر ہیں کہ جو کہا گیا ہے کہ:

"مرد تنوع پسندی کا رجحان اصلاح ناپذیر ہے۔"

ہم اس رائے کے خلاف ہیں کہ:

"مرد کے لئے وفاداری ناممکن ہے۔ اور ایک بیوی ایک شوہر کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اور ایک مرد تمام عورتوں کے لئے۔"

ہمارے خیال میں مرد کے اندر خیانت کاری، سماجی ماحول پیدا کرتا ہے، خلقت و فطرت کی دین نہیں ہے۔ مرد کی خیانت کاری کی ذمہ داری خلقت پر نہیں ہے۔ اس کی جواب دہ سماجی فضا اور ماحول ہے۔ خیانت کاری کے اسباب ماحول پیدا کرتا ہے یہ ماحول عورت کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ اغوا اور اجنبی مرد کو بے راہ کرنے میں ہر قسم کی عیاری استعمال کرے، ایک ہزار ایک نیرنگ دکھائے اور اسے اپنی راہ پر لائے۔ ادھر "قانون ازدواج" کو "ایک بیوی" میں منحصر و محدود کرکے ہزاروں، لاکھوں، بلکہ ملینوں شادی کے قابل عورتوں کو ازدواجی زندگی سے محروم کرتا ہے۔ پھر ان کو مرد کے اغوا کرنے کی خاطر سماج میں دھکیل دیتا ہے۔

معربی آداب کے عام ہونے سے پہلے اسلامی مشرقی علاقوں میں نوے فی صد "ایک بیوی" ہی کا رواج تھا۔ نہ ایک شرعی بیوی کے علاوہ ان کے گھر میں کوئی اور ہوتی نہ یار یا محبوبہ سے عشق بازی ہوتی تھی، خصوصی روابط زن و شوہر اپنے تمام مفہوم و معنی کے ساتھ اکثر و عمومی طور پر مسلمان خاندانوں میں حکمران تھی۔

چند ازواجی نظام یک زوجہ نظام کی پائداری کا سبب ہے

ہماری بات پر آپ کو تعجب ہوگا، اسلامی مشرق میں "چند ازواجی نظام" ہی "یک زوجہ" رسم کی قوت کا باعث و سبب ہوا۔ ہاں متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت بہت بڑا سبب ہے، کہ "ایک زوجہ" کی رسم پائدار ہو جائے، یعنی یعنی جن حالات میں تعدد ازواج کی ضرورت ہوتی ہے۔ شادی کے قابل عورتیں شادی کے قابل مردوں سے زیادہ ہوں۔ اگر عورتوں کی اس تعداد کو قانونی تحفظ نہ دیا جائے، اور شرائط پوری کرنے والوں اخلاقی، مالی اور جسمانی صلاحیت رکھنے والوں کو کئی بیویاں رکھنے کا حق نہ دیا جائے تو یاری و معشوقہ بازی قدم بڑھا کر "ایک بیوی" کے نظام کو جڑوں سے خشک کر دے۔

اسلامی مشرق میں، ایک طرف تعدد ازواج کی اجازت اور دوسری طرف ہیجان انگیز اور اغوا کے محرکات موجود نہ تھے، لہٰذا ایک ازدواجی نظام اکثر خاندانوں پر حکومت کرتا تھا اور عشق بازی کا کاروبار اتنا نہ تھا کہ اس کے لیے خاص فلسفہ وضع کیا جاتے اور کہا جائے کہ مرد کی تخلیق کئی بیویوں کا تقاضا کرتی ہے اور ایک بیوی پر اکتفا کرنا مرد کے لیے محالات و ناممکناتِ عالم میں ہے۔

ممکن ہے آپ سوال کریں کہ ان دانشوروں کی رائے کے مطابق جو مرد کے لیے چند ازدواج کو مطابق فطرت بتاتے ہیں اور قانون معاشرت کے زاویے سے برا سمجھتے ہیں، مرد کی ذمہ داران دو قانونوں کے مابین کیا ہے؟

ان حضرات کے دبستانِ فکر میں مرد کی ذمہ داری واضح ہے۔ قانوناً ایک بیوی

عملاً چند بیویاں۔ ایک بیوی تو قانونی و شرعی ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد یار و محبوبہ و معشوقہ جتنی چاہے بنا لے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ان حضرات کی رائے میں یار بنانے، معشوقہ ساتھ رکھنے کا حق مرد کو فطرت نے دیا یہ حق تسلیم شدہ ہے اور قانونی ہے۔ ساری زندگی ایک بیوی کے ساتھ گذر بسر کرنا ایک قسم کی نامردی ہے۔

بحث کی اصل صورت

میرا گمان ہے کہ اب وہ لمحہ آگیا ہے، جب ہمارے قارئین کرام توجہ کریں کہ انسان کے لیے "چند ازواجی" کا جو مسئلہ زیر بحث تھا اور اب بھی ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ایک بیوی کی رسم بہتر ہے یا چند بیویوں کی؟

ایک بیوی کی رسم کے اچھے ہونے میں تو کوئی تردید ہے ہی نہیں۔ ایک بیوی کے نظام کا مطلب ہے خاندانی لگاؤ، یعنی میاں بیوی کے جسم و جان ایک ہوں، ظاہر ہے کہ ازدواجی زندگی کی جان وحدت و یگانگت ہے۔ اور یہ بات انفرادی صورت ہی میں کامل و مکمل طور پر جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ در اصل آدم زاد اس دوراہے پر نہیں ہے کہ "ایک بیوی" کا نظام اختیار کرے یا "کئی بیویوں" کا مسئلہ تو یہ آن پڑا ہے کہ سماجی ضرورتوں کے پیش نظر، خصوصاً، شادی کے قابل لڑکیوں کی فراوانی ان مردوں سے جو شادی کے قابل ہوں، ایک بیوی کا نظام عملی طور پر خطرے میں ہے۔ "فقط ایک بیوی" کا نظام تمام خاندانوں میں نافذ ہو، ایک افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، دو میں سے ایک راستہ ہے۔

یا تعدّد ازواج کا قانون

یا معشوقہ بازی کا رواج

یوں کہیے کہ۔ یا۔ چند شادی شدہ افراد کئی بیویاں رکھیں، جن کی تعداد یقیناً دس فی صد سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سے بے شوہر خواتین گھر بار بنا سکیں گی، زندگی کا کوئی سر پیر ہو سکے گا۔ یا پھر معشوقہ بازی کی راہیں کھول دی جائیں۔ چونکہ دوسری صورت میں ہر معشوقہ، کئی مردوں سے تعلق پیدا کر لے گی لہٰذا تقریباً بیوی والوں کی

اکثریت عملاً چند بیویوں والے ہو جائیں گے۔

"کئی بیویوں" کے جواز و عدم جواز کی بات یوں پیدا ہوتی ہے اور یہی صحیح انداز مسئلہ ہے مگر یورپی پروپیگنڈا کرنے والے حقیقت آشکار نہیں کرنا چاہتے یہ لوگ در اصل معشوقہ بازی و یار بازی کے حامی ہیں، "قانونی و شرعی بیوی کو بارِ دوش اور راستے کی رکاوٹ جانتے ہیں۔ یہ تو ایک بھی زائد مانتے ہیں، دو، تین اور چار بیویوں کی تو بات ہی چھوڑیئے۔ اصل لذت تو پابند ازدواج سے آزادی میں سمجھتے ہیں۔ مگر بات یوں کرتے ہیں کہ جیسے وہ "ایک بیوی" کے نظام کے حامی ہیں۔ وہ بڑی معصومیت سے کہتے ہیں، ہم تو اس کے طرفدار ہیں کہ ایک شوہر اور ایک بیوی ہو، دونوں وفادار رہوں۔ کئی ہمسر بے وفا ہم نہیں مانتے۔

بیسویں صدی کے مرد کی نیرنگیاں

بیسویں صدی کا مرد عائلی حقوق سے متعلق بے شمار مسائل میں الٹی جوتی مارنا چاہتا ہے۔ وہ مساوات و آزادی کے خوبصورت ناموں سے عورت کو بہلا کر اس کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں کو کم کر کے، بے حساب انداز سے اپنے کام بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔ مگر "تعدد ازدواج" کے سوا بہت مسائل میں کامیاب ہو سکا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی کبھی ایرانی مصنفین اور مضمون نگاروں کے یہاں ایسی چیزیں دیکھتا ہوں تو ایک شک سے دوچار ہو جاتا ہوں کہ یہ لوگ سادہ دل ہیں یا گرفتارِ غفلت؟!

"تعدد ازدواج" کے بارے میں ایک صاحب لکھتے ہیں:

"آج کل ترقی یافتہ ملکوں میں باہمی ذمہ داریوں کی بنیاد پر میاں بیوی کے تعلقات استوار ہوتے ہیں، لہٰذا تعدد ازدواج کی قانونی حیثیت (دائمی نکاح ہو یا منقطع) عورت کی طرف سے بھی ویسی ہی تسلیم ہے جیسے شوہر سے چاہیں کہ رقیبوں کو اپنی عائلی زندگی

ہیں برداشت کرے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان حضرات ذہن میں واقعاً صورت معاملہ یہی ہے یا جو نا الٹا نہیں رہے ہیں؟ (جلدی میں بات کچھ سے کچھ کہہ رہے ہیں)

کیں، واقعاً ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ "تعدد ازدواج" معاشرتی مشکل کی وجہ سے ہے۔ اس مشکل کی ذمہ داری تمام شادی شدہ مرد و زن پر ایک بوجھ کی صورت میں ہے اور اس کا سب سے اچھا حل "تعدد ازدواج" ہی ہے؟ کیا یہ نہیں جانتے کہ آنکھیں بند کر کے نعرے لگانا "یک زوجہ" نظام زندہ باد۔ "کئی ازدواجی نظام مردہ باد۔ بیماری کا علاج نہیں ہے؟

کیا انھیں نہیں معلوم کہ تعدد ازدواج، عورت کے حقوق کا ایک حصہ ہے، مرد کا نہیں، زن و مرد کے تقابلی حقوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔؟

مضحکہ خیز بات ہے، کہتے ہیں:

"تعدد زوجات" عورت کی طرف سے اتنا ہی مشکل کام ہے، عورت بھی چاہتی ہے کہ ازدواجی زندگی کے دوران مرد بھی اپنے رقیبوں کو برداشت کرے"۔ اس سے قطع نظر کہ دونوں باتوں کا قیاس غلط ہے۔ شاید، وہ یہ نہیں سمجھ سکے کہ آج کی دنیا میں کچھ حضرات ہر ایک چیز کو آنکھ بند قبول کر لیتے ہیں اور ماجرے کی صحت میں کوئی شک و تردد صحیح نہیں سمجھتے آج کی دنیا مرد سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی بیوی کے عشق کا احترام کرے اور تعلقات زن و شوہر کے ہوتے ہوئے اپنے رقیبوں کو سہے۔ آج کی دنیا "ناقابل برداشت باتوں" کو حسد، تعصب اور فینٹزم جیسے ناموں سے ٹھکراتی ہے۔ کاش ہمارے جوانوں کو یورپ میں اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات کی تھوڑی سی بھی آگاہی ہو جاتی۔

oooooooooo

"تعدد ازواج مرد کی فطری مانگ نہیں، یہ سماج سے ابھرنے والی ایک ضرورت ہے۔

اگر اس نظریے سے دیکھا جائے تو صاف نظر آئے گا کہ اگر کسی سماج میں شوہروں کی خواہشمند خواتین کی نسبت ان مردوں سے زیادہ نہ ہو جو ہمسر و رفیقۂ حیات کے متلاشی ہوں تو "کئی بیویوں" کا دستور خود بخود یا تو بالکل ختم ہو جائے گا یا کمی آجائے گی۔ اور اگر ایسے حالات میں کہ فرض کیجئے، عورتیں عددی کثرت کی وجہ سے معاشرے سے خانہ آبادی چاہتی ہوں، قانون تعدد ازدواج ختم کر دیا جائے تو فقط یہ اقدام نہ کافی ہوگا نہ صحیح ہوگا۔ اس کے لیے کچھ اور اقدامات ضروری ہوں گے:

۱. عدالت اجتماعی، ہر شخص کو روزگار مہیا کیا جائے، ہر شخص کی اتنی آمدنی رکھی جائے کہ جو شخص بھی شادی کی ضرورت محسوس کرے وہ گھریلو مرکزی زندگی حاصل کر سکے۔

۲- عورتوں کو ارادۂ و انتخاب کی آزادی دی جائے کہ وہ شوہر خود منتخب کر سکے۔ باپ یا بھائی یا کسی اور رشتے دار کو حق نہ ہو کہ وہ شادی شدہ، بیوی والے دولت مند مرد سے اس عورت کو بیاہ دے، ظاہر ہے کہ اگر عورت آزاد و خود مختار ہو، اور اپنے لئے ایک مجرّد شوہر کو تلاش کر سکے تو وہ ہرگز ایسے مرد کا انتخاب نہیں کرے گی جس کے گھر میں پہلے سے بیوی موجود ہو، اور یہ سَوت بن کر اس کے سر پر سوار ہو۔ عورت کے سرپرستوں کا طریقہ ہے کہ پیسے کے لالچ میں، لڑکی یا بہن کو بیوی والے مردوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے ہیں۔

۳- ہیجان آفرین، اغوا اور خانہ خرابی کی تحریکیں اس فراوانی نہ ہونے دی جائیں جن کے دباؤ سے شوہر دار بیویاں، شوہر کے گھر سے نکل کر اجنبی کے گھر نہ جانے پائیں۔ بن بیاہی بے شوہر عورتوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

معاشرہ اگر واقعاً اصلاح احوال چاہتا ہے اور "ایک بیوی" ہی کا نظام پسند کرتا ہے تو مذکورہ تینوں اسباب و عوامل کو بروئے کار لائے۔ ورنہ تعدد ازدواج کے دستور پر پابندی لگانے سے صرف عیاشی کی راہیں ہی کھل سکیں گی اور کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

بے شوہر خواتین کی محرومی سے پیدا ہونے والا بحران

جس صورت میں مردوں کی طلب گار عورتوں کی فراوانی ہو اور ضرورت مندان ازدواج مرد کم ہوں تو اس حالت میں "تعدد ازدواج پر پابندی لگانا" انسانیت سے خیانت ہے۔ کیونکہ اس سے فقط حقوق خواتین ہی پامال نہیں ہوتے۔ اگر چند عورتوں کا حق تلف ہوتا تو شاید اسے برداشت کر لیا جاتا۔ مسئلہ تو وہ بحران ہے جو اس اقدام کے بعد معاشرے میں سر اٹھائے گا اور وہ بحران ہر چیز سے زیادہ خطرناک ہوگا جبکہ بال بچوں کا گھر ہر مرکز سے زیادہ مقدس ہے۔

چونکہ جو اپنے فطری حق سے محروم ہوتا ہے وہ ایک موجود زندہ ہے۔ ایک موجود زندہ اپنے تمام عاملات کے ساتھ جو محرومی و ناکامی ہیں رد عمل دکھاتا ہے کیونکہ وہ انسان ہے۔ روحانی و نفسیاتی الجھنوں کی ناکامیوں کے تمام حالات میں عورت ہے۔ زمانہ نیرنگیوں کے ساتھ حوا کی بیٹی ہے، "آدم فریبی" کی مکمل دسترس کے ساتھ۔

وہ، جَو اور گیہوں نہیں ہے کہ استعمال سے بچے تو سمندر میں پھینک دیں، یا "قحط سالی" کے ڈر سے گودام میں رکھ دیں۔ وہ گھر اور کمرہ نہیں کہ ضرورت نہ ہو تو قفل ڈال دیں ہاں، وہ ایک زندہ موجود ہے، ایک انسان ہے، ایک عورت ہے، وہ اپنی حیرت انگیز قوت کا مظاہرہ کرے گی اور معاشرے کے چھکے چھڑا دے گی۔ وہ برملا کہے گی:

سخن درست بگویم نمی توانم دید
کہ می خورند حریفان و من نظارہ کنم

{غالب نے اس کا مفہوم یوں ادا کیا ہے ؎

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے}

یہی "نمی توانم دید" میں نہیں دیکھ سکتی، بہت کام کرے گی، گھر اور خاندان ویران کر گی

دشمنیاں اور کینے پیدا ہوں گے، وہ دن انسان کے لیے کس قدر تباہ کن ہوگا جب انسانی جبلت اور قلبی گرہیں آپس میں متحد ہو جائیں۔

گھر سے محروم خواتین، اس مرد کو اغوا کرنے کی کوشش کریں گی جس کے قدم کہیں بھی اتنی جلدی نہیں پھسلتے جتنی جلدی یہاں لڑکھڑاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ جب پھسلن زیادہ ہوتی ہے تو ہاتھی پھسل جاتے ہیں (چوگل بسیار شد پیلان بلغزند) افسوس تو یہ ہے کہ یہ پھسلن اگر تھوڑی بھی ہو تو اس ہاتھی کے پھسلنے کے لیے کافی ہے۔

پھر، کیا بات یہیں ختم ہو جائے گی؟ نہیں۔ گھر بار والیوں کی باری اس کے بعد آئے گی، وہ بیویاں جو اپنے شوہروں کو خیانت کرتے دیکھیں گی وہ انتقام و خیانت کے لیے آگے آئیں گی، وہ بھی شوہر کی خیانت کا پیچھا کریں گی۔ آخری نتیجہ کیا ہوگا۔؟

اس کا آخری نتیجہ "کینسی کی رپورٹ" میں درج ہے، اور وہ بھی ایک جملے میں:

"امریکہ کے مرد و عورت، فساد و کج روی و خیانت میں اقوام عالم کے ہاتھ پشت پر باندھ چکے ہیں۔"

ملاحظہ فرمائیے کہ فقط مرد کی کج روی اور فساد ہی پر قصہ تمام نہیں ہوتا، اس آگ کا شعلہ خانہ نشین، بال بچوں والیوں کے دامن تک پہنچتا ہے۔

عورتوں کی فراوانی میں مختلف ردِّ عمل

انسانی زندگی میں عورتوں کی عددی افزائش ہمیشہ رہی ہے، اس کی وجہ سے اصل چیز اس کے ردِّ عمل ہیں، جو معاشرے میں کبھی ایک جیسے نہیں رہے۔ جن قوموں کے مزاج تقوی اور پاک دامنی سے وابستہ رہے وہ بڑے بڑے آسمانی ادیان کے وسیلے سے اس مشکل کو تعدد ازدواج کے طور پر حل کرتی رہیں، جن قوموں کا مزاج خوف خدا اور پاک دامنی سے زیادہ سازگار نہ تھا

نہوں نے اس مشکل کا حل عیاشی سے نکالا۔

"تعدد ازواج"، نہ مشرق میں اسلام کی پیداوار ہے نہ اس کے چھوڑنے میں یورپ کے دینِ مسیحی کا کوئی ہاتھ ہے، مشرق میں یہ دستور اسلام سے پہلے بھی تھا، یہاں کے مذاہب نے اس کی اجازت دی تھی، خود اصل دینِ مسیح میں بھی اس کی ممانعت پر کوئی صریحی حکم موجود نہیں۔ وہاں جو کچھ ہے وہ خود مغربی اقوام کے رسم و رواج کی بنا پر ہے، دینِ مسیح کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

جن قوموں نے عیاشی کا رویہ اپنایا ہے وہ ان قوموں سے زیادہ ہیں جن کا رویہ تعدد زوجات ہے اور انھوں نے "یک ہمسری" پر مضبوط چوٹ لگائی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، مصنف "زندگانی محمدؐ" تعدد ازواج کے بارے میں قرآنِ مجید کی آیتیں لکھنے کے بعد کہتے ہیں:

"یہ آیتیں ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو بہتر قرار دیتی ہیں، اور ان کا مطلب ہے کہ اگر تم ڈرتے ہو کہ عدل کا رویہ نہ رکھ سکو گے تو بس ایک بیوی کرو۔ فوراً ہی اصرار کیا ہے کہ تم انصاف نہ رکھ سکو گے۔ اس صورتِ حال کے باوجود ممکن ہے کہ معاشرتی زندگی میں ایسے حادثے پیش آجائیں کہ تعدد ازواج کی ضرورت پڑے تو بشرطِ عدالت اس کو جائز بھی قرار دیا ہے۔

جنگ کے دنوں میں جب مسلمانوں کے گروہ شہادت حاصل کرتے تھے اور فطرتاً بیوہ عورتیں رہ جاتی تھیں، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دستور دیا تھا۔ کیا واقعی طور پر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ لڑائیوں اور وبا اور شورشوں کے بعد، جن میں ملینوں مرد ہلاک ہوتے ہیں اور بے شمار عورتیں بے شوہر رہ جاتی ہیں۔ اس وقت بھی چند بیوں کے بجائے ایک بیوی پر اکتفا کرنا بہتر ہے؟ جب کہ چند

بیویوں کی اجازت، عدل و انصاف کے رویئے کے ساتھ دی گئی ہے اور بطورِ استثنا ہے؟

کیا یورپ کے عوام دعویٰ کر سکتے ہیں کہ جنگ عظیم کے بعد ایک بیوی پر اکتفا کا قانون جس طرح موجود تھا، عملاً بھی اسی طرح نافذ تھا؟"

چند ازواجی کے مشکلات وعیوب

خوشی ۔ سعادت ۔ برکت ۔ خوش حالی ۔ خلوص ۔ درگذر ۔ جاں نثاری ۔ وحدت ویگانگت، غرض سب کچھ ایک گھر اور بیوی ایک میاں کو نصیب ہوتا ہے ۔ چند ازواجی زندگی میں یہ سب باتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں ۔

دو مائیں رکھنے والے بچوں کی تباہ حالی سے قطع نظر، خود شوہر کی ذمّے داریاں کئی بیویوں کے ساتھ اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ان میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے ۔ ان مشکلات کا سامنا دراصل مسرّت و آسودگی کو پس پشت ڈالنے کی برابر ہے ۔

تعدّد ازواج سے خوش و مطمئن لوگوں میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو عملی طور پر اپنی شرعی و اخلاقی ذمّہ داریاں پوری نہیں کرتے ۔ ایک بیوی سے زیادہ محبت کرتے اور دوسری کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ قرآنِ مجید اس بدنصیب کی تعبیر "کالمعلّقہ" سے کرتا ہے، شوہر ایسے ہوا میں معلّق چھوڑ دیتے ہیں ۔ اس قسم کے لوگ جب تعدّد ازواج کا نام لیتے ہیں تو دراصل ان کا مقصد "ایک بیوی" ہوتی ہے یہ ضمیمہ ظلم و ستم، جرم و بیداد گری ۔

ایک بازاری محاورہ لوگوں کی زبان پر ہے : "ایک خدا ایک بیوی" ۔

اکثر لوگوں کا خیال یہی تھا اور اب بھی یہی ہے ۔ اور حقیقت میں اگر خوشی و مسرّت کو معیار سمجھا جائے اور مسئلے کا انفرادی اور شخصی زاویے سے جائزہ لیں تو یہ خیال بالکل ٹھیک ہے ۔ ممکن ہے سب شوہروں کے بارے میں صحیح نہ ہو، اکثریت کے لیے تو

بہر حال ٹھیک ہے۔

اگر کوئی شوہر، تمام شرعی و اخلاقی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد بھی تعددِ ازواج کو اپنے لیے مفید سمجھتا، اور تن آسانی چاہتا ہے تو یقیناً اسے بڑی غلط فہمی ہے "ایک بیوی" خوشیوں اور راحتوں کی ضمانت کے لحاظ سے "کئی بیویوں"، پر بہر حال اور مسلّم طور پر بہتر و برتر ہے۔ لیکن ....

تحقیق کا صحیح راستہ

تعددِ ازواج جیسے مسائل کے صحیح اور غلط ہونے کی چھان بین کا طریقہ صحیح نہیں ہے، یہ مسئلہ شخصی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس کا قیاس "ایک بیوی" کے مسئلہ سے غلط ہے۔

اس قسم کے مسائل کا حل اس بات سے وابستہ ہے کہ ایک طرف تو ہم ایسے علل و اسباب کو دیکھیں جن سے یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر یہ غور کریں کہ ان سے بے توجہی کے خطرناک نتائج کیا ہیں۔ دوسری طرف اس پر دھیان دیں کہ خود اس مسئلے یا مسائل سے کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر دونوں زاویوں سے جو آثار و نتائج سامنے آئیں ان کا جائزہ لیں۔ ان مسائل پر گفتگو اور ان کے واقعی حل کا تنہا یہی ایک راستہ ہے، جس سے تحقیق کرنا چاہیے۔ وضاحت کے لیے ایک مثال:

فرض کریں۔ جبری فوجی بھرتی کی رائے ہے۔ اگر اس مسئلے کو فقط نفع اور جس گھر سے اس سپاہی کا تعلق ہے اس خاندان کے رجحانات کے زاویے سے دیکھیں تو قانون کا یہ اقدام اچھا نہیں۔ کس قدر اچھا ہوتا اگر سپاہی بھرتی ہونے کا یہ قانون نہ ہوتا اور خاندان کا محبوب فرزند ان کی گود سے دور نہ ہوتا، میدان جنگ میں جا کر خاک و خون میں نہ نہاتا۔

لیکن مسئلے کی تحقیق کا یہ صحیح انداز نہیں ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ کسی خاندان سے ایک جوان بیٹے کا جدا ہونا، نیز ممکن حد تک گھر والوں کے لئے غم نصیبی کو سامنے رکھنے کے

بعد ملک کے دفاع میں سپاہیوں کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے بدترین نتائج پر غور کریں، پھر منطقی اور معقول بات معلوم ہوگی کہ فرزندان وطن کا ایک گروہ "سپاہی" کے نام سے ملک اور ملت پر جاں نثاری کے لیے موجود ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں خاندان کو رنج برداشت کرنا چاہئے۔

ہم نے گذشتہ مقالات میں شخصی اور سماجی ضرورتوں کو تعدد ازواج کی وجہ جواز بتایا ہے۔ اب ہم تعدد ازواج سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے ہیں۔ اس طرح ایک مجموعی حساب کا راستہ ہموار ہو سکے گا۔ نیز اسی سلسلے میں یہ بھی واضح ہو جائیگا کہ ہم تعدد ازواج کی خرابیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے اعتراضات تسلیم بھی نہیں کرتے جیسا کہ عنقریب عیاں ہو گا۔ تعدد ازواج کی بہت سی خرابیاں بیان ہو سکتی ہیں اور ہم مختلف پہلوؤں سے بحث شروع کر رہے ہیں۔ ان اعتراضات اور خرابیوں کا بیان یہ ہے:

روحانی زاویۂ نظر

زن و شوہر کا رشتہ فقط مادی و جسمانی ہی نہیں ہے، یہی نہیں کہ یہ تعلق بدنی لمس اور مالی امداد کا ہو۔ اگر یہی بات ہوتی تو کئی بیویوں کا نظام ایک تاویل رکھ سکتا تھا۔ کیونکہ مادی و جسمانی معاملات کو متعدد افراد میں تقسیم کیا جا سکتا تھا اور ہر ایک کا ایک حصہ ہوتا۔

میاں بیوی کے رشتے میں سب سے عمدہ و اساسی بات روحانی اور حقیقی معاملات ہیں۔ عشق وہ جذبہ ہے ــــــ شادی کی مرکزیت دو دلوں کو جوڑنے کا سبب ہے اندرونی حس کی طرح عشق و احساسات قابل تجزیہ و تقسیم نہیں ہیں۔ انھیں توڑ پھوڑ کر ڈھیریاں لگا کر آدمیوں میں بانٹا نہیں جا سکتا بھلا ممکن ہے کہ دل کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں یا ایک دل دو جگہ رہن رکھا جا سکتا ہے؟ کیا ایک دل دو آدمیوں

کو دینا ممکن ہے؟ عشق و پرستش یکتائی چاہتی ہے، اس میں شریک و رقیب کی گنجائش نہیں ہے۔ گندم اور جو نہیں کہ پیمانے میں ناپ ناپ کر ہر ایک کو اس کا حصہ دیا جا سکے۔ اس کے جذبات کنٹرول میں نہیں آ سکتے، لہٰذا روح ازدواج اور انسانی پہلو، دو انسانوں کا تعلق، دو جانوروں کی طرح فقط شہوت اور جنسی نہیں ہے۔ یہ تعلق ناقابل تقسیم ہے نالائق انضباط۔ لہٰذا تعدد ازدواج بری چیز ہے۔

ہمارے خیال میں، اس گفتگو میں کچھ زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے شادی کی روح جذبات و احساسات ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ قلبی احساسات آدمی کے اختیار میں نہیں ہوتے — مگر — جذبات و احساسات قابل تقسیم نہیں — یہ شاعرانہ تخیل ہے، یہ مغالطہ ہے۔ اس میں تو بحث نہیں کہ خاص احساسات کسی حصہ دار جسم کے مانند دو نہیں کیے جا سکتے اور ہر شخص کو اس کا حصہ نہیں دیا جا سکتا۔ جس پر یہ نتیجہ چسپاں ہوا کہ روحانی اور نفسیاتی امور بھی قابل تقسیم نہیں ہیں۔ بحث روح بشر کی گنجائش میں ہے، طے شدہ بات ہے کہ آدمی کی روح میں اتنی تنگی نہیں ہے کہ دو رشتے اس میں نہ سما سکیں۔ ایک باپ دس بیٹوں کو پرستش کی حد تک محبوب رکھتا ہے۔ ہر ایک پر جان بھی قربان کرتا ہے۔

ہاں، ایک بات ضرور ہے کہ کثرت کی وجہ سے محبت وہ عروج نہیں پاتی جو وحدت کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ عشق و جذبات کی آخری معراج کثرت سے جوڑ نہیں کھاتی۔ اور عشق کیا، عقل و منطق بھی اس سے ہم آہنگ نہیں۔

"رسل" نے شادی اور اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بہت سے افراد، آج کل عشق کو احساسات و جذبات کا منصفانہ تبادلہ جانتے ہیں۔ تعدد ازدواج کو مسترد کرنے کے لیے دوسری دلیلوں کو چھوڑ کر یہی دلیل کافی ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ "جذبات کی منصفانہ تقسیم کی جائے"، تو دلیل اسی میں منحصر کیوں ہے؟ آخر باپ، اپنی تمام اولاد سے محبت نہیں کرتا، اور وہ سب باپ کو نہیں چاہتے؟ یہاں، جذبات کا منصفانہ تبادلہ نہیں ہوتا؟ اتفاق دیکھئے کہ اولاد کی تعداد کافی ہو، باپ کا رشتۂ الفت ہر ایک سے ایسا ہوتا ہے کہ اولاد کے فرداً فرداً جذبۂ الفت پر غالب آتا ہے۔

حیرت ہے۔ بات وہ کر رہا ہے، جو ہمیشہ شوہروں کو سمجھاتا ہے کہ بیوی کے عشق کو بیگانی عورت کے مقابلے میں قابل احترام سمجھیں اور ان کے غیر سے معاشقہ کو نہ روکیں، پھر بیویوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے ـــ کیا واقعاً، رسل کے نزدیک میاں بیوی کے جذبات کا منصفانہ تبادلہ ہو سکتا ہے؟

تربیتی نقطۂ نظر

سوت کا وجود، نا اتفاقی کا مشہور ذریعہ ہے۔ بیوی کی نظر میں سوت سے بڑا دشمن کوئی نہیں۔ "تعدد ازدواج" بیویوں کو آپس میں اور کبھی شوہر کے خلاف آمادۂ جنگ، بلکہ میدان جنگ میں لانے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک بیوی بچے والے گھر کو خلوص اور محبت کی ٹھنڈک سے پرسکون ہونا چاہیئے۔ ماؤں کی دشمنیاں اور انتقام طلبی کی دہکتی آگ بچوں میں دوڑ جاتی ہے دو، دو۔ تین، تین گروہ بن جاتے ہیں۔ گھر کا ماحول جیسے بچوں کا پہلا مدرسۂ تعلیم و تربیت روح ہونا چاہئے، جہاں نیکی و رحم و محبت کا سبق ملنا چاہیئے وہاں نفاق اور غیر شریفانہ باتیں سکھائی جانے لگتی ہیں۔

تعدد ازدواج سے اس قسم کے نامناسب تربیتی نقصانات بھی ہوتے ہیں ـــ اس میں شک نہیں ہے، لیکن ایک بات یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ نتائج کتنے تعدد ازدواج کے خمیر سے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے اس کج روی کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جو میاں اور دوسری بیوی کے رویئے میں آجاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بے چینیاں

سب کی سب تعدّد ازدواج کے خمیر کی پیدا کردہ نہیں ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر باہمی رویّوں کی پیداوار ہیں۔

ایک میاں بیوی باہم زندگی بسر کرتے ہیں، دونوں کی زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہتی ہے۔ اسی اثنا میں، مرد ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر دوسری عورت پر فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کے دماغ میں "چند ہم سری" کا سودا سماجاتا ہے، وہ خفیہ طور پر قول و قرار کر لیتا ہے۔ ناگہاں دوسری بیوی آسمان سے آنے والی موت بن کر، پہلی بیوی کے آشیانے یا گھر میں نازل ہو جاتی ہے۔ اس کے شوہر اور خود اس کے ساتھ رفیق و شفیق بن بیٹھتی ہے اس کی زندگی پر شب خوں مارتی ہے۔ صاف سی بات ہے کہ اس پہلی بیوی کا ردّ عمل کینہ و انتقام کے علاوہ اور کیا ہو۔ بیوی کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ اس کا شوہر اسے حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ عورت کی سب سے بڑی شکست یہ ہے کہ یہ سمجھ لے کہ میں اپنے شوہر کا دل نہ بچا سکی۔ اب وہ کسی اور کو دوست بنا رہا ہے۔ جب مرد، خودسری و ہوس رانی کی راہ غلط پر آتا اور دوسری بیوی شب خون کرنے لگتی ہے۔ تو پھر پہلی بیوی سے تحمل و برداشت کی توقع فضول ہے۔

ہاں، اگر پہلی بیوی کو شوہر کے اس عمل کی وجہ جواز معلوم ہو، مثلاً وہ سیر نہیں ہوا، اور تعدّد ازدواج سے وہ اسے پیٹھ نہیں دکھانا چاہتا۔ مرد بھی اپنی ہوس رانی کا غلط راستہ اور خودسری چھوڑ دے۔ پہلی بیوی کے ساتھ جذبات و احترامات کا رشتہ برقرار رکھے، دوسری بھی دھیان رکھے کہ پہلی کے حقوق ہیں۔ وہ حقوق قابل احترام بھی ہیں ان پر دست درازی جائز نہیں ہے۔ خصوصاً، سب مل کر ایک سماجی مشکل کو حل کرنے کی فکر میں رہیں، تو یقیناً، اندرونی بے چینیاں کم ہو جائیں۔

قانون تعدّد ازدواج، سماجی مشکل کا ایک ترقی پسندانہ حل ہے۔ اس قانون کو نافذ کرنے والے کو بھی ذرا اونچی سطح سے دیکھنا چاہیے۔ اسے اعلیٰ درجے کی اسلامی تربیت

سے آراستہ ہونے کی ضرورت ہے۔

تجربہ نے بتایا ہے۔ جب اور جہاں مرد نے خودسری و ہوس رانی کے غلط رویے سے دامن بچایا اور بیوی نے واقعاً محسوس کیا کہ اس کے شوہر کو دوسری بیوی کی ضرورت ہے تو وہ خود آگے بڑھی اور دوسری بیوی کو اپنے شوہر کے گھر میں لائی ہے اور مذکورہ بالا برائیوں میں سے کوئی بھی برائی دیکھنے میں نہیں آئی۔ اکثر بے چینیوں کا سبب مرد کا وہ غیر انسانی رویہ ہوتا ہے جو وہ اس قانون کے اجرا میں اختیار کرتا ہے۔

اخلاقی زاویۂ نظر

کہتے ہیں تعدد ازدواج کی اجازت، گھٹیا حرص اور شہوت رانی کی اجازت ہے۔ مرد کو ہوس پرستی کی اجازت دی گئی ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان اپنی شہوت کو ممکن حد تک کم سے کم کرتا جائے کیونکہ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جس قدر شہوت کے راستے کھلے رکھے گا اس قدر اس کی رغبت اور اس کا شوق بڑھتا جائے گا، ہوس کی آگ بڑھکتی جائے گی۔

مان ٹسکو نے "روح القوانین" ص ۲۲۴ پر، کئی بیویوں پر یہ رائے دی ہے:

"شاہ مراکش کے حرم میں سفید و زرد و سیاہ پوست، ہر نسل و قوم کی عورتیں ہیں۔ یہ شخص اگر ان سے دوگنی عورتیں بھی حاصل کر لے، جب بھی ایک نئی نویلی دلھن کا طلبگار رہے گا۔ کیونکہ ہوس پرستی، خست کی طرح بڑھنے والی چیز ہے۔ دولت جس قدر بڑھتی جائے ..... تعدد ازدواج گھٹیا درجے کی عشق بازی ہے اور خلاف فطرت (ہم جنس بازی) کو بھی تجربے میں لاتی اور معاشرے میں پھیلاتی ہے۔ شہوت رانی کی راہ میں جو عمل بھی حد سے باہر ہوگا، مزید بے قاعدگی کا سبب بنے گا جب اسلامبول میں شورش ہوئی تو اس وقت بادشاہ کے محل میں ایک بیوی بھی نہ تھی، حکمران صاحب خلاف فطرت عشق بازی میں دن رات گذار رہے تھے۔"

یہ اعتراض دو پہلوؤں سے بحث و نظر کا طالب ہے۔

۱۔ پاکیزگی اخلاق، افعال شہوت کے خلاف ہے، پاکیزگی نفس کے لیے شہوت کو کم سے کم تر کیا جائے۔

۲۔ انسانی نفسیات کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی جس قدر فطرت کے ساتھ چلے گا سرکشی بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کی مخالفت کرے گا، اسی قدر اس میں ٹھہراؤ آئے گا۔

پہلا زاویہ، افسوس ہے کہ یہ ایک غلط تعلیم ہے اور اس مسیحیت پر قائم ہے جس کی اساس "ریاضت" ہے، اس ہندو، بدھ اور ... جیسے نظریات و مذاہب کی ای پرچھائیں ہے، اسلامی اخلاق کی اساس کچھ اور ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے یہ نہیں کہ شہوت کو جس قدر کم کیا جائے اخلاق سے زیادہ قریب ہے۔ اور اگر صفر پر پہنچ جائے تو سو فی صد اخلاقی ہے ۔ اسلام کی نظر میں شہوت رانی میں افراط اصول اخلاق کے خلاف ہے۔

تعدد ازدواج، افراطی عمل ہے، یا نہیں؟ تو یہ دیکھیں کہ فطرت نے مرد کے لیے "یک ہم سری" ہی رکھی ہے اور چند ہم سری کو انحرافی و افراطی عمل قرار دیا ہے۔

اکتیس ویں (۳۱) مقالے میں معلوم ہوا کہ آجکل شاید کوئی بھی پیدا نہ ہو جائے جو مرد کی فطرت کی "یک ہم سری" کا قائل ہو اور چند ہمسری کو خلاف فطرت مانتا ہو بلکہ اس کے برعکس بعض کی رائے یہ ہے کہ مرد کی فطرت چند ہمسری سے زیادہ مناسب ہے اور ایک ہمسری مجرد کی طرح خلاف فطرت ہے۔ ہم اس نظریے کے اگرچہ مخالف ہیں لیکن مرد کی فطرت ایک ہم سری کے قائل بھی نہیں۔

مان ٹسکو کی طرح جن لوگوں نے "تعدد ازواج کو شہوت پرستی کے ہم پلہ" مانا ہے ان کی نظر حرم سرابازی خلفاء بنی عباس و بنی عثمان پر رہے۔ اسلام، سب سے آگے اور سب سے زیادہ اس کردار کے خلاف ہے۔ اسلام نے تعدد ازدواج پر جو حد و قید لگائی ہے اس سے ہوس رانی و آزادی مرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

رہا بحث کا دوسرا تمہیدی پہلو۔ "آدمی کی طبیعت جس قدر راضی رکھی جائے اتنی ہی سرکش ہوتی جاتی ہے اور جس قدر مخالفت کی جائے اسی قدر ٹھنڈی رہتی ہے"۔ یہ نظریہ بالکل فرائیڈ کے نظریہ کے مقابلے میں ہے کہ آج بھی فرائڈ کے ماننے والے اس کا پروپیگنڈا کرتے رہتے ہیں۔

فرائیڈازم والے کہتے ہیں ــ "طبیعت کو جس قدر مطمئن کیا جائے، سکون اور جتنا دبایا جائے اتنا ہی منہ زور ہوتی ہے، سرکشی دکھاتی ہے" لہٰذا ان لوگوں کا شعار اس گروہ میں ہے جو سو فیصد، آزادی اور رسم و رواج، ادب و آداب کو درہم برہم کرنے والا گروہ ہے۔ خاص کر جنسی معاملات میں ــ کاش، مان ٹسکو زندہ ہوتا۔ اور دیکھتا کہ اس کے نظریات فرائیڈ اور اس کے پرستاروں نے کس طرح استعمال کئے ہیں۔ اس کی فرضیوں کا کتنا مذاق اڑایا ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دونوں خیال غلط ہیں کیونکہ طبیعت و فطرت کے کچھ حقوق و حدود ہیں۔ ان حقوق و حدود کو سمجھنا اور پہچاننا ضروری ہے۔ طبیعت (فطرت) دو چیزوں کے نتیجے میں سرکشی کرتی اور سکون کو درہم و برہم کر ڈالتی ہے۔ ایک محرومی و ناکامی، دوسرے، اس کے سامنے لگی ہوئی ہر حد و قید سے مکمل آزادی۔

بہرحال تعدد ازدواج ضد و مخالف اخلاق نہیں نہ اس سے پاکیزگی نفس اور روح کا سکون متأثر ہوتا ہے، جو مان ٹسکو کا خیال ہے۔ نہ ایک یا چند شرعی بیوی پر قناعت و اکتفا خلاف اخلاق ہے۔ جیسے فرائیڈ اور اس کے ماننے والے، جن کا ہر وقت عملی مظاہرہ اسی نظام کے تحت چاہتے ہیں۔

قانونی نقطۂ نظر

عقد ازدواج کے بموجب میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے وابستہ اور ایک دوسرے کے قبضے میں آجاتے ہیں، ایک دوسرے سے لذت اندوزی کا جو ربط پیدا ہوتا ہے

اس کا سبب شادی کے منافع کی ملکیت ہے جو عقدِ ازدواج کے بموجب ہے۔ لہٰذا تعدد زوجات کی صورت میں صاحبِ حق پہلی زوجہ ہے۔ اس کے بعد جو معاملہ بھی شوہر اور کسی غیر عورت کے درمیان طے ہوتا ہے وہ دراصل "فضولی" ہے (قانونی حیثیت سے کمزور ہے) دلیل یہ ہے کہ مرد کے "منافع زن و شوہر" اب سے پہلے، زوجۂ اوّل کے ہاتھ بک چکے ہیں۔ اور وہی ان کی مالک سمجھی جاتی ہے، اس بنا پر اوّلیت اسی کو حاصل ہے اور اس کی طرف توجہ رہنا چاہیے۔ اس سے اجازت لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر تعدّد ازواج کی اجازت دی جائے تو اسے پہلی بیوی کی رضامندی کے حوالے سے ہونا چاہیئے۔ دراصل پہلی بیوی ہی اپنے شوہر کے بارے میں فیصلہ کر سکتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرے یا نہ کرے۔

تو، دوسری، تیسری اور چوتھی شادی کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ایک مرتبہ اپنا مال بیچ ڈالے پھر اسی بکے ہوئے مال کو دوسری تیسری اور چوتھی مرتبہ الگ الگ خریداروں کے ہاتھ بیچے۔ اگر بیچنے والا وہی مال بعد والوں کے قبضے میں دیدے تو مستحق سزا ہے۔

یہ اعتراض اس نکتے پر اٹھ سکتا ہے کہ "فطرتِ حقوق ازدواج" کو منافع کا تبادلہ فرض کیا جائے۔ یعنی میاں بیوی کو "زن و شوہر کے منافع" کو ہر دوسرے فریق کو مالک مانا جائے۔ ہم سردست اس بات سے بحث نہیں کرتے کہ یہ نکتہ اعتراض و تنقیح طلب ہے یا نہیں۔ فرض کریں کہ ازدواج کی قانونی فطرت یہی ہو۔ جب بھی اعتراض اس صورت میں تو ممکن ہے کہ مرد کی طرف سے نئی چیز اور تنوع پسندی کا پہلو پایا جاتا ہو۔ تو پھر ماننا پڑے گا ازدواج کی قانونی حیثیت "زن و شو" (میاں بیوی) کے منافع کا تبادلہ ہی کی ہوگی۔ اور بیوی ہر لحاظ سے بالا دست ہوگی اسے شوہر کے مفادات کا لحاظ کرنا ہوگا اور شوہر کے لیے کوئی وجہ جواز نہ ہوگی کہ کئی بیویاں خود سے کر سکے۔

لیکن جس صورت میں مرد کا جذبہ، تنوّع پسندی نہ ہو بلکہ گذشتہ مقالات میں بیان کردہ اسباب میں سے کوئی اور داعی ہو، اس وقت تو یہ اعتراض بے محل ہو جائے گا۔ مثلاً: بیوی بانجھ ہو۔ یا، اس عمر کی ہو جب بچہ نہیں ہوا کرتا (یائسہ ہو) اور مرد اولاد کا محتاج ہو۔ یا بیوی مریض ہو اور شوہر اس سے لذّت نہیں حاصل کر سکتا۔ یہ ایسے مقامات ہیں جہاں بیوی کو کئی بیویاں کرنے سے روکنے کا حق نہیں ہو سکتا۔

یہ صورت حال وہ تھی جہاں تعدّدِ ازواج کی وجہ جواز، انفرادی پہلو اور وہ بھی شوہر کی ذات سے متعلق ہو، لیکن اگر اس معاملے میں معاشرتی قدم بھی آجائے اور تعدّد ازواج کی بنیاد، عورتوں کی فراوانی اور مردوں کی کمی ہو۔ یا۔ معاشرے کو افرادی قوت درکار ہو اور تعدّد ازواج اس مقصد کے لیے تجویز کیا جائے، تو پھر صورت مسئلہ کچھ اور ہو گی، ان مقامات پر تعدّد ازواج قانونی فرض اور باصطلاح فقہ "واجب کفائی" ہو گا۔ معاشرے سے عیاشی و اوباشی کے خاتمے، یا معاشرے میں افراد کی عددی افزائش کی خاطر یہ ذمّے داری تو اٹھانا پڑے گی۔ بدیہی بات ہے کہ جب ذمّہ داری اور سماج کی طرف سے فریضہ عائد ہو جائے تو اجازت و رضامندی و قبول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فرض کریں۔ معاشرہ واقعاً عورتوں کی فراوانی میں مبتلا ہے، یا اسے افراد کی عددی کثرت کی ضرورت ہے، تو شرعی ذمہ داری اور واجب کفائی کا حکم تمام بال بچے والے میاں بیوی پر نافذ ہو گا۔ گھر والی خواتین کو فداکاری و جاں نثاری کا وہی مظاہرہ کرنا ہو گا جو لڑکے کے فوج میں داخل ہونے کے وقت کیا جاتا ہے۔ کہ معاشرے کے تحفظ کے لیے محاذِ جنگ پر جا سکے۔ ان مقامات پر، ایک یا کئی افراد کی رضامندی کا حوالہ غلط ہو گا۔

جو لوگ زور دیتے ہیں کہ حق و عدالت کا تقاضہ ہے کہ تعدّد ازواج پہلی بیوی کی اجازت کے بغیر نہ ہو، ان کی نظر فقط مرد کی تنوّع طلبی ہی پر ہے، وہ

انفرادی و معاشرتی ضرورتوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اگر انفرادی یا معاشرتی ضرورت موجود نہ ہو تو کئی بیویوں کا جواز ہی قابل قبول نہ ہوگا اس میں پہلی بیوی کی اجازت کے ہونے نہ ہونے کی بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔

فلسفی نقطۂ نظر

مساواتِ حقوقِ زن و مرد، فلسفی اصول ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ دونوں انسانیت میں برابر ہیں لہٰذا قانون تعدد ازواج خلاف اصول فلسفی ہے۔ چونکہ زن و مرد متساوی الحقوق انسان ہیں اس لیے یا دونوں کو حق دیا جائے کہ متعدد ہم سر رکھ سکیں یا کسی کو اجازت نہ ہو، مرد کو کئی بیویوں کا حق ہو اور عورت کو چند شوہر رکھنے سے محروم رکھنا طبقہ پرستی و مرد نوازی ہے۔

مرد کو چار بیویاں کرنے کا حق دینے کا مطلب یہ ہے کہ ایک عورت کی ویلیو مرد کے ۱/۴ (چوتھے حصے) کے برابر ہے، عورت کی یہ بہت بڑی توہین ہے۔ حتیٰ کہ اسلام نے بھی میراث اور گواہی میں عورت کو مرد کے نصف کے مساوی مانا اور دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر قرار دی ہے۔ لیکن قانونِ تعددِ ازدواج اس کے بھی منافی ہے۔

تعددِ ازدواج پر یہ اعتراض سب سے زیادہ حقیر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معترض کو بالکل معلوم نہیں کہ تعددِ ازدواج کے فردی و معاشرتی زاویے سے موجبات و علل و اسباب کیا ہیں؟ اس طرف معترض کی ذرا سی توجہ نہیں ہے معترض کا خیال ہے کہ موضوعِ زیرِ بحث — ہوس ہے۔ جب ہی تو کہا ہے کہ مرد کی ہوس کو تو دیکھا گیا اور عورت کی ہوس نظر انداز کر دی۔

گذشتہ صفحات میں تعدد ازدواج کے علل و موجبات و مجوّزات و اسباب پر گفتگو ہو چکی۔ خصوصاً یہ اہمیت بھی یاد دلائی جا چکی کہ جب بے شوہر عورتیں شادی

شدہ مردوں سے زیادہ ہوں تو بیاہتا جوڑوں میں میاں بیوی دونوں پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسی خواتین کو گھروں میں بسائیں اب اس پر زیادہ بحث نہیں کرنا چاہتا۔

اس مرحلے میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ اگر تعدّد ازواج و میراث و شہادت میں اسلام کے فلسفے کی بنیاد حقوقِ خواتین کی توہین اور ان سے بے توجہی ہوتی اور اسلام، انسانیت کی سطح پر پیدا ہونے والے حقوق میں اختلاف و فرقِ مراتب کا قائل ہوتا تو ہر مسئلہ میں حکم کی نوعیت یکساں ہوتی۔ کیونکہ یہ فلسفہ ہر جگہ یکساں اطلاق پذیر قرار پاتا۔ اسلام نے کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کی میراث ایک مرد کی نصف میراث کے برابر ہے اور کہیں یہ نہیں کہا کہ ایک عورت کو ایک مرد کے برابر ترکے میں حصے ملے گا۔ اور کہیں بھی یہ حکم نہیں کہ ایک مرد چار بیویاں کرے۔ گواہی (شہادت) کے بارے میں بھی ہر مسئلے کا حکم الگ ہے۔ ان باتوں سے اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام کی نظر کچھ اور فلسفوں پر ہے اور اس کی قانون سازی کی سائنس اور ہے۔ ہم میراث کے بارے میں گذشتہ مباحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ ایک اور مقالے میں یہ بھی بتا چکے ہیں کہ۔ انسانیت میں زن و مرد کی مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر پیدا ہونے والے حقوقِ زن و مرد کا احترام، اسلام کی نظر میں حقوقِ انسانی کی الف بے کا درجہ رکھتا ہے۔ اسلام زن و مرد کے حقوق مساوات کے درجے سے بلند رکھتا ہے، اس بات کا گہری نظر سے مطالعہ ضروری ہے۔ اور ان کا نفاذ بھی لازم ہے۔

چند ازواجی دستور میں اسلام کا کردار

اسلام نے نہ تو چند ازواجی دستور کو ایجاد کیا نہ اسے منسوخ کیا، اسلام سے صدیوں پہلے یہ نظام دنیا میں موجود تھا، اور اب معاشرے میں ایسے مشکلات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کا حل صرف تعدّد ازواج ہی ہیں، اسلام اسی کا حامی ہے۔

لیکن۔ اسلام نے چند ازواجی دستور میں اصلاحات ضرور کیے ہیں۔

محدودیت :

پہلی اصلاح ۔ اسلام نے "تعدّد ازواج کی رسم میں ایک اقدام یہ کیا کہ اسے محدود کر دیا۔ اسلام سے پہلے "چند ازواجی" دستور لامحدود تھا، ایک مرد، سینکڑوں عورتیں رکھ سکتا تھا۔ یوں حرم سرائی پیدا ہوئی۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ کی حد مقرر کردی۔ ایک آدمی کو چار شادیاں کرنے اور چار بیویوں سے زیادہ بیویاں رکھنے سے روک دیا۔ آغازِ اسلام میں ایسے افراد تھے، حکایات و روایات ان لوگوں کے نام موجود ہیں، جو اسلام لائے اور ان کے گھروں میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں، اسلام نے ان سے مطالبہ کیا اور انھوں نے زائد بیویوں کو رخصت کر دیا۔ غیلان ابن اسلمہ، کی دس بیویاں تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے حکم دیا کہ چھ بیوں کو رخصت کر دے۔

نوفل ابن معاویہ کی پانچ بیویاں تھیں، اسلام لایا، حضورؐ نے فرمایا، ایک کو رخصت کرنا ضروری ہے۔

شیعہ روایات میں ہے کہ ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانے میں ایک ایرانی مجوسی نے اسلام قبول کیا اس کے گھر میں اس کی سات بیویاں تھیں ، امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس بارے میں دریافت کیا گیا ، یہ شخص اسلام قبول کر چکا ہے ، ان سات بیویوں کے بارے میں یہ شخص کیا کرے امام نے فرمایا :

"تین بیویوں کو بہر حال رخصت کر دے ۔

عدالت :

دوسری اصلاح ۔ اسلام نے عدالت کی قید لگا دی ، اس نے اجازت نہ دی کہ بیویوں یا ان کی اولاد میں کسی قسم کی درجہ بندی ہو ۔ قرآن کریم نے صاف صاف کہا :

فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ

اگر تمہیں عدل نہ کر سکنے کا خوف ہو تو پھر صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو ۔

اسلام کی آمد سے پہلے دنیا میں اصولِ عدالت کا خیال ہی نہ تھا ، نہ بیویوں کے معاملات میں انصاف تھا نہ ان کی اولاد میں ۔ مقالہ نمبر ۲۷ میں کرسٹین سن اور دوسروں کی رائے نقل کی جا چکی کہ ، ایران کے ساسانی دور میں تعدد ازواج کی رسم عام تھی ۔ بیویوں اور بچوں میں درجہ بندی ہوتی تھی ، ایک یا کئی بیویوں کو "ممتاز محل" کہا جاتا اور "پادشاہ زن" سے موسوم ہوتی تھیں ۔ انہیں تمام حقوق حاصل تھے ۔ دوسری بیویاں نوکر سمجھی جاتی تھیں ۔ انھیں قانونی حق بھی بہت کم نصیب تھے ۔ نوکر بیویوں کی اولاد میں لڑکے قبول تھے ، لڑکیاں باپ سے منسوب نہیں کی جا سکتی تھیں ۔

اسلام نے اس رسم کو منسوخ کیا ، اسلام نے کسی بیوی اور اس کی اولاد کے قانونی حقوق میں کمتری و فرق کو مسترد کیا ۔

ویل ڈیورانٹ نے ، تاریخ تمدن ، جلد اول میں تعدد ازواج پر بحث کرتے

ہوئے لکھا ہے:

آہستہ آہستہ ایک ایک فرد کے پاس اچھا خاصہ سرمایہ جمع ہوتا گیا، اسے فکر ہوئی کہ اگر اس کی دولت زیادہ حصہ داروں میں تقسیم کی گئی تو اس کی ہر اولاد کو بہت کم حصہ ملے گا، اس کو فکر ہوئی پہلی بیوی اور دوسری بیوی، نیز دوسری ہم خواب عورتوں میں فرق رکھے تاکہ میراث اصلی بیوی کی اولاد کو ملے۔"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ قدیم زمانے میں بیوی اور اولادوں کے درمیان فرقِ مراتب رائج تھا، تعجب ہے کہ ویل ڈیورانٹ اپنی بات کہتے کہتے یہاں تک پہنچا:

"موجودہ نسل تک براعظم ایشیا میں یہی سلسلہ جاری رہا، آہستہ آہستہ بیوی ایک ہی رہ گئی، دوسری بیویاں یا محبوب عورتیں خفیہ ہوگئیں یا بالکل ختم ہوگئیں۔"

ویل ڈیورانٹ نے یا تو خیال نہ کیا، یا توجہ نہ کرنا چاہی، کہ چودہ صدیاں گذر گئیں، ایشیا میں، دینِ مقدسِ اسلام نے اولاد میں فرقِ مراتب ختم کر دیا ہے۔ ایک اصلی بیوی اور چند نجی محبوبائیں رکھنے کی رسم یورپ کی رسم ہے، ایشیا کی نہیں، آخر میں یہ دستور یورپ سے ایشیا میں آیا اور پھیلا ہے۔

بہرحال، اسلام نے تعدّدِ ازواج کے بارے میں دوسری اصلاح یہ کی ہے کہ فرقِ مراتب کو مہمل قرار دیا، سب بیویوں اور ان کی اولاد کو ایک درجہ دیا۔

اسلام کے نزدیک رنڈی بازی کسی شکل وصورت میں جائز نہیں، علماءِ اسلام تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ بیویوں میں فرقِ مراتب ناجائز ہے، ایک آدھ فقہی دلبستان میں بیوی کے حق کی تشریح یوں کی گئی ہے جس سے بوئے فرق آتی ہے۔ میرے نزدیک یہ بات ناقابلِ تردید ہے کہ قرآن کریم اس کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا:

"جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں عدل نہ برتے، ایک بیوی کی طرف زیادہ جھکاؤ ظاہر کرے تو قیامت میں یوں محشور ہوگا کہ آدھا بدن زمین پر کھنیچ کر چلے گا آخرِ کار جہنّم میں داخل ہو جائے گا۔"

عدالت انسانی فضائل میں بہترین فضیلت ہے۔ شرط عدالت کا مطلب ہے بلند ترین اخلاقی قوت کا مالک ہونا۔ چونکہ عموماً شوہر کے جذبات تمام بیویوں کے لیے یکساں اور برابر نہیں ہو سکتے، اس لیے عدالت کی نگہداشت اور ان کی فرق نہ کرنا، مشکل ترین مرحلہ ہے جو شوہر کے ذمے ہے۔

سب کو معلوم ہے، رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ والہ وسلم مدینے کے آخری دس برس میں، جو لڑائیوں کے دن تھے، بے شوہر عورتیں مسلمانوں میں بکثرت موجود تھیں آنحضرت نے جن سے شادیاں کیں وہ بیوہ اور بڑی عمر کی عورتیں تھیں اور اکثر کے پاس دوسرے شوہروں سے اولاد بھی تھی۔ ایک کیلی دوشیزہ حضرت عائشہ تھیں جس سے آپ نے شادی کی، حضرت عائشہ اس پر فخر کرتی تھیں کہ میں اکیلی بیوی ہوں جس نے آنحضرتؐ کے علاوہ کسی دوسرے مرد کا بدن لمس نہیں کیا۔

رسولِ اکرم صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم، ازواج کے معاملات میں انتہائی عدالت کا برتاؤ کرتے تھے، ذرہ برابر فرق نہ برتتے تھے۔ عروہ ابن زبیر حضرت عائشہ کے بھانجے تھے، انھوں نے اپنی خالہ سے آنحضرتؐ کی سیرت کے بارے میں کچھ سوال کیے۔ حضرت عائشہ نے کہا: آنحضرتؐ اپنی سیرت کے مطابق ہم میں سے کسی کو دوسری پر ترجیح نہ دیتے تھے۔ سب کے ساتھ عدالت و یکسانیت کا برتاؤ کرتے تھے، بہت کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ اپنی تمام ازواج کے گھر نہ جائیں، سب کی مزاج پرسی فرماتے حالات سے باخبر رہتے تھے۔ جس خاتون کا دن ہوتا اس کے یہاں رہتے

مگر دوسریوں سے غافل نہ ہوتے خیریت طلبی ضرور کرتے۔ رات باری والی بی بی ہی کے یہاں گذارتے تھے اور اگر اتفاقاً کسی ایسی اہلیہ کے یہاں شب گذارنا چاہتے جس کی باری نہ ہوتی تو خود اُن اہلیہ کے گھر جاتے اور اس رات کی اجازت طلب فرماتے تھے، اگر وہ اجازت دیتی تھیں تو دوسری کے یہاں شب باش ہوتے تھے۔ اگر وہ اجازت نہ دیتی تھیں تو آپ دوسری کے یہاں نہ جاتے تھے۔ میں خود بھی ایسے موقع پر آنحضرتؐ کو اجازت نہیں دیتی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس علالت میں جو انتقال تک رہی، جب چلنا پھرنا چھوڑ دیا، اس وقت بھی انصاف وعدالت کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے، اور اپنا بستر اس حجرے سے اس حجرے میں منتقل کرتے تھے۔ آخر ایک دن سب کو جمع کر کے ایک حجرے میں رہنے کی اجازت لی۔ اور حجرہ حضرت عائشہ میں رہنے لگے۔

حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے گھر میں جب دو بیویاں تھیں تو امام اس قدر عدل کا خیال فرماتے تھے کہ اگر ایک معظمہ کی باری ہوتی تو دوسری کے یہاں وضو کرنے بھی نہ جاتے تھے۔

اسلام بجائے خود اس قدر عدالت کا قائل ہے کہ مرد اور اس کی دوسری بیوی کو یہ حق نہیں دیتا کہ شادی کے لمحے یہ معاہدہ کریں کہ دوسری بیوی پہلی بیوی سے کچھ فرقِ حقوق کے ساتھ گھر میں رہے گی۔ یعنی اسلام کے نزدیک عدالت، شوہر پر واجب شرعی ہے۔ شوہر کسی قبل از وقت شرط کے ذریعے اپنی اصل ذمہ داری سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ عورت ومرد دونوں میں سے کسی کو اس قسم کی شرط متن عقد میں رکھنے کی اجازت نہیں۔ دوسری بیوی صرف عملی طور پر اپنے حق سے دست بردار تو ہو سکتی ہے، مگر یہ شرط نہیں کر سکتی کہ وہ پہلی بیوی کے برابر حقوق نہ رکھے گی۔ اسی طرح پہلی بیوی عملی طور پر اپنی رضا ورغبت سے اپنے حقوق سے دستبردار

ہو جائے تو ہو جائے، لیکن قانونی طور پر اپنے حقوق کے بارے میں کوئی ایسا قول و قرار نہیں کر سکتی، جس کی رو سے وہ قانوناً محروم ہو جائے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا گیا:

کیا، مرد اپنی بیوی سے یہ شرط کر سکتا ہے کہ فقط دن کو اس کے یہاں آسکے گا یا مہینے میں ایک بار، یا ہفتے میں ایک بار رہے گا۔ یا شرط کرلے کہ پورا نفقہ یا فلاں بیوی کے برابر نفقہ اسے نہ دے گا۔ اور یہ بیوی ان شرائط یا ان میں سے کسی ایک شرط کو مان لے؟ کیا حکم ہے؟

حضرتؑ نے فرمایا: نہیں، ایسی شرطیں صحیح نہیں ہیں۔ ہر بیوی عقد ازدواج کے بموجب خود بخود ایک زوجہ کے تمام حقوق حاصل کرلیتی ہے۔ البتہ عقد اور حصول حقوق کے بعد، ہر بیوی، شوہر کی توجہ اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اور یہ کہ اسے طلاق نہ دے، یا کسی اور مقصد کی خاطر اپنے کچھ حقوق شوہر کو ھبہ کر سکتی ہے۔"

ان اخلاقی شرائط کے بعد، تعدد ازدواج ذریعہ ہوس رانی کے بجائے فرائض و حقوق کی شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔ شہوت رانی و ہوس پرستی کا مطلب ہی مکمل آزادی اور آرزوے دل پوری کرنا ہے۔ ہوس پرستی اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے، جب آدمی دل کے قابو میں آجائے اور جو دل چاہے وہ کرے ــ اور دل پر خواہشات کا قبضہ ہو۔ دل اور خواہشات دل دلیل و حساب قبول نہیں کرتے۔ جہاں نظم و ضبط، قانون قاعدہ، فرض کی انجام دہی اور عدل و انصاف کی بات آجائے وہاں، ہوس، آرزو اور آزادی خیال کا قدم نہیں آسکتا۔ اس وجہ سے، اسلامی پابندیوں کے ساتھ "تعدد ازدواج" کو ذریعہ ہوس رانی کہنا درست نہیں۔

جو لوگ تعدد ازدواج کو ہوس رانی کا ذریعہ مانتے ہیں وہ ایک ناجائز کام

کے لئے اسلامی قانون کو بہانہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرے کو ان کے محاسبے اور اس غلط بہانے پر سزا دینے کا حق ہے۔

عدل وانصاف کا خوف

انصاف کی بات کرنا چاہیے، تعدد ازواج کی صورت میں اسلامی پابندیوں کے مطابق کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ فقہ اسلام کہتی ہے:

"اگر ڈرتے ہو کہ پانی کا استعمال جسم کو نقصان پہنچائے گا تو وضو نہ کرو۔"

"اگر خوف ہو کہ روزہ تمہارے لیے ضرر کا باعث ہوگا تو روزہ نہ رکھو"

فقہ میں یہ دونوں حکم موجود ہیں، آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو پوچھتے ہیں۔ جناب، پانی کا استعمال مجھے نقصان پہنچاتا ہے، میں وضو کروں یا نہ کروں؟ روزے سے خوفِ ضرر ہے، روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ یقیناً یہ سوال درست اور برمحل ہیں ایسے اشخاص واقعاً وضو نہ کریں، ایسے آدمی ہرگز روزہ نہ رکھیں۔

قرآن مجید کے الفاظ ہیں:

"فان خفتم الاّ تعدلوا فواحدۃ" (النساء/۳)

"اگر تم کو خوف ہو کہ بیویوں میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے زیادہ بیوی نہ رکھو۔"

اس صورتِ حال میں، آپ نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی سے سنا ہے کہ اس نے پوچھا ہو۔ "میں دوسری شادی کرنا چاہتا اور دوسری بیوی لانا چاہتا ہوں، مگر ڈرتا ہوں کہ برابری وعدالت نہ برت سکوں گا، شادی کروں یا نہ کروں؟ میں نے تو یہ سوال نہیں سنا۔ آپ نے بھی یقیناً یہ بات کسی سے نہ سنی ہوگی۔ ہمارے عوام بیویوں میں عدل ومساوات قائم نہ رکھنے کی نیت کے بعد بھی اگر اسلام اور احکام اسلام کی آڑ میں کئی شادیاں کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ تو بات صاف ہے۔ یہ لوگ اپنی بدکرداری

سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔

جو لوگ کم از کم اسی ایک پابندی کو پوری طرح نباہ سکتے ہوں تو بلاشبہ وہ تعدد ازواج پر عمل کر سکتے ہیں اور ان پر کوئی اعتراض بھی نہ ہو سکے گا۔

حرم سرائیں

تعدد ازواج کی بنیاد پر اسلام کے خلاف گفتگو کا ایک سبب گذشتہ خلفاء و سلاطین کی حرم سرائیں تھیں عیسائی مشنریوں اور کچھ مصنفین نے اسلامی اجازتِ تعدد ازدواج کو ان سوکن حرم سراؤں سے جوڑ دیا جہاں کے ظلم و ستم کی کہانیوں کا پروپیگنڈا کیا اور اسے اسلام کے سر منڈھ دیا۔

ہمارے مصنفین بھی ان کے ترجمان بن گئے اور ان کی تحریروں میں وہی صدائے بازگشت آنے لگی، وہی الفاظ، وہی افکار، اور وہی مقاصد کہ تعدد ازواج کا دوسرا نام حرم سرا ہے۔ اتنی آزادی فکر بھی انہیں حاصل نہیں کہ تعدد ازواج و حرم سرا کا فرق بتا سکیں۔

دوسرے شرائط و لوازمات

عدل و انصاف سے قطع نظر، کچھ اور ذمہ داریاں، کچھ اور لوازم و فرائض بھی مرد پر عائد ہوتے ہیں۔ بیوی کے حقوق کا ایک سلسلہ اپنی جگہ پھر شوہر سے فائدہ حاصل کرنے کا جواز سب جانتے ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی مرد چند شادی کر سکتا، اس کا حوصلہ اور مالی امکانات اسے اجازت دیتے ہیں تو اعتراض کیوں ہے، آخر ایک بیوی کے لیے بھی تو امکانات مالی پر نظر رکھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ جسمانی اور طبیعی امکانات بجائے خود ایک شرط لازم ہیں۔

"کافی" اور "وسائل الشیعہ" میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے۔ امام نے فرمایا:

جو شخص عورتوں کو جمع کر لے اور انھیں جنسی طور پر مطمئن نہ کر سکے، اور وہ عورتیں بدکرداری میں مبتلا ہوں تو اس کا گناہ اس شوہر کی گردن پر ہے۔

حرم سراؤں کی تاریخ اور ان کے بارے میں داستانوں کا چرچا ایسی عورتوں کی نشان دہی کرتی ہیں جو نوجوان اور اپنے جنسی دباؤ میں گرفتار تھیں، وہی بدکرداری کرتی اور بسا اوقات جنگ و جدال کا سبب بنتی تھیں۔

محترم قارئین !

ان سات مقالوں میں "چند ازدواجی" کے مسئلے پر جو کچھ میں نے لکھا، اس میں اسباب وعلل اور تعدد ازدواج کی بنیاد واضح کی ہے۔ اور یہ بات عرض کی ہے کہ اسلام نے اس دستور کو منسوخ کیوں نہ کیا؟ تعدد ازداج کے شرائط وحدود، دستور اور پابندیاں بیان کی ہیں جن کے بعد یہ دستور منظور کی۔

آپ پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اسلام نے تعدد ازواج کی منظوری میں، عورت کی توہین نہیں کی بلکہ اس طریقے سے اس نے جنس خواتین کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ شادی کے قابل عورتوں کی فراوانی اور ان مردوں سے زیادتی کی نسبت جو مرد شادی کے قابل ہوں ـــ اور یہ تناسب دنیا میں پہلے بھی اور اب بھی ہے ـ اگر اس معاشرتی مسئلے کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو عورت، مرد کے لیے ایک بدترین کھلونا بن کے رہ جاتی۔ مرد کا اس کے ساتھ ایک لونڈی سے بھی بدتر سلوک ہوتا۔ کیونکہ انسان ایک لونڈی کے لیے بھی کم از کم ایک قسم کا معاہدہ، ایک قسم کی ذمہ داری تو بہرحال رکھتا ہے، اس کی اولاد کو اپنی اولاد مانتا ہے۔ لیکن معشوقہ اور فرینڈ گرلز سے یہ سلوک بھی نہیں ہوتا۔

آج کا مرد اور تعددِ ازواج :

آج کا مرد تعدد ازواج سے روگرداں ہے۔ کیوں؟ کیا، اس کا مقصد اپنی پہلی بیوی سے وفاداری ہے۔ یا اس کی خواہش ہے کہ وہ ایک بیوی کے پردے ہر روز نیا مزہ چکھے اور اپنی اِس حس کو نہ ختم ہونے والے گناہوں سے آسودگی بخشے؟

آج کل تعدّد ازدواج کی خانہ پری وفاداری و پاک دامنی کے بجائے عیاشی و گناہ گاری نے کردی اور اسی خاطر آج کا مرد تعدّدِ ازدواج کی ذمہ داری سے نکل بھاگتا ہے کہ اس میں پابندی اور جواب دہی کا بوجھ ہے اسے کیوں اٹھائے وہ اس سے نفرت کرتا ہے کل کا مرد، اگر ہوس رانی کرنا چاہتا تھا تو گناہ کی راہیں اتنی کھلی نہ تھیں، وہ مجبوراً تعدّد ازواج کے بہانے اپنی خواہش پوری کرنے کی سعی کرتا ہوگا، ممکن ہے کہ وہ گھٹیا مقصد ہی شادیاں کرتا ہو اور قانونی و مالی اور اخلاقی پابندیوں سے بچتا بھی ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ ایک ذمہ داری ضرور اٹھاتا تھا، وہ ان بیویوں کی اولاد کو اپنی اولاد ضرور مانتا تھا۔ آج کا مرد، اپنی عیش پرستی کے بعد عورت کی کوئی ذمہ داری اٹھانے کو تیار نہیں، اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ تعدد ازواج کے خلاف مہم چلائے۔

آج کا مرد، سیکریٹری، ٹائیسٹ، جیسے ناموں اور کاموں کے لیے خواتین کو جمع کرکے ان سے بیوی کا کام لے۔ پھر مزہ یہ ہے کہ اس کی اجرت اور اخراجات، حکومت یا کمپنی کی جیب سے ادا کرتا ہے۔ خود اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی صرف نہیں کرتا۔

آج کا مرد مہر و نان و نفقہ کی زحمت و تکلیفات اٹھائے بغیر، روزانہ صبح سویرے طلاق کی ضرورت پیش آئے بغیر اپنی محبوبہ بدل لیتا ہے۔ موسیٰ چومبہ، تعدّد ازواج کے خلاف ہے۔ اور ہونا بھی چاہیئے آخر اس کی نوجوان سیکریٹری "مولو" اس کی پہلو نشین ہے، سال بھر بعد اسے بدل لے گا۔ ایسے امکانات کے بعد تعدّد ازواج کی ضرورت بھی کیا ہے؟

تعدّد ازدواج کے بڑے سخت مخالف، برٹرینڈ رسل کی سوانح عمری میں پڑھا کہ ــ اس کی زندگی کے ابتدائی عہد پر اس کی بڑی ماں کے علاوہ دوسری دو عورتوں کی بڑی چھاپ تھی ایک "ایلس" (ALYS) اس کی پہلی بیوی دوسری اس کی دوست "آٹولین مورل" (OTTOLINE MORELL)۔ مورل اس دور

کی مشہور عورت تھی، بیسویں صدی کے آغاز میں وہ بہت سے لکھنے والوں کی دوست تھی۔ مثلاً ایسا شخص "تعدد ازواج کے ساتھ اتفاق نہیں کرتا۔

یہی یار بازیاں تھیں جن کے سائے میں رسل نے اپنی اکیلی بیوی "ایلس" (ALYS) کے ساتھ زندگی تباہ دی۔ رسل نے اپنی زبان سے خود اقرار کیا ہے:

کچھ دن بعد، سائکل پر سوار دوپہر کو شہر کے قریب ایک ٹھنڈی بستی جا رہا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا۔

اب مجھے "ایلس" (ALYS) سے محبت نہیں رہی۔!

فہارس

فہرست آیات قرآن

متن آیہ — صفحہ

وان خفتم شقاق بینهما فابعثوا حکماً ... (نساء/۳۵)

وجعل منها زوجها لیسکن الیها ... (اعراف/۱۸۹)

وخلق الانسان ضعیفاً ... (نساء/۲۸)

وقاسمهما انی لکما ... (اعراف/۲۱)

وکیف تأخذونه وقد افضی بعضکم الی بعض ... (نساء/۲۱)

ولا تأکلوا اموالکم بینکم بالباطل ... (بقره/۱۸۸)

ولا تعضلوهن لتذهبوا ببعض ما آتیتموهن ... (نساء/۱۹)

ولا تنکحوا ما نکح آباؤکم ... (نساء/۲۲)

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ... (تین/۴)

ومتعوهن علی الموسع قدره وعلی المقتر قدره ... (بقره/۲۳۶)

ومن آیاته ان خلق لکم ... (روم/۲۱)

ونفس وما سوّیها ... (الشمس/۷)

یا ایها الانسان انک کادح الی ربک ... (انشقاق/۶)

یا ایها الذین آمنوا لا یحل لکم ان ترثوا النساء کرهاً ... (نساء/۹)

یا ایها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة ...

فہرست احادیث نبویؐ و ائمہ اطہارؑ

اتقوا اللہ فی النساء فانکم اخذ تموھن باما نۃ اللہ د ... (پیغمبر اکرمؐ)

اذا اراد الرجل ان تزوج المرأۃ فلیقل : اقررت بالمیثاق الذی اخذ اللہ :
امساک بمعروف او تسریح باحسان (امام صادقؑ)

نکاح کرو، طلاق نہ دو، عرش الٰہی طلاق سے لرز اٹھتا ہے (حدیث رسول)

اگر عمر جلد بازی نہ کرتے اور متعہ حرام نہ کرتے ... (علیؑ)

ان طلاق ام ایوب لحوب (پیغمبر اکرمؐ)

ایلا کرنے والا چار مہینے بعد جبراً اپنی قسم توڑے .... (امام محمد باقرؑ)

یہ بات اس کے لیے ٹھیک ہے جسے اللہ نے بیوی کی وجہ سے ... (امام کاظمؑ)

تمہیں متعہ کی کیا ضرورت ہے حالانکہ اللہ نے تمہیں اس سے بے نیاز کیا ہے.. (امام کاظمؑ)

جبرئیل نے عورتوں کے بارے میں اتنا زور دیا کہ ... (رسول اللہؐ)

خدا کی نگاہ میں اس گھر سے زیادہ محبوب کوئی جگہ نہیں جہاں نکاح ہوا... (رسول اللہؐ)

خدا دشمن رکھتا اور لعنت کرتا ہے اس مرد پر جو بیویاں بدلتا ... (رسول اللہ)

اتنا عقد بیویوں میں درجہ بندی صحیح نہیں ... (امام باقرؑ)

لاشغار فی الاسلام ... (رسول اللہ)

ما احل اللہ شیئاً ابغض الیہ من الطلاق (رسول اللہ)

من اخلاق الانبیاء حب النساء ... (پیغمبر اکرمؐ)

جس کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان دونوں میں انصاف ... (پیغمبر اکرمؐ)

جو اپنی زوجہ کو لباس نہ دے، نفقہ نہ ادا کرے مسلمانوں کے امام پر فرض ہے کہ ان دونوں کو الگ کر دے۔ (امام صادقؑ)

جو کئی بیویاں جمع کرلے پھر ان کی جنسی آسودگی نہ کر سکے ... (آنحضرتؐ)

وہ مقام جہاں، تقیہ نہ کروں گا وہ متعہ ہے۔ (امام صادقؑ)

مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ شادی شدہ نے متعہ کیا .... (علیؑ)

طلاق سے زیادہ مبغوض و منفور اللہ کے نزدیک کوئی نہیں (امام صادقؑ)

فہرست اشعار

سازِ طرب عشق، کہ داند کہ چہ سازاست ۔ کز زخمہ ... تنگ وناز است

رازیست دریں پردہ گراں راشناسی ۔ دانی .... مجاز است

عشق است کہ ہر دم بہ دگر رنگ در آید ۔ ناز است... نیاز است

درصورتِ عاشق چہ در آید ہم سوز است ۔ ..... ہمہ ساز است

ناتوانی پامنہ اندر فراق ؛ البغض الاشیاء عندی الطلاق

سخن درست بگویم، نمی توانم دید ؛ کہ می خورند حریفاں... نظارہ کنم۔

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ؛ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

فہرست اعلام